تاریخ دولتِ فاطمیّہ

سیّد رئیس احمد جعفری ندوی

رفیقِ ادارہ

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ
کلب روڈ۔ لاہور

جملہ حقوق محفوظ

طبع اوّل :- جون ۱۹۶۵ء

تعداد :- ایک ہزار ۱۰۰۰

مطبوعہ

دین محمدی پریس لاہور

باہتمام

محمد اشرف ڈار

سیکریٹری ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ لاہور

انتساب

سیّد ہاشم رضا (سی۔ایس۔پی) کے نام

فہرس

حصّۂ اوّل

حرفِ آغاز ۱۷
دولتِ فاطمی کی مجمل تاریخ ۲۱
اسماعیلی تحریک کے اسبابِ عروج ۵۵
اسماعیلی فرقے کی ابتداء ۶۱
جدول خاندان علیؓ ۶۵
جدول طوائف امامیہ و اسماعیلیہ ۶۶
فاطمی دعوت اور اس کا نظام ۶۹
مدارجِ دعوت ۷۵
دعوتِ اوّل ۷۶
دعوتِ دوم ۸۶
دعوتِ سوم ۸۸
دعوتِ چہارم ۹۰
دعوتِ پنجم ۹۳
دعوتِ ششم ۹۶
ساتویں دعوت ۱۰۰
آٹھویں دعوت ۱۰۲
نویں دعوت ۱۰۶

میثاق	١١٠
تاویل	١١٥
مسئلہ امامت	١٢٠
مقامِ امام	١٣٤
امام غائب اور امام حاضر	١٣٧
دلائل کا اسلوب	١٤٢
اسماعیلی فرقے	١٤٧
قرامطہ	١٤٩
نصیریہ	١٥٤
دروز	١٥٧
نزاریہ	١٦٢
خلفاء اور ائمۂ فاطمیین کا نسب	١٦٧

حصّۂ دوم
فاطمی خاندان کے فرماں روا

حرفِ اوّل	١٧٤
عبید اللہ المہدی	١٧٦
القائم بامر اللہ	١٨٢
المنصور باللہ	١٨٦
المعز لدین اللہ	١٨٩
العزیز باللہ	١٩٣
الحاکم بامر اللہ	١٩٧
الظاہر لاعزاز دین اللہ	٢٠٣
المستنصر باللہ	٢٠٦

المستعلی باللہ ۲۱۱
الآمر باحکام اللہ ۲۱۴
الحافظ لدین اللہ ۲۱۸
الظافر لاعداء اللہ ۲۱۹
الفائز باللہ ۲۲۱
العاضد لدین اللہ ۲۲۳
استدراک
سلطان صلاح الدین ایوبی ۲۳۰

حصّۂ سوم
فاطمیوں کا عہدِ کشور کشائی

تقدیم ۲۳۵
فاتح مصر جوہر صقلی ۲۳۷
مصر کی حالت فتح فاطمی سے پہلے ۲۴۵
فتح مصر ۲۵۱
جوہر کا امان نامہ ۲۵۷
فتح بلاد عرب کا مقدمہ ۲۶۲
فتوحات بلاد حجاز ۲۶۴
بحرین فاطمی سیادت میں ۲۷۶
نفوذ فاطمی یمامہ میں ۲۹۰
عمان پر فاطمیوں کا اقتدار ۲۹۳
بلاد یمن پر فاطمیوں کی حکومت ۲۹۶
سسلی پر فاطمیوں کا قبضہ اور تسلط ۳۲۴
فرانس اور اٹلی پر فاطمیوں کی یلغار ۳۲۷

فاطمی حکومت کا آفتابِ اقبال ۳۲۸

تہذیب و تمدن اور ثقافت و حضارت کا عروج

حرفِ آغاز ۳۳۳
معاشرت ۳۳۷
زبان و ادب ۳۴۰
تجارت ۳۴۴
نقاشی و مصوری ۳۴۷
صنعت و حرفت ۳۵۱
پارچہ بافی ۳۵۳
صنعت ظروف سازی ۳۵۶

علوم و فنون کی توسیع و ترقی

آغاز سخن ۳۶۳
فاطمی خلفاء کے کتب خانے ۳۶۷
عہد فاطمی کے عام کتب خانے ۳۷۰
جامع ازہر ۳۷۴
دار العلم یا دار الحکمت ۳۷۷
علوم فلسفہ و ریاضی و سائنس ۳۸۰
اخوان الصفا ۳۸۳
طب ۳۸۷
فلکیات ۳۹۱
تقویم فاطمی اور نظام صوم ۳۹۴
جغرافیہ ۴۰۳
تفسیر، حدیث، قرآن ۴۰۴

فقہ ۴۰۷
لغت و نحو ۴۰۹

فاطمیوں کا ذوقِ تعمیر

کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد ۴۱۲
شہر مہدیہ ۴۱۴
شہر محمدیہ ۴۱۶
صقلیہ کے محلات ۴۱۷
شہر مازر ۴۱۹
بلرم ۴۲۰
خالصہ ۴۲۳
قاہرہ ۴۲۵
چند مساجد کا اجمالی تذکرہ ۴۲۷
جامع حاکم اور دیگر عمارات ۴۲۹
مسجد امیر الجیوش ۴۳۲
مقبرۂ سیدہ رقیہ ۴۳۷
جامع صالح ۴۳۹
شام کی چند عمارتیں ۴۴۱
فاطمیوں کی خصوصیات تعمیر ۴۴۳

فاطمیوں کا نظمِ مملکت

ابتدائیہ ۴۴۷
خلافت ۴۴۸
قصرِ خلافت ۴۵۶
قصرِ شاہی کے محکمے ۴۵۸

قصر کے منصب دار ۴۶۱
طبیب خاص ۴۶۲
شعرا دربار ۴۶۳
ابن ہانی ۴۶۴
تمیم بن المعز ۴۶۴
عمارہ بن ابی الحسن علی بن زیدان الیمنی ۴۶۴
حجابت ۴۶۶
قصر و دربار کی شان و شوکت ۴۶۸
وزارت ۴۷۲
غیر مسلم وزراء:
ابوالفرج یعقوب بن کلس ۴۷۳
فہد بن ابراہیم نصرانی ۴۷۴
وزارت کے رسوم و ممیزات ۴۷۷
انتظامیہ ۴۸۰
دیوان الانشاء والمکاتبات ۴۸۰
برید (ڈاک) ۴۸۲
برّی ڈاک ۴۸۲
بحری ڈاک ۴۸۳
فضائی ڈاک ۴۸۴
پولیس ۴۸۶
مالیات:
الخراج ۴۸۸
الجوالی وجزیہ ۴۸۹

دیوان الجوالی	۴۹۰
الزکوٰۃ	۴۹۰
المستغلات	۴۹۰
فاطمی ٹکسال اور فاطمی سکے	۴۹۳
فاطمیوں کے اصلاحات	۴۹۶
فاطمیوں کی رواداری	۴۹۸
نظامِ جنگ:	
تمہید	۵۰۵
فاطمیوں کا فوجی درو بست	۵۰۶
دیوان الاقطاع	۵۱۳
فاطمیوں کا بحری بیڑہ	۵۱۷
ضمیمہ:	
بیان صفائی	۵۲۱
تقدیم	۵۲۳
ایک مستند دستاویز	۵۲۵

حصّۂ اوّل

حرفِ آغاز

جنگِ بابی کے بعد اموی حکومت نے جب عروج و فروغ حاصل کیا تو کوئی حریف مقابل سامنے نہ تھا۔ عباسی حکومت جب قائم ہوئی تو اس نے نہ صرف اموی حکومت کو ختم کر دیا۔ بلکہ کسی ایسے شخص کو زندہ نہیں چھوڑا جو چشمک زنی کی جرأت رکھتا ہو۔ اندلس میں جب اموی حکومت قائم ہوئی تو دمشق کی اموی حکومت ختم ہو چکی تھی۔ اور عباسی حکومت ابھی پورے طور پر نہ صرف تختِ حکومت کو اپنی گرفت میں نہ لے سکی تھی، بلکہ نفس ذکیہ اور ان کے برادر ذی مرتبت نفس رضیہ کی صورت میں اس کے سر پر تلوار لٹک رہی تھی۔ اور ان حالات میں جب وہ خود مرگ و زیست کی کش مکش میں مبتلا تھی، اس کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ اندلس (ہسپانیہ) جیسے دور دراز مقام پر فوج کشی کر کے اموی حکومت کو ختم کر دیتی۔

لیکن فاطمی حکومت نے جب بلادِ مغرب (افریقیہ) میں صقلیہ (سسلی) میں اور مصر میں اپنا پرچم اقبال بلند کیا تو :۔

:۔ عباسی حکومت جاہ و جلال اور شوکت و حشمت کے ساتھ قائم تھی۔

:۔ اندلس میں اموی حکومت کا آفتاب اقبال نصف النہار پر تھا۔

:۔ خود مغرب اقصیٰ میں اغالبہ کی ایک مضبوط اور مستحکم حکومت قائم تھی۔

:۔ خوارج، اس علاقے میں پھیلے ہوئے تھے۔ ان کے ہاتھ میں اقتدار بھی تھا،

اور وہ صاحب قوت و سطوت بھی تھے۔ شجاعت اور دلیری میں بھی اپنی مثال آپ ہی تھے۔

ان حالات میں بغیر کسی فوج کے، بغیر ساز و سامان جنگ کے، مختصر سی مدت میں فاطمی حکومت کا نمودار ہونا، قوت حاصل کرنا، بحر و بر پر چھا جانا، آگے بڑھ کر مصر و شام اور حجاز تک حدودِ مملکت کی توسیع کر لینا اگر اسماعیلیوں کے لیے ایک معجزہ ہے تو ہمارے لیے بھی وہ ایک سیاسی معجزہ ہے

۲۹۷ھ سے ۵۶۷ھ ——— ۹۰۹ء سے ۱۱۷۱ء ——— تک

فاطمی حکومت قائم رہی۔ یعنی قمری تقویم کے حساب سے ۲۷۰ سال تک، اور شمسی کیلنڈر کے لحاظ سے ۲۶۲ سال تک!

ہندوستان پر مسلمانوں نے تقریباً ایک ہزار سال تک جاہ و جلال اور شان و شکوہ کے ساتھ داد فرمانروائی دی۔ اسپین (اندلس) پر کم و بیش ۸ سو سال تک مسلمانوں نے اپنی جہانداری اور جہانگیری کا پرچم لہرایا، دوسرے خاندانوں نے بھی مختلف اقالیم میں صدیوں تک اپنی عظمت و سطوت کا ڈنکا بجایا۔ فاطمی خاندانوں کے فرمانرواؤں کو ڈھائی سو سال سے زیادہ اور پونے تین سو سال سے کم مدت تک حکومت کرنے کا موقعہ ملا۔ یہ مدت کچھ بہت زیادہ نہیں ہے۔ لیکن مختلف اعتبارات سے تاریخ میں یہ غیر معمولی اہمیت اور امتیاز کی حامل ہے

اس حکومت کو عیسائیوں سے بھی جنگ کرنا پڑی مسلمانوں سے بھی۔ خود اپنی جماعت کے ایک فرقے سے بھی۔ اور خود اپنی صفوں میں بھی خانہ جنگی اور رزم باہمی کے دلخراش اور زہرہ گداز مناظر دیکھنا پڑے۔ پھر بھی علمی، ادبی، تمدنی، انتظامی، معاشرتی، حربی، اصلاحی، تعمیری اور ثقافتی اعتبار سے اس نے جو آثار و نقوش چھوڑے ہیں۔ وہ ثباتِ دوام کا فخر حاصل کر چکے ہیں۔

فاطمیوں کے سیاسی اور تمدنی کارناموں کا ذکر اپنی جگہ تفصیل سے آئے گا۔ ان کے نظام حکومت پر بھی مفصل گفتگو اپنے موقع پر ہو گی۔ ان کے مخصوص عقاید و افکار اور فلسفہ و نظریہ مذہب کو بھی موضوع سخن بنایا جائے گا۔ ان کے انداز حکومت پر تبصرہ بھی ہو گا۔ انہوں نے جو سماجی اور مجلسی اصلاحات نافذ کیں، ان کا ذکر بھی آئے گا۔ ان کی تعمیرات کا نقشہ بھی پیش کیا جائے گا۔

ان کی خوبیوں کو بھی منظرِ عام پر لایا جائے گا اور ان کی کمزوریوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جائے گا جہاں وہ دادِ تحسین کے سزاوار ہوں گے۔ وہاں بخل سے کام نہیں لیا جائے گا۔ اور جہاں ان سے کوئی غلطی یا لغزش ہوئی ہے اسے چھپایا نہیں جائے گا۔

اس کتاب کا موضوع فاطمیوں کے عہدِ حکومت و خلافت کی سیاسی، تمدنی اور علمی تاریخ بیان کرنا ہے۔ متنازعہ فیہ مسائل پر نہ اعلانِ جنگ کرنا ہے، نہ محاکمہ کرنا، نہ حسبِ عقائد کا اعلان جس کا نتیجہ ہمیشہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی خوں ریزی ہوئی۔ ان کی عظیم و جلیل سلطنتیں تارِ عنکبوت کی طرح ایک جھٹکے میں ختم ہو گئیں۔ پانی کی طرح ان کا خون بہا۔ اس خون کی سر بہ فلک موجیں مسجدوں پر سے بھی گذریں اور خانقاہوں پر سے بھی۔ جنہیں ایک خدا، ایک رسولؐ اور ایک قبلے نے ایک کر دیا تھا۔ وہ تفرقے کے شکار ہو گئے۔ اس تاریخ کا مقصد اقوام کی دبی ہوئی، بجھی ہوئی چنگاریوں کو ہوا دے کر بھڑکانا اور شعلہ بنا دینا نہیں ہے۔ صرف بیانِ واقعہ ہے۔ دیانت، راستی اور سچائی کے ساتھ۔

—— اس تصریح کی ضرورت یوں پیش آئی کہ عرصہ ہوا خلافتِ فاطمیین اور "اسماعیلی مذہب" پر جانبدارانہ قسم کی دو کتابیں ایک سابق اسماعیلی اہلِ علم اور اہلِ قلم کی حیدرآباد دکن سے شائع ہو کر گرمیٔ محفل کا سامان بن چکی ہیں۔ ہم اس طرزِ کار کی پیروی نہیں کریں گے۔ صرف تاریخ بیان کریں گے۔ جو نہ کسی کی دشمن ہوتی ہے نہ دوست۔ جو صرف واقعات اور حقائق سے بحث کرتی ہے۔ ہم اسی اصول کی پیروی کریں گے۔

فاطمی عہدِ خلافت سے متعلق دوسرے ابواب پیش کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ دولتِ فاطمیہ کی مجمل اور مختصر تاریخ پیش کر دی جائے۔ تاکہ آنے والے ابواب کو اس روشنی میں آسانی سے سمجھا جا سکے۔

اس کتاب میں اسماعیلیوں کے عقائد اور فلسفے کا بھی ضروری تذکرہ موجود ہے۔ اسے ایک علمی مواد کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ تاکہ یہ اندازہ ہو سکے کہ اس تحریک کے پھلنے پھولنے، فروغ پانے اور قوت حاصل کرنے کے اسباب و عوامل اور محرکات کیا تھے؟

ہر مذہب اور ہر فرقہ اپنا ایک مخصوص نظامِ فکر رکھتا ہے۔ اسے اگر نظر انداز کر دیا جائے

تو اس کی سرگرمیوں اور اقدام و عمل کا پس منظر اوجھل رہے گا۔ لہٰذا اس پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے تاکہ تحقیقی اور علمی طور پر اس کے بارے میں کسی نتیجہ تک پہنچا جا سکے۔ لیکن اس نظام فکر کو پیش کرتے وقت ہم نے جدلی اندازِ گفتگو نہیں اختیار کیا ہے کہ یہ چیز ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ اور اگر اس پر بحث کی جائے تو بھی آج تک کسی کے لیے بھی ایسا قولِ فیصل پیش کرنا ممکن نہیں ہو سکا ہے جس نے فکری اختلافات ختم کر دیئے ہوں۔ البتہ فتنوں کے اور حربِ عقائد کے اور بالآخر باہمی رزم و پیکار کے دروازے ضرور کھل گئے ہیں۔

رئیس احمد جعفری

زیارت ۲۹ ستمبر ۱۹۶۳ء

دولتِ فاطمی کی مجمل تاریخ

○

فاطمیوں کے عہدِ حکومت کے اصلاحات، سیاسی، معاشرتی حالات اور امورِ عامہ پر ایک نظر

اسماعیلی فرقہ ایک خفیہ جماعت سے عبارت ہے۔ اس کی سرداری جس کے ہاتھ میں ہوتی ہے اسے "امام" کہتے ہیں۔ "صاحب الزمان" بھی اس کا نام ہے۔ اسے اپنے ارکانِ جماعت کی جان و مال پر پورا تسلط اور اقتدار حاصل ہوتا ہے۔ اس جماعت کے اسرار و رموز انہی لوگوں پر منکشف کیے جاتے ہیں۔ جو مختلف مراحل تربیت اور آزمائش کے طے کر لیتے ہیں ان سے سخت قسم لی جاتی ہے کہ اپنے مذہب کے اسرار دوسروں پر فاش نہیں کریں گے، (کسی کو اپنی جمعیت کے راز بتائیں گے۔ قسم ان لوگوں سے لی جاتی ہے جو تین مرحلے کامیابی کے ساتھ ختم کر کے مرتبۂ رابعہ پر فائز ہو چکے ہیں۔ باقی رہے اس خفیہ جماعت اسماعیلی کے عام افراد، سو انہیں چند معمولی اور سرسری باتوں کے سوا کچھ نہیں بتایا جاتا۔ دعاۃ جماعت انہیں صرف وہی باتیں بتاتے ہیں جو ان کی عقل اور فہم کے ادراک سے ماورا نہ ہوں۔ وہ بھی اس وقت جب ان کے بارے میں یقین کامل ہو جاتا ہے کہ وہ ہر اعتبار سے قابلِ اعتماد ہیں۔ اور ان سے جماعت کو کسی طرح کا خطرہ ہے نہ گزند پہنچ سکتا ہے۔ یہ عام افراد جماعت داعی کے معمول ہوتے ہیں جن کے دلوں کو وہ اپنے امام کی عقیدت و محبت کا گنجینہ بنا دیتا ہے۔

اور اسماعیلی مذہب کے یہ عام لوگ اپنے ذعمار کے اخلاص اور صدقِ ایمان پر پورا بھروسہ رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک صرف وہی صراطِ مستقیم پر گامزن ہیں۔ چنانچہ آنکھ بند کر کے ان کی اطاعت کرتے ہیں۔

اسماعیلیوں کے ہاں تہذیب و تربیت کے کئی مدارج ہوتے ہیں۔ آخری درجہ نواں ہے[2] جس پر فائز ہونے کے بعد دعوات تسع کی تلقین کی جاتی ہے۔ لیکن اس درجہ تک صرف چند ہی لوگ پہنچ سکتے ہیں۔ خود دعاۃ تک درجہ خامسہ سے آگے نہیں بڑھ پاتے۔ یہ وہ درجہ ہے جس پر پہنچنے کے بعد داعی بعض اسرارِ جمعیت سے واقف ہو جاتا ہے۔

اسماعیلی جماعت کے جو لوگ درجۂ رابعہ تک نہیں پہنچتے، انہیں صرف دینی اور ادبی مبادیات کا علم ہوتا ہے سیاسی، اجتماعی اور اقتصادی تعلیمات کا انکشاف ان پر اس وقت تک نہیں کیا جاتا جب تک وہ درجہ رابعہ میں داخل نہ ہو جائیں۔

اس طرح اسماعیلیوں نے اپنے اتباع اور پیروؤں کے مختلف مراتب اور مدارج قائم کر لیے ہیں۔ عام لوگوں کی رسائی تو صرف ان کی عقل و فہم کے مطابق مبادی اور اصولِ عامہ تک ہوتی ہے مراتب عالیہ پر فائز ہونے والوں کے لیے خاص خاص اسرار و رموز منکشف کیے جاتے ہیں۔

تلقین دعوت کا طریقہ یہ ہے:

(۱) —— بیعت اس شخص سے لی جائے جو پورے طور پر راضی ہو۔
(۲) —— جس کا اخلاص و یقین شک و شبہ سے اورا ہو۔
(۳) —— جس کی عفت اور دین قابلِ اعتماد ہو۔
(۴) —— کسی کو اطاعت اور دخولِ بیعت پر مجبور نہ کیا جائے۔
(۵) —— اسرار انہی لوگوں پر فاش کیے جائیں جو اہل ہوں۔
(۶) —— مستضعفین پر اور ان لوگوں پر جو تحمل سے عاجز ہوں۔ کشف اسرار نہ کیا جائے[3]

لیکن اس رازداری کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگ اسمٰعیلیوں کے بارے میں بدگمانی کا شکار ہو گئے۔ اور ان کی طرف ایسی باتیں منسوب کرنے لگے جنہیں حقیقت اور واقعیت سے دور کا واسطہ بھی

نہیں۔ کسی نے انہیں زندیق کہہ کر پکارا۔ کسی نے انہیں کافر کہا۔
اسمٰعیلیوں پر جو الزامات لگائے گئے اور ان کے خلاف جو فتوے دیئے گئے ان میں سے چند یہ ہیں :-

① یہ ملحد ہیں
② یہ کسی چیز پہ ایمان نہیں رکھتے۔
③ کتب منزلہ، قرآن، توراۃ، زبور اور انجیل کے بارے میں سب لوگوں کو شک اور وسوسے میں مبتلا کر دیتے ہیں۔
④ انبیاء اور شرائع کے منکر ہیں۔
⑤ بعث کے قائل نہیں۔
⑥ یہ لوگ کہتے ہیں جو شخص احکام و شرائع منزلہ کی اتباع کرتا ہے اور صرف ظاہر پہ عمل کرتا ہے وہ کافر اور گمراہ ہے۔
⑦ یہ لوگ اباحی ہیں۔ یعنی محرمات کو حلال کر دیتے ہیں اور گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرتے رہتے ہیں۔
⑧ اپنے پیروؤں کو انہوں نے اجازت دے رکھی ہے کہ وہ اپنی لڑکیوں اور بہنوں سے نکاح کریں۔ شراب پئیں اور ہر قسم کی لذتیں بے محابا حاصل کریں گے

اسماعیلی تفسیر ظاہری کو ناپسند کرتے ہیں اور شرائع کے احکام و آیات کی تاویل باطنی کے جو معنی برحق ہو قائل ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ قرآن کا جس طرح ایک ظاہر ہے اسی طرح ایک باطن بھی ہے۔ اور اس کی حیثیت جوہر اور مغز کی ہے۔ پس قرآن کی کنجی ائمہ کے ہاتھ میں ہے۔ کیوں کہ تاویل کے مستودع حقیقی وہی ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسماعیلی فلسفۂ یونان سے متاثر تھے اور فلسفۂ افلاطونی کے قائل تھے۔ کہ اصل چیز "ظواہر اشیاء" نہیں "جواہر اشیاء" ہیں۔

انہوں نے آیات قرآنی کی جو تاویلات کی ہیں ان میں سے چند ملاحظہ ہوں :-

اللہ تعالیٰ اپنی کتاب عزیز میں فرماتا ہے :-

وَ ظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَانْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ،

یعنی (اے بنی اسرائیل) ہم نے تمہیں دھوپ سے بچنے کے لیے بادل کا سایہ دیا اور تم پر من و سلویٰ نازل کیا "

اسماعیلی کہتے ہیں :-

" غمام " (بادل) سے مراد وہ امام ہے جسے موسیٰ نے بنی اسرائیل کی ہدایت کے لیے مقرر کیا تھا۔ اور من و سلویٰ سے مراد وہ علم ہے جو آسمان سے داعی کے لیے اترا تھا[۶]

قرآن میں " الشجرة الملعونة " کا ذکر آیا ہے - اسماعیلی اس کی یہ تاویل کرتے ہیں کہ شجر ملعونہ بنو امیہ ہیں[۷]

۳۳۴ھ میں یعنی دسویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں جو خفیہ جماعت " اخوان الصفا " کے نام سے قائم ہوئی تھی - یہ بھی اسماعیلیوں پر مشتمل تھی[۸]

اسلام کے کئی بڑے بڑے فلاسفہ مثلاً فارابی (المتوفی ۳۳۹ھ - ۹۵۰ء) ابن سینا (۴۲۸ھ - ۱۰۳۲ء) ابن ہیثم (المتوفی ۴۳۰ھ - ۱۰۳۸ء) الغزالی (المتوفی ۵۲۰ھ ۱۱۲۶ء) وغیرہم کسی نہ کسی درجہ میں بہر حال اسماعیلیوں کے فلسفہ سے متاثر تھے بہرکیف اس میں کوئی شبہ نہیں کہ فاطمیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ دین کے دو پہلو ہیں - ظاہری اور باطنی ، اسی طرح معنی بھی دو طرح کے ہیں - صریحی اور مؤول (تاویل شدہ)[۹] یہی وجہ ہے کہ فاطمیوں کے ہاں مبادی سیاست و اجتماعیت سے ان کے فلسفیانہ اور ادبی آراء مضبوط اور محکم طور پر مربوط ہیں -

سیاسی طور پر ان کے فکر و نظر کی بنیاد یہ تھی کہ بنو عباس کے ہاتھ سے زمام اقتدار چھین کر ان لوگوں کے سپرد کی جائے جو حضرت فاطمۃ الزہراؓ کے بطن سے حضرت علیؓ کی اولاد ہوں - اس عقیدے کو اس جذبہ سے اور تقویت ملی کہ قرب ظہور مہدی ——— جو نسل فاطمہ سے ہوگا ——— کا وقت آگیا ہے - جو دولت بنو عباس پر قبضہ کرے گا - اور زمام حکمداری اس کے ہاتھ میں آجائے گی - تاکہ وہ دین کی تائید کرے - اور پرچم عدل بلند کرے - وہ جملہ ممالک اسلامیہ پر قبضہ کر کے انہیں ایک جھنڈے تلے مجتمع کر دے گا -

اسلام میں ابن سبا نے "رجعت" [۱۰] کا جو نظریہ داخل کیا۔ اس نے اسماعیلیوں میں غیر معمولی اہمیت اختیار کر لی [۱۱] ان کا یہ عقیدہ تھا کہ ان کے امام محمد بن اسماعیل امام مہدی کی حیثیت سے بہت جلد پھر نمودار ہوں گے۔ یہی وہ عقیدہ ہے جسے ابو عبداللہ شیعی نے بربر میں پھیلایا۔ صاحب "نظم الحکم بمصر فی عصر الفاطمیین" کا بیان ہے کہ ہمارے نزدیک نظریہ مہدی سراسر غیر معمولی اور یکسر خرافات ہے۔ لیکن اسماعیلیہ اپنے نظریہ کی تائید میں حدیث نبوی ؐ پیش کرتے ہیں کہ:۔

"اس دنیا کے ختم ہونے میں اگر ایک دن بھی باقی رہ جائے گا۔ تب بھی اللہ تعالیٰ میرے اہل بیت میں سے ایک شخص کو مبعوث کرے گا، جو دنیا کو عدل سے بھر دیگا جس طرح وہ جور سے بھر گئی تھی" [۱۲]

اسماعیلیوں نے اس حدیث کو بھی خوب شہرت دی:۔

"جو مہدی کی تکذیب کرے وہ کافر ہے" [۱۳]

لیکن یہ حدیث وضعی ہے۔

پھر اسماعیلیوں نے کہنا شروع کیا کہ امام منتظر جو علوی ہے۔ قیروان میں موجود ہے اور اب لوگوں پر خلفاء بنی عباس کی طاعت واجب نہیں رہی ہے۔ یہ امام دنیا کے ہر روگ کا علاج شافی اپنے پاس رکھتا ہے یہ لوگوں میں عدل کو عام کر دے گا۔

ان میں سے بعض نے اپنے امام کے بارے میں فرط جذبات سے اس درجہ غلو کیا کہ یہاں تک کہنے لگے۔ کہ اللہ تعالےٰ نے امام علی کے جسم میں اور ان کے بعد ان کی اولاد کے جسم میں حلول کر لیا ہے یہ دعوت جنگل کی آگ کی طرح پھیلنے لگی۔ بہت جلد ان لوگوں نے شمالی افریقہ، صقلیہ (سسلی) مصر، شام، ایشیائے کوچک اور سواحل بحر احمر تک اپنی یہ دعوت پھیلا دی۔ علاوہ ازیں، یمن، موصل، بلاد ماوراء النہر، مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، حتیٰ کہ بغداد تک ـــــ جو عباسی خلفا کا پایہ تخت تھا ـــــ اس نے جڑ پکڑ لی۔ اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ بساسیری نے خلیفہ عباسی قائم ۴۲۲ھ - ۴۶۷ھ (۱۰۳۱ - ۱۰۷۵ء) کا نام بغداد میں خطبہ سے نکال دیا۔ اور خلیفہ مستنصر فاطمی کا نام داخل کر دیا۔ اذان میں بھی "حی علی خیر العمل" کا اضافہ

کر دیا۔

ہم دیکھتے ہیں کہ تناسخ [13] اور حلول [14] کا عقیدہ اور رجعت [15] کا عقیدہ شیعوں میں وجود و عدم دونوں کا حامل ہے۔ چنانچہ کتب شیعہ میں عبداللہ بن سبا سے اظہار برأت بھی ملتا ہے۔ وہ اس پر لعنت کرتے ہیں۔ اور اس کی پیش کی ہوئی حدیث کو خرافات قرار دیتے ہیں گئے ہیں۔ افسانہ طرازوں کی کہانیاں ہیں جو خواہ مخواہ شیعوں کی طرف منسوب کر دی گئی ہیں۔ ان کہانیوں سے شیعوں کی وابستہ کرنا ظلم فاحش اور خطاء واضح ہے۔ کیونکہ اس عقیدے سے اسلام کی بنیاد پر ضرب پڑتی ہے۔ یہ سراسر الحاد و زندقہ ہے [16]

● ——— اجتماعی معاملات میں بھی ان کے مخصوص افکار و آرا میں -

منصوریہ میں خلیفہ المعز الدین اللہ نے شیوخ کتامہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:۔

" صرف ایک بیوی کو اپنے اوپر لازم کر لو۔ تکثیر ازواج کی طرف متوجہ نہ ہو۔ اس طرح تمہاری زندگی بے مزہ ہو جائے گی۔ تمہیں ضرر پہنچے گا۔ تمہارے بدن ڈھل جائیں گے۔ تمہاری قوت رائگاں جائے گی۔ .... لہذا ایک آدمی کے لیے ایک بیوی بہت کافی ہے [18]

ڈاکٹر عطیہ مشرفہ کا بیان ہے:۔

"یہ لوگ عورت کے ضعف اور سرعت استسلام (اثر پذیری) کے بھی قائل تھے۔ چنانچہ پردے میں سخت تشدد برتا کرتے تھے۔ چنانچہ بعض خلفا کے عہد میں اسے جھروکے سے جھانکنے، چھت پر چڑھنے، دروازے پر کھڑے ہونے، عام حماموں میں داخل ہونے کی ممانعت کر دی گئی۔ اسی طرح عام ضروریات کی چیزیں بیچنے والے لوگ جو گھروں کا چکر لگا کر سودا فروخت کرتے پابند تھے کہ ایک ٹوکری میں مطلوبہ چیزیں رکھ کر دکھا دیں۔ اگر پسند آ گئی تو گھر کی خاتون اس میں قیمت رکھ دیتی تھی۔ ورنہ واپس کر دیتی تھی۔ اس بندش کا مقصد یہ تھا کہ فروخت کرنے والا عورت کی صورت پر نظر نہ ڈال سکے [19]

اس معاملہ میں، ان کے بعض لوگ اتنے انتہا پسند تھے کہ عورتوں کو متہم کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے۔[۲۰] چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ خلیفہ الحاکم بامر اللہ الفاطمی نے اپنی سگی بہن ست الملک[۲۱] کو بھی اس الزام میں کہ لوگ اس کے حضور میں آمد و رفت رکھتے ہیں۔ متہم کر دیا۔[۲۲] بلکہ سخت اور عبرت ناک سزا دینے سے بھی گریز نہیں کیا جاتا تھا۔[۲۳] عورتوں پر حجاب کی ان سخت پابندیوں کی وجہ شاید یہ تھی کہ اس زمانے میں عورتیں زیادہ آزادہ رو ہوتی جا رہی تھیں۔ عفت و کرامت کی نعمت سے محروم ہو گئی تھیں۔ ذہبی نے اپنی تاریخ اسلام (قلمی نسخہ ج ۳ ورق ۲۶۱) عہد دولت فاطمیہ میں فسادِ زن کا ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے:۔

"قاضی القضاۃ مالک بن سعید ایک مرتبہ راستے سے گزر رہے تھے کہ انہیں ایک عورت نے پکارا۔ انہیں خلیفہ حاکم اور اس کے آباء و اجداد کی قسم دی کہ ذرا ٹھہر جائیں۔ وہ ٹھہر گئے۔ وہ زار زار رونے لگی۔ اور گویا ہوئی۔ میرا ایک بھائی ہے جو لب گور ہے۔ خدا کی قسم! میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ اسے مرنے سے پہلے دیکھ لوں۔ قاضی نے اسے دو آدمیوں کے ساتھ بھائی کے ہاں بھیج دیا۔ اس نے ایک دروازہ کھٹکھٹایا، اور اندر داخل ہو گئی۔ یہ اس آدمی کا گھر تھا۔ جس سے وہ محبت کرتی تھی۔ اور وہ آدمی بھی اس سے محبت کرتا تھا۔

اس اثنا میں عورت کا شوہر آ گیا۔ اس نے پڑوسیوں سے پوچھا۔ میری بیوی کہاں گئی؟ انہوں نے سارا واقعہ بتا دیا۔ وہ دوڑا دوڑا قاضی کے پاس آیا۔ اور چیخ چیخ کر گویا ہوا:

"میں اس عورت کا شوہر ہوں۔ اس کا کوئی بھائی نہیں ہے۔ میں یہاں سے اس وقت تک نہیں ٹلوں گا۔ جب تک آپ میری بیوی مجھے واپس نہ دلا دیں۔"

قاضی القضاۃ بہت سٹ پٹایا۔ وہ خلیفہ حاکم کی سطوت سے بہت خائف تھا۔ چنانچہ امیر المومنین سے معذرت کرتے ہوئے اسے سارے واقعہ سے مطلع کیا خلیفہ نے عورت کی تلاش میں آدمی بھیجے۔ ان لوگوں نے اس عورت اور آدمی کو عریاں حالت میں نیند اور نشہ میں مست پڑا پایا۔ چنانچہ وہ دونوں حاکم کے پاس

لئے گئے۔

حاکم بامراللہ نے عورت کے بیلے حکم دیا کہ آگ میں جلا دی جائے اور مرد کے لیے حکم دیا کہ اسے ایک ہـــزار کوڑے مارے جائیں اور یہ سزا زانی اور زانیہ کی نص شریعت غرا کے خلاف تھی۔"

یہی وجہ ہے کہ اسمٰعیلیوں کی اہم اجتماعی اصلاحات میں ایک خاص چیز یک زوجیت کا حکم بھی ہے تاکہ عورت شبہات سے اور بدگمانیوں سے محفوظ رہے۔ اور اسی لیے انہوں نے حکم دے رکھا تھا۔ کہ عورت منہ کھول کر باہر نہ نکلے۔ اور اگر جنازہ کے ساتھ جائے تو چیخ کر نہ روئے۔

درحقیقت، تعدد ازواج کچھ ایسی لذت آفریں چیز ہے کہ اس کے خلاف حکومت جو اقدام بھی کرے۔ رائے عامہ اُس کی تائید نہیں کرتی۔ خود پاکستان میں عائلی قوانین کے خلاف جو خروش اور ہیجان پایا جاتا ہے وہ میرے اس دعوے کا بہترین ثبوت ہے۔

خلیفہ آمر ایک منچلا، نڈر اور اولوالعزم فرماں روا تھا۔ وہ جو فیصلہ کر لیتا تھا اسے نافذ کر کے رہتا تھا۔ اس نے اسلام کی روح کو پیش نظر رکھ کر یک زوجی قانون نافذ کیا۔ اور اس پر سختی سے عمل درآمد شروع کر دیا۔ مذہبی اختلاف کے باعث لوگ پہلے ہی اس سے نالاں تھے۔ اس فیصلے نے انہوں کو بھی اُس سے بیزار کر دیا۔ اور اس کے خلاف پروپیگنڈے کی مہم شروع ہو گئی۔ یہ روایت جسے ڈاکٹر عطیہ نے اپنی کتاب میں ذہبی کی غیر مطبوعہ کتاب سے نقل کیا ہے۔ پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ اسے واقعیت سے کوئی تعلق نہیں۔ ذہبی بلاشبہ ایک بلند مرتبت شخصیت کے حامل تھے۔ لیکن بہرحال وہ بھی آدمی ہی تھے۔ جبکہ جذباتی اور دینی طور پر وہ اس حکومت اور اس حاکم سے خوش بھی نہیں تھے۔ اس طرح کی روایتوں پر اعتماد کر کے انہیں اپنی کتاب میں شامل کر دینا اسی کیفیت کا مظہر ہے۔

ذہبی کی اس روایت پر حسب ذیل تنقیحات قائم ہوتی ہیں:۔

① ــــــ اپنے محبوب کے ہاں اگر وہ عورت جانا چاہتی تھی تو اسے قاضی القضاۃ سے استمداد کی اور انہیں واسطہ بنانے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ خود بھی

جا سکتی تھی۔

(۲) ــــــ اگر یہ کہا جائے کہ شوہر نے گھر سے باہر نکلنے پر قدغن لگا دی تھی۔ تو بھی قاضی القضاۃ جیسے ذمے دار شخص کے لیے یہ کب روا تھا کہ وہ شوہر کی بات سنے بغیر اپنی صواب دید پر عورت کو "بھائی" کے گھر جانے کی اجازت دے دیں؟

(۳) ــــــ قاضی نے جن لوگوں کو عورت کی تلاش میں بھیجا وہ جب پہنچے ہوں گے تو گھر کھلا نہیں ہو گا۔ انھوں نے دستک دی ہو گی۔ اور چونکہ روایت سے یہ ثابت ہوتا ہے۔ کہ گھر میں مرد اور عورت کے سوا کوئی اور نہیں تھا ــــــ اور ہونا بھی یہی چاہیے تھا ــــــ تو ظاہر ہے۔ دروازہ یا مرد نے کھولا ہو گا یا عورت نے۔ لہذا دونوں کا بیک وقت عریاں اور نیند میں لت پت پایا جانا بعید از عقل اور ناقابلِ قبول ہے۔

(۴) ــــــ خلیفہ حاکم لاکھ سفاک اور خون آشام سہی۔ لیکن وہ زنا کے جرم میں عورت کو سنگ سار تو کر سکتا تھا لیکن آگ میں جلانے کا حکم نہیں دے سکتا تھا

(۵) ــــــ عورت کو تو خلیفہ حاکم نے جلوا دیا اور مرد کو "ایک ہزار" کوڑے لگانے کا حکم دیا۔

کیا یہ بات عقل میں آتی ہے ـــ؟

ایک ہزار کوڑے کون جسم برداشت کر سکتا ہے؟ اور کون قاضی ایک ہزار کوڑے کی سزا کا نفاذ کر سکتا ہے؟

(۶) ــــــ درحقیقت یہ روایت بھی اسی طرح کی ہے۔ جس طرح الف لیلہ اور اغانی وغیرہ میں ملتی ہیں۔ حیرت اس روایت کے اختراع پر نہیں ہے۔ اس پر ہے کہ علامہ ذہبی جیسے بلند مرتبت شخص نے اسے کیونکر قبول کر لیا۔

(۷) ــــــ اور چونکہ یہ روایت ذہبی کی تاریخ میں ہے محض اس لیے بے چون و چرا قبول کر لی جائے؟

شبہ نہیں۔ فلکیات اور نجوم سے انہیں دلچسپی تھی۔ لیکن پرستش کے لیے نہیں۔ خدائے واحد سے ڈرنے اور اس کی معرفت کے لیے۔ چنانچہ خلیفہ منصور فاطمی کہا کرتا تھا:-

"خدا کی قسم! ہم اس علم سے صرف اس لیے دلچسپی رکھتے ہیں کہ یہ اللہ سبحانہٗ تعالےٰ کی وحدت پر دلالت کرتا ہے اور منفعلات میں اس کی تاثیر حکمت اس سے ظاہر ہوتی ہے" [۳۴]

[۳۵]

- فاطمیوں کی اقتصادی اصلاحات میں ایک مساوات مرغوب بھی تھی
- بلکہ امر واقعہ یہ ہے کہ اسماعیلی اور ان کے بھائی قرامطہ اسلام کے کمیونسٹ ہیں۔ چنانچہ انہوں نے مختلف قسم کے ٹیکس اور محاصل مال اور اقتصادی تفاوت کم کرنے اور دور کرنے کے لیے عاید کر رکھے تھے۔ اس طرح وہ ناداروں کی ضروریات زندگی پوری کرتے تھے۔ کھانے، کپڑے اور رہائش کا بندوبست کرتے تھے۔ اس طرح انہوں نے ان لوگوں کو اپنے اندر جذب کر لیا تھا جو تنگ دستی اور مالی زبوں حالی کا شکار تھے۔ نیز انہوں نے ذاتی ملکیت اور دولت کے بعض مصادر بھی حکومت کی تحویل میں لے لیے تھے۔ اور مفاد و مصالح عام سے تعلق رکھنے والے بعض وسائل بھی قبضہ میں لے لیے تھے۔ کہ عوام کی بھلائی اور سوسائٹی کی فلاح اس میں تھی۔ مثلاً مناجم، ٹرانسپورٹ، اسٹور، دوکانیں، سرائے، حمام، پن چکی [۳۶] وغیرہ
- فاطمی خلفاء ابطال ملکیت اراضی کے سخت حامی تھے۔ وہ بڑے بڑے زمینداروں سے زمین لے کر صحیح قسم کے مستحق ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیتے تھے۔ اس طرح اگر کوئی معتوب ہوتا تھا۔ تو اس کی املاک و جائیداد بحق سرکار ضبط کر لی جاتی تھی۔ اور اس سلسلہ میں ایک مستقل محکمہ قائم کر دیا گیا تھا۔ خلیفہ الحاکم فاطمی کہا کرتے تھے:-

"المال، مال اللہ والخلق عیال اللہ"

مال، اللہ کا مال ہے۔ اور لوگ خدا کی عیال

وہ یہ بھی کہا کرتے تھے :-

لا فرق بین غنی و فقیر -

یعنی دولت مند اور مفلس کے درمیان کوئی فرق نہیں [۲۷]

○ —— اسماعیلیوں کا ایک اور خاص نظریہ جو انہیں دوسروں سے ممتاز کرتا ہے یہ تھا کہ وہ اسلام میں قومی عصبیت کے سخت مخالف تھے اور حقیقی اخوت عامہ کے علمبردار تھے۔ صرف مسلمانوں مسلمانوں کے مابین نہیں۔ بلکہ اختلاف دین و قوم و طبقات کے باوجود تمام انسانوں کے درمیان ؛ [۲۸]

○ —— اسماعیلی حریت فکر کے بھی علمبردار تھے۔ وہ اپنی جماعت میں تمام عقلائے دہر کو شامل کر لینا چاہتے تھے۔ اسماعیلیوں کی تحریک تھی ہی نشر حریت فکر کے لیے۔ چنانچہ بعض نے تو بے دھڑک اپنے افکار و خیالات کا اظہار کرنے سے بھی گریز نہیں کیا۔ چنانچہ ابو العلاء المعری۔ اور ابن ہانی نے ایسے افکار کا بھی اعلان کرنے میں جھجک نہیں محسوس کی جو کفر کے ترجمان ہیں [۲۹]

دولت فاطمیہ کی سیاسی تاریخ مجمل طور پر یہ ہے کہ شمالی افریقہ میں ایک شیعی خاندان نے قبل اس کے کہ اسماعیلی داعی اپنا عقیدہ پھیلانے، حکومت قائم کی [۴۰] اس علاقہ میں اس دعوت کے پھلنے پھولنے کا سبب یہ ہوا کہ بغداد کی مرکزی حکومت سے یہ بہت دور تھا۔ اھل بربر عباسی گورنروں کو پسند نہیں کرتے تھے جنہوں نے محاصل کا بوجھ ناقابل برداشت حد تک ان پر لاد رکھا تھا [۴۱] اسی اثنا میں عبیدیوں کا ستارہ چمکا۔ اور ان کی دعوت نشو و نما کے مراحل تیزی سے طے کرنے لگی۔ ارض مغرب میں الحلوانی اور ابو سفیان [۴۲] نے جو تخم ریزی ۱۴۵ھ (۷۶۲ء) سے شروع کی تھی۔ وہ اب رنگ لائی۔ اور اس رنگ کو ابو عبداللہ الشیعی اور اس کے بھائی ابو العباس [۴۳] نے اہل مغرب کی استمالت اور تالیف قلب کر کے اور چوکھا کر دیا۔ اور انہیں حب اہل بیت کے جذبے سے سرشار کر دیا۔ پھر جب عبیداللہ المہدی پہلا فاطمی خلیفہ وارد افریقہ ہوا تو اس نے رقادہ [۴۴] میں خلافت علویہ قائم کی۔ پھر قیروان [۴۵] کو اپنا پایہ تخت

بنایا۔ پھر "مہدیہ" تعمیر کیا۔ اور وہاں اپنے ہاتھ سے منار اسماعیلیہ کی بنیاد رکھی۔ اس کے آتے ہی دعوت فاطمی جنگل کی آگ کی طرح پھیلنے لگی۔ چنانچہ تونس [45] میں (۲۹۶ھ – ۹۰۹ء) اس نے اغالبہ کی حکومت بھی ختم کر دی [46] اور جلد بلادِ مغرب پر شیعوں کی بالادستی قائم ہو گئی۔ المہدی نے بنو مدرار کو سجلماسہ سے [47] اور بنو رستم (تاہرت) کو بے دخل کر دیا۔ اور ۳۰۸ھ (۹۲۰ء) میں اپنا دار الحکومت مہدیہ [48] کو بنا لیا۔

مہدی کو شروع ہی سے احساس تھا کہ مصر پر قبضہ کیے بغیر کام نہیں چلے گا۔ چنانچہ فتح مصر کے لیے اس نے بری اور بحری حملے اپنے ولی عہد ابو القاسم کی سرکردگی میں شروع کر دیے ایک مرتبہ تو اسنے اسکندریہ اور فیوم پر غلبہ حاصل کر لیا [49] ایک مرتبہ جیزہ اور فیوم اور صعید [50] کی بعض اراضی پر فاطمیوں کا قبضہ ہو گیا اور قریب تھا کہ مصر کے دار الحکومت پر قبضہ کر لے۔ کیونکہ اس کا بحری بیڑا رشید [51] تک پہنچ گیا تھا۔ لیکن عباسی خلیفہ مقتدر کے خادم خاص مونس ملقب بہ المظفر نے اسے پیچھے دھکیل دیا۔ کیونکہ مصر میں حملے رد کرنے کی ابھی قوت تھی [52]۔ اس کے بعد فاطمی مغرب میں خارجیوں کی شورش رفع کرنے میں جن کا سربراہ ابو یزید مخلد بن کیداد تھا، مصروف ہو گئے۔ اور مصر کی طرف متوجہ نہ ہو سکے۔

پھر جب شمالی افریقہ میں فاطمی حکومت پورے طور پر مستحکم ہو گئی تو چوتھے فاطمی خلیفہ المعز لدین اللہ نے فتح مصر کا اٹل فیصلہ کر لیا۔ اسماعیلی داعی خفیہ خفیہ [53] اپنا کام کر رہے تھے۔ اس لیے فتح کا مرحلہ اور آسان ہو گیا۔

یہ وہ وقت تھا کہ دولت عباسیہ یکسر مضمحل اور کمزور ہو چکی تھی۔ اندلس میں امویوں کا پرچم لہرا رہا تھا [54] اخشیدیوں [55] کا مصر میں اور فاطمیوں کا مغرب میں اس طرح اور بھی کئی چھوٹی چھوٹی ریاستیں آزاد اور خود مختار حکومت کی حیثیت سے قائم ہو چکی تھیں [56]۔ علاوہ ازیں اس زمانہ میں مصر وبا اور قحط کا بری طرح شکار ہو رہا تھا۔ چھ لاکھ آدمی اس مصیبت میں ہلاک ہو چکے تھے۔ آدھ سیر روٹی دو درہم میں مشکل سے ملتی تھی [57] مصر کے دعاۃ نے یقین دلا رکھا تھا کہ رستے سے "حجر اسود" (مراد کافور اخشیدی ہے [58]) کے ہٹتے ہی ساری دنیا معز کے قدموں پر سر جھکا دے گی [59] اور یہ بھی واقعہ ہے کہ مصری ترکوں کی فوجی حکومت کے

ظلم و جور سے حد درجہ نالاں تھے[٦٠] چنانچہ انہوں نے خود معز الدین اللہ کو لکھا کہ فوج لے کر آیئے۔ ہم اطاعت کو حاضر ہیں[٦١]

معز مصر کی جغرافی اور حربی اہمیت سے واقف تھا۔اس نے کافور کے مرتے ہی ایک بہت بڑی فوج زیادہ سے زیادہ ساز و سامان کے ساتھ[٦٢] فتح مصر کے لیے روانہ کر دی جس کا سالار اس کا رومی غلام جوہر صقلی تھا۔

مصر کے سر برآوردہ اصحاب کا وفد جوہر سے اسکندریہ کے قریب قریۂ باتروجہ[٦٣] (رجب ۳۵۸ھ) میں ملا۔ اور امان طلب کی۔ جوہر نے امان موکد عطا کر دی اور تحریر لکھدی اور آخرکار اصحاب کافور کی مقادمت کو پامال کرتا جوہر فاتحانہ شان سے ۱۷ شعبان ۳۵۸ھ (۱۰ جون ۹۶۹ء) کو مصر کے بعد فسطاط میں داخل ہوا۔ اور اس طرح اخشیدیوں کے ہاتھ سے مصر کی حکومت نکل گئی۔ اس مرتبہ پھر جوہر نے اپنے امان نامہ کا اعادہ کیا[٦٤] اور خلیفہ معز کو فتح مصر کی خوش خبری بھیجی[٦٥]

یہ بشارت نصف رمضان ۳۵۸ھ کے قریب معز کو ملی۔ اس کے شاعر دربار ابن ہانی نے ایک قصیدہ بلیغہ اس موقع پر پیش کیا[٦٦]

اور شوال ۳۶۱ھ (۵ اگست ۹۷۲ء) کو المعز الدین اللہ اپنے جنود و خزائن اور حاشیہ نشینوں، اور چوبی تابوتوں میں رکھی ہوئی مہدی، قائم اور منصور کی لاشوں کو لے کر مصر روانہ ہوا۔ اور یوسف ابن زیری منہاجی کو افریقہ کا والی بنا گیا۔ اور لوگوں کو اس کی سمع و طاعت کا حکم دیا۔ طرابلس الغرب کی ولایت عبداللہ بن یخلف کتامی کو سونپی۔ صقلیہ[٦٧] کا گورنر ابوالقاسم علی بن الحسن بن علی بن الحسین کو بنایا۔ اور ۲۳ شعبان ۳۶۲ھ (۲۹ مئی ۹۷۳ء) کو اسکندریہ پہونچا۔ قاضی مصر ابو طاہر الذہلی اور اعیان مصر نے استقبال کیا۔ جوہر نے زمین ادب کو بوسہ دیا۔

المعز جب قصر خلافت میں آیا تو سجدے میں گر پڑا۔ دو رکعت نماز پڑھی۔ جو لوگ اس کے ساتھ آئے تھے۔ انہوں نے بھی نماز میں شرکت کی۔ اور اس طرح مصر فاطمیوں کا دارالخلافہ

بن گیا جس کی حیثیت اب تک صرف دارالامارۃ ہی کی تھی ۳۶۸ھ

اب عالم اسلام میں بہ یک وقت تین خلافتیں قائم تھیں:

① ——— مصر میں خلافت بنی فاطمہ

② ——— اندلس میں خلافت امویہ

③ ——— بغداد میں خلافت عباسیہ۔

ڈھائی سال کے بعد المعز کا انتقال ہوگیا۔ اب اس کا بیٹا العزیز باللہ مسند آرائے خلافت ہوا ۳۶۵ھ۔ اس کے عہد میں حدود مملکت کے اندر اور زیادہ توسیع ہوئی۔

العزیز باللہ بھی اپنے والد کی طرح مسیحیوں کے ساتھ حد درجہ رواداری کا برتاؤ کرتا تھا۔ فسطاط سے باہر ان کے لیے اس نے کنیسہ " ابی سیفین " کی از سر نو مرمت کرا دی۔ اس کے وزیروں میں یعقوب بن کلس بھی تھا جو یہودی تھا۔ مگر مسلمان ہوگیا تھا۔ دوسرا عیسیٰ ابن نسطورس تھا۔ جو عیسائی تھا۔

اس نے اپنے عہد میں کئی نئی چیزیں رائج کیں۔ ہر جمعہ کو اس کی سواری شان و شکوہ سے جامع مسجد کو جاتی تھی۔ یہ خود نماز پڑھاتا تھا۔

اس نے مصر کی فوج میں ممالیک ترکوں کو بھی بھرتی کیا۔

① ——— نظم و استحکام کی طرف بہت زیادہ توجہ کی

② ——— رشوت کا سدباب اور استیصال کیا۔

③ ——— عمارتوں کی تعمیر پہ بے دریغ روپیہ صرف کیا۔

④ ——— بڑے بڑے پل بنائے۔

⑤ ——— جہازوں کا بیڑا تیار کیا۔

اس کے حدود مملکت، بحر اٹلانٹک سے لے کر مشرقی حجاز تک وسیع ہو گئے۔ بلاد عرب سے لے کر بحر اطلس تک مساجد کے منابر پہ اس کے نام کا خطبہ پڑھا جانے لگا۔

اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا حاکم بامراللہ خلیفہ ہوا۔ اس کی عمر صرف گیارہ سال کی تھی۔ اس کی ماں مسیحیہ تھی۔

یہ خلیفہ اپنے افکار و آراء اور تصورات میں یکسر آزاد تھا اور مزاج و طبیعت کے اعتبار سے عجیب و غریب اوصاف کا حامل تھا۔ جب عتاب کرتا تو لرزہ خیز سزا دیتا۔ جب خوش ہوتا تو اتنا دیتا کہ کسی خلیفہ نے نہ دیا ہوگا۔ اس کے افعال و اعمال میں عجیب طرح کا تناقض تھا۔ آج جو کچھ کرتا۔ کل بالکل اس کے برعکس کرنے لگتا۔

اس کے اعمال حسنہ کی فہرست بھی مختصر نہیں اس نے :-

- :——— وسیع اور بڑے پیمانہ پر دارالحکمت قائم کیا۔
- :——— جبل مقطم کے دامن میں شاندار رصدگاہ قائم کی۔
- :——— علم و فن کی طرف زیادہ توجہ کی

خلیفہ آمر فاطمی جب قتل ہوگیا۔ تو اس کا بیٹا الظاہر منصب خلافت پر فائز ہوا۔ یہ صغیر سن تھا۔ صرف چھ سال کی عمر تھی۔ ابھی اس میں یہ خصوصیت نہیں تھی کہ باپ کے ادھورے کاموں کی تکمیل کر سکتا تھا۔ اس کی پھوپھی "ست الملک" نے اس کی تربیت اور ھدایت کے فرائض اپنے ذمے لیے۔ وہ نہایت خوبی کے ساتھ چار سال تک اپنے فرائض انجام دیتی رہی۔ فوج کو بھی اس نے مال و دولت دے کر خوش رکھا۔ ۴۱۵ھ میں اس کا انتقال ہوگیا۔

ظاہر کے زمانے میں نیل کی زرخیز طغیانی قریب قریب ختم ہوگئی۔ بلاد سلطنت میں نہایت ہولناک قحط پڑا۔

اس کے زمانہ میں شام بھی آماجگاہ فتن بنا جس کے فرو کرنے میں بے اندازہ دولت صرف کرنا پڑی۔

ظاہر کے بعد اس کا بیٹا مستنصر مسند نشین خلافت ہوا۔ اس کی عمر صرف سات سال کی تھی۔ اس نے ساٹھ سال تک خلافت کی۔ اس کے طویل عہد حکومت میں عبید یین (فاطمیوں) نے غیر معمولی عروج و فروغ حاصل کیا۔ ساتھ ہی ساتھ یہ عہد شورش اور فتن کا

عہد بھی تھا۔ امن و سکون کا زمانہ بہت مختصر رہا۔ اس مختصر دور کے ختم ہونے کے بعد مصائب کا نزول شروع ہوا۔ جس نے مرکزِ خلافت کو ہلا کر رکھ دیا۔

مستنصر ہی کے عہد میں ولایاتِ شمالی افریقہ سے فاطمی محروم ہوئے۔ وہاں پھر سنیوں کا عمل دخل شروع ہو گیا۔

ولایات سوریہ (شام) سے بھی فاطمیوں کو ہاتھ دھونا پڑے۔ ۴۶۹ھ - (۱۰۷۶ء) میں سلجوقی ترکوں نے اس پر قبضہ کر لیا۔

مستنصر کا خطبہ بغداد میں بھی کچھ عرصہ تک جاری رہا۔ جب عباسی خلیفہ نے راہِ فرار اختیار کر لی تھی، بغداد، واسط، کوفہ اور حلّہ بلادِ شرقیۂ کبریٰ پر فاطمی علم لہرانے لگا تھا۔ بساسیری کی فتح مندیوں نے یہ معجزہ کر دکھایا تھا۔ اس نے خلیفہ مستنصر کے لیے باقاعدہ دعوت شروع کر دی تھی۔ عباسی خلیفہ القائم بامر اللہ کے ملبوسات، اس کا عمامہ اور دوسری چیزیں ۴۵۰ھ (۱۰۵۸ء) میں مصر بھیجی گئیں۔ اور بغداد میں فاطمی خلیفہ کا خطبہ رائج ہو گیا

مستنصر کو اس بات سے بڑی خوشی ہوئی۔ سارے مصر میں جشن منایا گیا۔ اور چراغاں کیا گیا اسی مناسبت سے طبار "مستنصر" نے بڑے اچھے اچھے گیت کر سنائے۔ یہ گیت طبل پر گائے جاتے تھے۔

والی اہواز نے مستنصر کا خطبہ رائج کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ سلطان طغرل بک ترکمان سے امداد کا طالب ہوا۔ اس نے فوجی مدد دینے میں کوئی کوتاہی نہیں کی لیکن مستنصر بساسیری کو مدد نہ پہنچا سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پورے ایک سال کے انقطاع کے بعد بغداد میں بنو عباس کا خطبہ پھر سے رائج ہو گیا۔

بہر حال مشرق میں یہ خلافت فاطمیہ کی کامیابی کی انتہا تھی۔ مکہ میں ——— فاطمیوں نے سیاہ [1] غلاف کعبہ اتار لیا۔ اور اس کے بجائے سفید رنگ [2] کا پردہ چڑھا دیا۔ جس پر خلیفہ مستنصر کا نام اور لقب لکھا ہوا تھا [3]۔

اس کے بعد مصر میں دولتِ فاطمیہ اضمحلال سے دوچار ہوئی۔

مستنصر ہی کے زمانے میں فاطمی حکومت کو صقلیہ سے ہاتھ دھونا پڑے۔

اس کے بعد حکومت دراصل وزراء کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ خلیفہ کے انتخاب و تعیین کا اختیار بھی انہیں حاصل ہوگیا۔ وہ اپنی پسند کے کسی آدمی کو مسند خلافت پر بٹھا دیتے۔ دراصل اب حاکم اور فرماں روا یہی تھے۔ جن القاب سے یہ پکارے جاتے تھے وہ بھی بادشاہوں کے سے تھے۔

خلیفہ مستعلی باللہ فاطمی کے زمانہ میں شام اور سوریہ کے اکثر شہروں میں دعوت فاطمی کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔

خلیفہ ظافر بامر اللہ کے دورِ حکومت میں عیسائیوں نے عسقلان کو فلسطین میں شامل کرلیا۔ اور بادشاہ صقلیہ (سسلی) نارمنڈی نے تینس میں لوٹ مار مچادی۔

خلیفہ العاضد لدین اللہ کے زمانہ میں جب فرنگیوں نے سر پر لٹکتی ہوئی تلوار کی صورت اختیار کرلی تو اس نے ملک عادل سلطان نورالدین زنگی فرمانروائے دمشق سے امداد طلب کی اور استدعا کی کہ جلد از جلد مدد بھیجی جائے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ فرنگی مصر پر قبضہ کرلیں۔

اسدالدین شیرکوہ اور اس کے بھتیجے صلاح الدین ایوبی کی قیادت میں سلطان نورالدین زنگی نے ایک لشکر گراں مدد کے لیے بھیجا۔

اسدالدین شیرکوہ کے بعد خلیفہ عاضد فاطمی نے منصب وزارت صلاح الدین ایوبی کو سونپ دیا اور سے "الملک الناصر" کا لقب عطا فرمایا۔

صلاح الدین نے اس اقتدار و اختیار سے خوب خوب فائدہ اٹھایا۔ اور اپنے آپ کو بہت زیادہ مضبوط و مستحکم ہر اعتبار سے کرلیا۔ پھر عاضد باللہ ۵۶۷ھ کی بیماری نے اسے ایک زریں موقعہ عطا کیا۔ اس نے نورالدین زنگی کے حسب ایما خلیفہ مستضی عباسی کے نام کا خطبہ محرم ۵۶۷ھ (۱۱۷۱م) سے شروع کردیا۔ اور عاضد کا نام خطبہ سے نکال دیا۔ اور سارے مصر میں یہ حکم گشت کرادیا۔ چنانچہ یمن، شام اور حجاز اور مغرب غرض ہر جگہ عباسیوں کا خطبہ شروع ہوگیا۔

صلاح الدین نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ کہ عاضد کا نام خطبہ سے نکال دیا ہو۔ اور مستضی کا خطبہ جاری کردیا ہو بلکہ دولتِ فاطمیہ کا شعار ——— سفید رنگ ———

بھی ختم کردیا۔ اور اس کی جگہ عباسی شعار ——— سیاہ رنگ ——— جاری کردیا۔

:——— علاوہ ازیں اذان سے " حی علی خیر العمل " بھی نکال دیا۔

:——— جو شیعہ قاضی تھے۔ انہیں برخاست کردیا۔ ان کی جگہ سنی قاضی مقرر کردیئے۔

:——— صلاح الدین چونکہ خود شافعی تھا۔ لہٰذا اس نے بڑی تعداد میں شافعی مدرسے قائم کردیے [۳۴]

اور یہ سارے کام صلاح الدین نے بغیر کسی روک ٹوک اور مقاومت و مزاحمت کے انجام دے ڈالے۔

ڈاکٹر عطیہ نے لکھا ہے :۔

" پھر عاشورا کے دن جو شیعوں کا یوم حزن و عزا حسین بن علی کے لیے ہوتا ہے کیونکہ اسی دن وہ شہید ہوئے تھے، صلاح الدین نے دولت ایوبیہ کے قیام کا اعلان کر دیا۔ اور یوم عاشورا کو یوم سرور و نشاط بنالیا۔ اس روز جشن منایا گیا۔ تاکہ شیعوں کو چڑایا اور چھیڑا جائے [۳۵]"

ہمارے خیال میں عاشوراء کے دن " دولت ایوبیہ " کے قیام کا اعلان ایک اتفاق تھا۔ اسے اس بات پر محمول کرنا کہ اس طرح اس نے یوم غم کا استخفاف کیا، درست نہیں کیونکہ وہ کٹر شافعی تھا۔ شوافع کا جو مسلک امام حسینؑ کے اجلال و احترام سے متعلق ہے وہ ظاہر ہے۔ خود امام شافعیؒ فرماتے ہیں۔

لو کان رفضا حب آل محمد

فلیشهد الثقلان انی رافض

" یعنی اگر حب آل محمدؐ کا نام رفض ہے تو فرشتوں کو چاہیے کہ میرے رافضی ہونے کی گواہی دیں "۔

البتہ یہ بات قرین عقل ہے کہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر صلاح الدین کے عہد زیادہ ل سپاہیوں اور حامیوں نے کچھ ایسی حرکتیں کی ہوں جو فاطمی خلافت کے نوحہ خوانوں کو ناگوار

گوری ہوں۔ اس کے علاوہ مذکورہ اقتباس میں "پچڑانے" کا جو ذکر آیا ہے۔ وہ بھی ایک
حدتک قرین قیاس ہو سکتا ہے کہ ایسے مواقع پر ایسا ہونا مستبعد نہیں۔

جو کچھ ہونا تھا، ہوگیا؛
فاطمی خلافت ختم ہوگئی
ایوبی حکومت پردۂ وجود پر نمودار ہوگئی۔ اور یہ ازل سے ہوتا آیا ہے۔

دریں حدیقہ بہار و خزاں ہم آغوش است
زمانہ جام بدست و جنازہ بردوش است

بہرحال عاضد بستر مرگ پر دراز تھا۔ اس کے اعزا نے ان انقلابات کی اسے
خبر نہیں ہونے دی چھپائے رکھا اور اسی شب عاشورا کو (محرم ۵۶۷ھ مطابق ۱۱۷۱ء)
جب کہ ابھی اس نے زندگی کی صرف ۲۱ بہاریں دیکھی تھیں عین عالم شباب میں اس
دنیائے فانی سے رخصت ہوگیا۔ مسند آرائے خلافت ہوتے اسے صرف ساڑھے بارہ
سال گزرے تھے۔

صلاح الدین نے اس کے جنازے میں شرکت کی۔ اس کے غسل اور تکفین کا انتظام
کیا۔ تعزیت بھی کی۔ اس کے بعد قصر خلافت پر قابض اور متصرف ہوگیا۔ قصر میں اموال
ذخائر، جواہر، لونڈی، غلام، اور سازو سامان کی صورت میں جو کچھ تھا اپنی تحویل اور قبضے میں
لے لیا۔

خلیفۂ عباسی نے صلاح الدین کو مصر کا فرماں روا تسلیم کر لیا۔ بغداد سے اس کے پاس
خلعت فاخرہ پہنچا۔ اس طرح خلیفہ مستضئی عباسی کو صلاح الدین کی بدولت خلافت مل گئی۔ اور
صلاح الدین ایوبی نے مصر میں بغیر کسی مزاحمت اور مقاومت کے بہ آسانی "دولت ایوبیہ"
قائم کر لی تھی۔ اور بہت جلد دولت ایوبیہ کے مقبوضات میں وہ تمام بلاد و امصار شامل ہوگئے
جو زنگی خاندان کے ممالک محروسہ میں شمار ہوتے تھے لیکن یہ ایک جداگانہ داستان ہے۔ جس
کی تفصیل ہمارے موضوع گفتگو کے دائرے سے باہر ہے۔ ہمارا موضوع

گفت گو دولت ایوبیہ نہیں دولت فاطمیہ ہے۔

مآخذ

۱ النویری، "نہایۃ الارب" ج ۲۳، ص ۶۵، ۶۶،

۲ المقریزی، الخطط (مطبع الملیہ، ج ۲ ص ۲۳۰، ۲۳۲۔
مقریزی نے دعوات تسع کی پوری تفصیل بھی دی ہے۔ جن پر بعد میں ہم گفتگو کریں گے۔

۳ القلقشندی: صبح الاعشیٰ ج ۱۰ ص ۴۳۴، مابعد

۴ البغدادی: الفرق بین الفرق ص ۲۷، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۹۰۔

۵ الغزالی: فضائح الباطنیہ ص ۱۳۔

۶ القاضی النعمان: المجالس والمسایرات ج ۱ ص ۱۲۔

۷ احمد امین بک: ظہر الاسلام ص ۱۹۰۔
نیز ملاحظہ ہو:
O, Lary, A short History of the Fatimid-Khalifate. P. 139.

۸ O Leary, A short History of the Fatimid Khalifate. P. 140.

۹ القاضی النعمان: اساس التاویل الباطن" ——— مخطوطہ اسکول آف اورنٹیل اسٹڈیز لندن نمبر ۲۵۷۴۳۔ ورق ۴ (تنظیم الحکم بمصر فی عصر الفاطمیین ص ۳)

۱۰ اسے ابن السوداء بھی کہتے ہیں۔ یہ صنعا کا ایک یہودی تھا۔ ۲۰ھ (۶۴۹ء) میں اس نے اسلام قبول کر لیا۔ جب حضرت عثمانؓ مسند آرائے خلافت تھے۔

۱۱ لیکن ڈاکٹر طہ حسین نے بڑے تحقیقی انداز میں اپنی مایہ ناز کتاب "الفتنۃ الکبریٰ" میں سرے سے ابن سبا کے وجود ہی سے انکار کیا ہے۔ اور بڑے وزنی دلائل اپنی تائید میں دیے ہیں۔ لہذا اعتقادِ رجعت کی بنیاد کہیں اور تلاش کرنا پڑے گی۔ (رئیس احمد جعفری)

۱ے اس حدیث کی تخریج قاضی نعمان نے "شرح الاخبار" میں کی ہے ۔ج ۱۴ ۔ ورق ۰ ۷ ۔ لیکن اس حدیث کو نہ بخاری نے روایت کیا ہے نہ مسلم نے البتہ امام احمد اور ابو داؤد نے اس کی تخریج کی ہے (الجامع الصغیر ۔ طبع حلبی ج ۲ ، ص ۱۱۲ ۔)

اس کی وجہ سے ملت اسلامیہ میں کئی ایسے داعی پیدا ہوئے جنہوں نے اپنے آپ کو مہدی منتظر قرار دیا ۔

۲ے یعنی روح انسانی کا حلول حیوان میں ، یہ فکر ماخوذ ہے ہندوستان کے برہمنوں ، ایران کے مجوسیوں اور فلاسفۂ یونان وغیرہ سے چنانچہ فیثاغورث یونانی اور اس کے بعد افلاطون نے اس نظریے کی تبلیغ کی ، اسماعیلیہ میں اس نظریہ کو جن لوگوں نے مقبول عام بنایا ان میں راشد بن سنان پیش پیش ہے ۔ یہ شام میں دعوت اسماعیلیہ کا سربراہ تھا ۔ اس نے دعویٰ کیا کہ حسن ثانی کی روح حمام (کبوتروں) میں حلول کر گئی ۔

دروزیوں اور نصیریوں کا اعتقاد ہے کہ روح اشرار کتوں اور سوروں اور ایسے ہی دوسرے ناپاک جانوروں میں حلول کر جاتی ہے ۔

ملاحظہ ہو دائرۃ المعارف الاسلامیہ ج ۵ ، طبع ۱۹۴۱ — ۱۹۴۲ ، ص ۸۶ ۔

نیز تاریخ جبل لبنان (قلمی) ورق ۶۰ ، ۶۱ ۔ نیز

Hitti, The origins of Druzes people P. 44

(نظم الحکم بمصر فی عصر الفاطمیین ص ۳۱ ۔)

۳ے حلول کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ کا جسم انسانی میں حلول کرنا ۔ یہ فکر بھی ایران اور ہند کے داعیان مذاہب سے ماخوذ ہے ۔

اہل فارس اپنے بادشاہوں کی تقدیس کے قائل تھے ۔ اسی طرح فاطمی بھی اپنے ائمہ اور کبار دعاۃ کی تقدیس کے قائل ہیں ، اور خود ہند میں جو نزاری جماعت موجود ہے اس میں اس تقدیس کے آثار اب تک باقی ہیں ، جو "خوجہ" کہلاتے ہیں ۔ "خوجہ" کے معنی ہیں عابد اور مستجیب شریف ، ان کے سربراہ آغا خان ہیں ۔ ان کے پیرو آغاخانی اسی نسبت سے کہلاتے ہیں اور اپنے امام کی تقدیس کے قائل ہیں

(نظم الحکم بمصر فی عصر الفاطمیین ص ۳۱)

ھ۱۵ ابن سبا جس نے غالی شیعوں کے عقاید وضع کیے ہیں۔ کہتا ہے:۔
"مجھے ان لوگوں پر تعجب ہے جو رجعت عیسیٰؑ کے تو قائل ہیں۔ مگر رجعت محمدؐ کو نہیں ملتے۔ حالانکہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:۔

ان الذی فرض علیک القرآن لرادک الی معاد۔

یعنی، جس خدانے آپؐ پر قرآن کو فرض کیا ہے۔ وہ آپؐ کو اصلی جگہ (مکہ) پھر پہنچا دیگا۔"

اسی طرح شیعوں کا قول ہے کہ قیامت اس وقت تک نہیں آئے گی۔ جب تک مہدی خروج نہ کرے۔ وہ ساری دنیا کو جو ظلم و جور سے بھری ہوئی ہے۔ عدل سے بھر دے گا۔ وہ مُردوں کو زندہ کروے گا۔ جو دنیا میں پھر سے واپس آجائیں گے۔ ساری دنیا کو امت واحدہ میں تبدیل کردیگا۔

اسی طرح کیسانیہ کا عقیدہ ہے کہ محمد بن حنفیہ زندہ ہیں۔ ان پر موت نہیں طاری ہوئی۔ وہی مہدی منتظر ہیں۔

اسی طرح دروزیوں کا، جو ابو محمد الدرزی کے اتباع ہیں، یہ عقیدہ ہے کہ خلیفہ حاکم بامراللہ فاطمی زندہ ہے۔ اور بہت جلد واپس آئے گا۔

ملاحظہ ہو:۔

بغدادی: الفرق بین الفرق ص ۱۵-۱۷- نیز
الشہرستانی: الملل والنحل ج ۱ ص ۱۹۶ — علاوہ ازیں
قلقشندی: صبح الاعشیٰ ج ۳ ص ۳۴۰ - ج ۱۳- ص ۱۴۸- اور
Muir, The Caliphate p 564

ھ۱۶ ابن منجب ص ۹۳
نیز علامہ محمد الحسین آل کاشف الغطار کی کتاب۔
"اصل الشیعہ واصولہا" ص ۴۴، ۴۸، ۵۰۔

ھ۱۸ المقریزی: اتعاظ الحنفا ص ۱۱

ھ۱۹ نظم الحکم بمصر فی عصر الفاطمیین ص ۳۳۔

ھ۲۰ یہ شدت حاکم بامراللہ کے زمانہ میں اور بڑھ گئی تھی۔ ملاحظہ ہو:۔

ابن الاثیر : ج ۹ ص ۱۱۰۔
نیز۔ ابوالمحاسن : النجوم الزاہرہ ج ۴ ص ۱۷۷ — علاوہ ازیں
السیوطی : حسن المحاضرہ ج ۲ ص ۱۳، ۱۵۱ مزید برآں
النویری : نہایت الادب ج ۲۶ ورق ۷۷ نیز ملاحظہ ہو۔
Lane-Pool, A History of Egypt in the Middle Age P. 126

۲۱ ابوالمحاسن :

۲۱ ابوالمحاسن : النجوم الزاہرہ ج ۴ ص ۱۹۴۔
نیز السیوطی : حسن المحاضرہ ج ۲ ص ۲۳
علاوہ ازیں النویری : ج ۲۶ ورق : ۸۷ھ
اور العینی : ج ۹ حصہ ۴ ورق ۸۴ ۹

۲۲ بدائع الزہور : ج ۱ ص ۵۲۔
نیز خلیفہ ظاہر لاعزاز دین اللہ کے بارے میں مروی ہے کہ اس نے بہت سی کنیزوں کو جن کی تعداد کئی ہزار تھی ، جمع کیا۔ اور دروازے بند کر دیئے ، ڈاٹ لگا دی۔ یہاں تک کہ وہ دم گھٹ کر مر گئیں۔ پھر آگ لگا کر نام و نشان مٹا دیا۔ (السیوطی ۔ حسن المحاضرہ ج ۲ ص ۱۵۴)
لیکن تاریخ میں السیوطی کا پایہ اتنا ارفع نہیں ہے کہ ان کی یہ سنسنی خیز روایت بے چون و چرا ، دوسری مستند اور بلند پایہ تاریخوں کی تائید و توثیق کے بغیر قبول کر لی جائے ۔ لہٰذا اسے صرف افواہ قرار دیا جا سکتا ہے ۔

۲۳ المقریزی : الخطط ج ۲ ص ۲۸۹
نیز ابن ایاس : بدائع الزہور ج ۱ - ص ۵۲
علاوہ ازیں Lane-Pool, A History of Egypt in the M. A P. 126

۲۴ النویری : نہایت الارب ج ۲۶ ورق ۳۷
۲۵ ایک طرح کا نشہ آور مشروب۔

۲۶ ابن عذاری المراکشی : البیان المغرب فی اخبار المغرب ص ۲۳۱
نیز النویری: ورق ۵۲

۲۷ المقریزی: الخطط ج ۲ ص ۱۶۸۔
نیز ابن طاہر: اخبار الدول المنقطعہ ورق ۵۴۔

۲۸ عباسی خلفا میں سب سے پہلے جس نے منجموں کو مقرب بارگاہ بنایا اور ان کے احکام پر عمل کیا۔ ابو جعفر
منصور (۱۳۶ھ – ۱۵۸ھ = ۷۵۴ء – ۷۷۵ء) تھا۔ اسی طرح ابن عباسی (۱۹۳ – ۱۹۸ھ =
۸۰۹ – ۸۱۳ء) احکام نجوم پر عمل کرتا تھا۔ (المقریزی: السلوک ج ۱ ص ۱۵، ۱۶)

۲۹ خلیفہ المعز لدین اللہ علم نجوم سے بڑی دلچسپی رکھتا تھا۔ (اتعاظ الحنفاء ص ۴۳، ۴۷)

۳۰ المقریزی ج ۲۶ ورق ۵۸

۳۱ حافظ کے دربار میں سات منجم تھے جن میں ایک ابو موسیٰ نصرانی بھی تھا۔
(ابن میسر: تاریخ مصر ج ۲ ص ۱۹)

۳۲ المقریزی: : الخطط ج ۲ ص ۲۵

۳۳ الذہبی: "تاریخ الاسلام ج ۳ ص ۲۰۶ (قلمی)
نیز تاریخ لبنان (قلمی) ورق ۳۲- ۳۳-
علاوہ ازیں ابن طاہر- اخبار الدول المنقطعہ ورق ۵۰

۳۴ القاضی النعمان: "المجالس والمسائرات" ج ص ۱۲۵۔

۳۵ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ دروزی فرقہ بھی جو اسماعیلیوں کی شاخ در شاخ ہے مساوات مرد و زن کا قائل
ہے (نظم الحکم بمصر فی عہد الفاطمیین ص ۳۹)

۳۶ ان رصد گاہوں میں آلاتِ رصد بھیجا جاتا تھا۔ حکومت اس کے مصارف برداشت کرتی تھی

۳۷ حمدان بن قرمط کے متعلق بھی مشہور ہے کہ وہ نجوم ہی کرتا تھا۔

۳۸ اس طرح گویا اسماعیلیہ اور شعوبیہ (جو عجم کو عرب پر ترجیح دیتے تھے) انتہاپسندی کی آخری حد پر
کھڑے نظر آتے ہیں۔
شعوبیہ عصبیت قومی کے علمبردار تھے، اس کے برعکس اسماعیلی "لاقومیت" یعنی ———

Internationalism کے علمبردار تھے۔

۳۹ القلقشندی: صبح الاعشیٰ، ج ۳ ص ۴۹۷

نیز المقریزی: اتعاظ الحنفاء ص ۱۰۴، ۱۰۵۔

علاوہ ازیں نہایۃ الارب ج ۲۳ ص ۲۰۵

۴۰ علویین میں سے شمالی افریقہ میں سب سے پہلے ادارسہ (ادریسیوں) نے ۱۶۹ھ (۷۸۵ء) میں حکومت قائم کی۔

۴۱ چنانچہ یہ صدق دل سے عباسی حکومت کے مطیع نہیں تھے۔

۴۲ ان دونوں کو مغرب میں امام جعفرؑ بن صادقؑ بن محمد الباقرؑ بن علیؑ زین العابدینؑ بن الحسینؑ بن علیؑ بن ابی طالب (۸۳ - ۱۴۸ھ) نے بھیجا تھا۔ امام جعفرؑ کی والدہ ام فروہ بنت قاسم بن ابی بکر الصدیق تھیں۔

النویری: نہایت الارب: ج ۲۶ ورق ۲۴۔

اور ابن خلدون: العبر ج ۴ ص ۳۱

علاوہ بریں المقریزی: اتعاظ الحنفا ص ۲۱

۴۳ مغرب میں ان دونوں کو محمد المعروف بہ ابو الشلعلع اور الشیعی یعنی عبد اللہ الحسین بن احمد بن محمد بن زکریا نے بھیجا تھا۔ یہ شخص صنعا یمن اور ایک قول کے مطابق مکہ میں پیدا ہوا تھا۔ عراق کے ایک شہر میں محتسب تھا۔ مکہ میں حجاج بربر سے اس کا تعارف ہوا۔ وہ لوگ اسے اپنے ساتھ افریقہ لے گئے۔ وہاں اس نے خاصی شہرت حاصل کرلی۔ یہ دیکھ کر امیر ابراہیم بن احمد فرماں روائے افریقہ نے اس کے پاس اپنے ایک ایلچی کی معرفت، جس کا نام ابن المعتصم تھا، ایک نرم گرم خط بھیجا اور حکم دیا کہ وہ دعوت فاطمیہ سے باز آجائے۔ لیکن اس نے حماست اور شجاعت سے کام لیتے ہوئے اس حکم کو ماننے سے انکار کردیا۔ اور کہا۔

"کہدینا تم اپنے رجالِ مملکت اور انصارِ دولت سے، مجھے
ڈرتے ہو یہی [illegible]
جنہیں انصار باطل آشنا ذرا بھی ڈگمگا نہیں سکتے"

رقادہ اور قیروان میں جب الشیعی کے امور مستقر و محکم ہو گئے تو اس نے اپنے بھائی ابو العباس محمد بن احمد بن محمد کو اپنا قائم مقام بنا کر افریقیہ بھیجا۔ وہ رمضان ۲۹۶ھ (۹۰۹ء) میں رقادہ آیا۔ اس لیے کہ اسے معلوم ہو چکا تھا کہ عبید اللہ المہدی سلمیہ (شام کا ایک مقام) سے خلیفہ عباسی المعتضد کی سختی کے باعث راہ فرار اختیار کر کے مغرب آ چکا ہے۔ اور ایک سوداگر کے بھیس میں سجلماسہ آکر اترا ہے۔ جہاں اسے الیسع بن مدرار نے گرفتار کر لیا ہے۔ جو سجلماسہ کا والی تھا۔ وہ جان گیا تھا۔ یہی شخص ہے جس کی طرف الشیعی کی دعوت جاری ہے۔ چنانچہ اس نے اسے اور اس کے بیٹے القائم کو قید کر دیا۔

ابو العباس اور اس کے ساتھیوں نے ذی الحجہ ۲۹۶ھ (۹۰۸ء) میں ان باپ بیٹے کو غلبہ حاصل کر کے قید سے نجات دلائی اور لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا۔

"یہ ہے وہ تمہارا مولا!"

وہ شدت فرح سے رو رہا تھا۔ اس نے الیسع کی تلاش میں سوار دوڑائے۔ وہ گرفتار ہوا۔ اور قتل کیا گیا۔ اب المہدی نے امور اپنے ہاتھ میں بنفس نفیس لے لیے۔ بعد میں بعض شبہات کی بنا پر یہ دونوں بھائی رقادہ میں مہدی کے حکم سے قتل کر دیے گئے۔ یہ ۲۹۸ھ (۹۱۱ء) کا واقعہ ہے۔ یہ قتل بالکل ویسا ہی تھا۔ جیسا ابو جعفر منصور عباسی کے ہاتھوں ابو مسلم خراسانی کا۔

ملاحظہ ہو:۔

القاضی النعمان: کتاب افتتاح الدعوت ج ۲ ورق ۲۳-۲۵ نیز ج ۴ ورق ۲۷ تا ۴۵

ابن العذاری المراکشی: البیان المغرب فی اخبار المغرب ص ۱۵۱، ۱۶۳، ۱۶۴

ابن خلکان: وفیات الاعیان - ج ۲ ص ۴۸۸

النویری: نہایۃ الارب ج ۲۶ ورق ۲۴-۲۶، ۳۱، ۳۳، ۳۴، ۳۷

ابو الفدا: المختصر فی اخبار البشر ج ۲ ص ۶۵-۶۶ نیز ج ۳ ص ۵۰

ابن ظافر: اخبار الدول المنقطعہ ورق ۴، ۴۲

ابن خلدون: العبر ج ۰ ص ۳۶، ۳۷

المقریزی: اتعاظ الحنفاء ص ۱۳، ۱۴، ۱۹، ۳۴، ۳۸، ۴۱، ۴۴، ۴۵۔

ماخذ

المقریزی: الخطط۔ ج ۲ ص ۲۹۲، ۲۲۷، ۲۳۳ نیز ج ۳ ص ۱۵، ۱۸۔
العینی: عقد الجمان۔ حصہ دوم ج ۱۹ ورق ۲۹۷۔
Ameer Ali, A short History of the Saracens.
O, Leary, A short history of Fatimid Khalifate
Muir, The Califate, 565.
Ivanow, Ismaili, P. 33-34
The Ency Britanica Vol 9 P. 115.

۲۴ یہ قیروان سے ۴ میل کے فاصلہ پر ایک شہر ہے۔ یہ بنو اغلب کا مستقر تھا۔ لیکن ابو عبد اللہ الشیعی کے ہاتھوں زیادۃ اللہ اغلبی فرماں روا کو یہاں سے بھاگنا پڑا۔ ۲۹۷ھ میں المہدی نے اسے اپنا مرکز بنا لیا۔ پھر ۳۰۸ھ (۹۲۰ء) وہ مہدیہ منتقل ہوگیا۔
(البکری: کتاب المغرب فی ذکر بلاد افریقیہ والمغرب ص ۲۷)

۲۵ یہ رقادہ سے چار میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ بلاد مغرب کے بڑے شہروں میں اسکا شمار ہوتا ہے
البکری: کتاب المغرب فی ذکر بلاد افریقیہ والمغرب ص ۲۷)

۲۶ ۱۸۴ھ (۸۰۰ء) میں اغلبی فرماں روا ابراہیم بن الاغلب نے اسے بسایا تھا۔

۲۷ سجلماسہ۔ قیروان سے ۴۶ فرسخ کی دوری پر واقع ہے۔ ۱۴۰ھ (۷۰۷ء) میں اس کی بنا پڑی۔ تو مدرار نے اسے اپنا پایۂ تخت بنا لیا۔ (الیعقوبی: کتاب البلدان ص ۳۵۹)

۲۸ مہدیہ۔ مہدی کی طرف منسوب ہے۔ ۳۰۰ھ (۹۱۲ء) میں اس کی بنا پڑی۔ ۳۰۳ھ (۹۱۵ء) میں اس کی قلعہ بندی ہوئی۔ مہدیہ اور قیروان کے مابین ۶۰ میل کا فاصلہ ہے۔
ابن عذاری المراکشی: البیان المغرب ص ۲۱۵)

۲۹ جیساکہ ۳۰۱ھ (۹۱۳ء) میں ہوا تھا۔ (ابن ظاہر: اخبار الدول المنقطعہ ورق ۴۳)

۳۰ جیساکہ ۳۰۸ھ (۹۱۹ء) میں ہوا۔

ملاحظہ ہو:۔

النویری: نہایۃ الارب ج ۲۶ ورق ۱۵۔

المقریزی: اتعاظ الحنفاء ص ۳۴

المقریزی: الخطط ج ۲ ص ۱۶۳ -

۵۱ ابوالفداء: "کتاب المختصر فی اخبار البشر" ج ۲ ص ۹۸ : ۹۹ -

۵۲ حربی اور فوجی نقطۂ نگاہ سے بے شک فاطمیوں کو کامیابی نہیں ہوئی - اور وہ مصر پر قبضہ نہ کر سکے - لیکن دوسرے اعتبار سے انہیں غیر معمولی کامیابی ہوئی جیسے علویوں کی دعوت مصر کے گوشہ میں اسماعیلی داعیوں نے پہنچا دی - اور اس دعوت نے بہت جلد دلوں میں گھر کر لیا ملاحظہ ہو -

Lane-Pool. A History of Egypt in the Middle Ages P. 80, 99

Muir, The Caliphate - Its Rise & Decline & Fall from Original Sources P. 563.

O, Leary, A short History of the Fatimid Khalifate P 78,

۵۳ المقریزی: "اتعاظ الحنفاء" ص ۶۶ -

۵۴ بدست عبدالرحمٰن اول المتوفی ۱۷۲ھ (۷۸۸ء)

یہ حکومت اندلس میں ۱۳۸ھ سے ۸۹۷ھ (۷۵۶ - ۱۴۹۲ء) تک قائم رہی -

۵۵ از ۳۲۳ تا ۳۵۸ھ (۹۳۵ - ۹۶۹ء)

اس حکومت کا مؤسس محمد بن طغج الاخشید تھا -

۵۶ اس وقت حسب ذیل حکومتیں قائم تھیں :-

۱- بنو بویہ فارس میں حکمران تھے -

۲- سامانی ماوراء النہر میں -

۳- بنو حمدان جزیرہ اور شام میں نیز حلب اور موصل میں از ۳۱۷ تا ۳۹۴ھ (۹۲۹ ...

۴- عباسی خلیفہ کے پاس بغداد کے سوا کچھ نہیں رہ گیا تھا -

مسعودی نے ان لوگوں کو "اصحاب اطراف" یا "ملوک الطوائف" کے نام سے یاد کیا ہے۔
(مروج الذہب: ج ۱ ص ۷۳ ومابعد۔)

ملاحظہ ہو:۔

ابن الاثیر: الکامل، ج ۲ ص ۲۱۲۔

ابن خلکان: وفیات الاعیان، ج ۲ ص ۵۴۸

عینی، عقد الجمان، حصہ دوم، ج ۱۹، ورق ۲۹۹

السیوطی: حسن المحاضرہ، ج ۲، ص ۱۱

Lane-Poole, A History of Egypt in the Middle Ages P. 101

کافور کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو:۔

ابن خلکان: وفیات الاعیان، ج ۱ ص ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۸

المقریزی: نہایۃ الارب ج ۲۶، ورق ۱۹

المقریزی: الخطط، ج ۳ ص ۱۴۱، ۱۴۲۔

العینی: عقد الجمان، حصہ دوم ج ۱۹، ورق ۲۱۵۔

نیز دائرۃ المعارف الاسلامیہ، ج ۱ ص ۵۱۳، ۵۱۴۔

کافور کا انتقال ۳۵۷ھ (۹۶۸ء) میں ہوا۔

کافور کے لیے "حجر اسود" کا لقب طنز لطیف کی بہترین مثال ہے۔

المقریزی: اتعاظ الحنفا، ص ۷۷،

العینی: عقد الجمان، حصہ دوم، ج ۱۹، ص ۲۶۶

ابو المحاسن: النجوم الزاہرہ، ج ۴ ص ۷۲۔

العینی: عقد الجمان، حصہ دوم، ج ۱۹، ورق ۲۲۱

ابن خلکان: وفیات الاعیان ج ۱ ص ۲۱۰، ۲۱۱۔

ابوالمحاسن: النجوم الزاہرہ ج ۴ ص ۲۰

ابن ایاس: بدائع الزہور ج ۱ ص ۴۴

Ameer Ali, A short History of Saracens P. 599

۶۲ھ دولت کا اندازہ ۲۴ ملین دینار ہے
فوج کی تعداد ایک لاکھ سے متجاوز تھی۔ جو شجعان کتامہ (قبائل بربر) پر مشتمل تھی۔

ابن خلکان: وفیات الاعیان ج ۱ ص ۱۴۸

المقریزی: الخطط ج ۲ ص ۱۹۴، ۲۰۵۔

السیوطی: حسن المحاضرہ ج ۲ ص ۱۱۔

Lane-Poole, A story of Cairo, P. 11

O, Leary, A short History of the Fatimia Khalifate P 101,

۶۳ھ الدوادار: زبدۃ الفکر ج ۵۔ ورق ۱۰۴، ۱۰۵۔

۶۴ھ المقریزی: اتعاظ الحنفاء ص ۷۲، ۷۳۔

۶۵ھ ابن الاثیر: الکامل۔ ج ۸ ص ۹۴۔

۶۶ھ وہ کہتا ہے:۔

یقول بنوا العباس
ھل فتحت مصر
فقل لبنی العباس
قد مضی الامر

یعنی بنو عباس کہتے ہیں۔ کیا مصر فتح ہو گیا؟
بنی عباس سے کہہ دو، جو ہونا تھا۔ ہو گیا۔

ابوالمحاسن، النجوم الزاہرہ ج ۴ ص ۳۰

۶۷ھ جزیرہ صقلیہ (سسلی) بنی اغلب کے ماتحت تھا۔ لیکن ابو عبید اللہ المہدی فاطمی نے ۲۹۷ھ

میں اس پر قبضہ کرلیا۔ اور الحسن بن احمر کو اس کا والی بنادیا۔
اس جزیرہ پر اہل فرنگ نے ۴۸۴ھ (۱۰۹۱ء) میں قبضہ کرلیا۔ یہ جزیرہ اب اٹلی (اطالیہ) میں شامل ہے۔ (ابن منجب الاشارۃ الی ما نال الوزارۃ ص ۲۹)

۳۸ ابن الاثیر: الکامل، ج ۸ ص ۲۲۳۔

۳۹ The Ency of Islam Vol II P 89
عنوان "Fatimid"

۴۰ سیاہ رنگ عباسیوں کا شعار تھا۔

۴۱ سفید رنگ فاطمیوں کا شعار تھا۔

۴۲ المرحوم الاستاذ الابی: "الفاطمیون" ج ۱ ص ۷۱
نقلاً عن المقریزی "الخطط"۔

۴۳ لغت میں عاضد کے معنی ہیں "قاطع" جیسا کہ حدیث میں آیا ہے۔
لا یعضد شجرها
چنانچہ عاضد کے ساتھ ہی دولت فاطمیہ ختم ہوگئی۔
(السیوطی۔ حسن المحاضرہ ج ۲ ص ۱۷)

۴۴ شاہ صلاح الدین نے ۵۶۶ھ (۱۱۷۰ء) میں جیل کی عمارت جو "دار المعرفت" کے نام سے معروف تھی، منہدم کرادی۔ اور وہاں ایک مدرسہ شافعی قائم کر دیا۔
اسی طرح دار الغزل کو منہدم کرادیا۔ اور وہاں شافعی مدرسہ قائم کر دیا۔
(مختار پاشا۔ کتاب التوقیعات الالہامیہ۔ ص ۲۷۳)

۴۵ نظم الحکم بمصر فی عصر الفاطمیین۔ ص ۵۳

۴۶ ملاحظہ ہو:
ابوشامہ: کتاب الروضتین ج ۱ ص ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۵۴، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۶۰، ۲۰۰، ۲۰۱۔
ابن الاثیر: الکامل، ج ۱۱ ص ۱۴۸، ۱۵۰۔

ابن طاہر: اخبار الدول المنقطعہ، ورق ۱۹، ۹۱۔

ابوالفدا: المختصر فی اخبار البشر، ج ۱، ص ۴۷، ۴۸، نیز ج ۲ ص ۲۶۳، نیز ج ۳ ص ۴۵، ۵۱

الذہبی: تاریخ الاسلام، ج ۳، ورق ۴۲۹، ۴۳۰

المقریزی: الخطط، ج ۲ ص ۱۷۵، ۳۷۵

المقریزی: السلوک، ج ۱ ص ۴۱، ۴۲، ۴۴، ۴۶۔

العینی: عقد الجمان۔ حصہ دوم، ج ۱۹، ورق ۲۳۲

ابوالمحاسن: النجوم الزاہرہ، ج ۵ ص ۳۳۵، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۵۵، ۳۵۶،

السیوطی: حسن المحاضرہ، ج ۲ ص ۹۳۔

ابن ایاس: بدائع الزہور، ج ۱، ص ۷۰۔

ابن طباطبا، الفخری، ص ۱۹۳، ۱۹۵،

الامام شرقاوی: تحفۃ الناظرین، ورق ۳۲، ۳۳،

نیز ملاحظہ ہو:

Ameer Ali; A Short History of Saracens P. 611

Lane-Poole, Saladin and the fall of the Kingdom of Jerusalem. P 90, 91, 98, 100, 108, 109.

مذکورہ بالا نیز دوسرے حوالوں کی تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو نظم الحکم بمصر فی عصر الفاطمیین۔

اسمٰعیلی تحریک کے اسبابِ عروج

○

بحث و نزاع میں الجھے بغیر ہم اختصار لیکن جامعیت کے ساتھ فاطمیوں کے عقائد، مذہبی دعوت، مصطلحات اور اصولوں پر گفتگو کریں گے۔ ان پر نقد و تبصرہ مقصود نہیں، صرف معلومات بہم کا پیش کر دینا ہے۔ کسی فرقے یا جماعت کے عقائد، افکار، فلسفۂ عقائد اور اصولِ عقائد پر نقد و بحث، نزاع و اعتراض اور مناظرہ و مکابرہ۔ تاریخ سے ایک بالکل جداگانہ چیز ہے۔ جس سے ہم کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہتے۔ کچھ اس لیے کہ اس طرح ہم اپنے اصل موضوع اور دائرۂ بحث سے دور جا پڑیں گے، اور زیادہ تر اس لیے کہ افکار و عقاید کو جدل و بحث سے بدلا نہیں جا سکتا۔ کل حزب بما لدیھم فرحون۔ یہ وہ منزل ہے جہاں دلائل صرف کسی حد تک کام دیتے ہیں، ورنہ زیادہ تر وجدان اور داعیِ مذہب کی سیرت، کردار، شخصیت اور عمل سے ایک ایسا ماحول پیدا ہو جاتا ہے جو انسان کی فکری دنیا میں ایک انقلاب لے آتا ہے۔

شیعوں کا یہ ذیلی فرقہ جسے ہم اسمٰعیلیہ کے نام سے یاد کرتے ہیں جب عالمِ وجود میں آیا۔ تو اہل السنت والجماعت اور اہلِ تشیع کے بہت سے فرقے موجود تھے۔ بایں ہمہ یہ پھیلا پھولا اس نے مسندِ امامت سے تختِ حکومت تک رسائی حاصل کی اور اپنے زیرِ اقتدار

داختسیار میں عظیم اور یادگار کارنامے انجام دیئے۔

جو چیز یاد رکھنے کی ہوتی ہے وہ اچھی بات ہوتی ہے۔ جو چیز فراموش کر دینے کی ہوتی ہے وہ نزاعی اور اختلافی مسائل ہوتے ہیں۔ ہمیں اپنے اصول پسند ہیں۔ ہم ان پر عامل ہیں۔ اسمٰعیلی اپنے اصولوں کو برتر سمجھتے ہیں۔ وہ انہیں حرز جاں بنائے ہوئے ہیں۔ ہم انہیں نہیں بدل سکتے۔ دونوں اپنی اپنی جگہ اس وقت سے قائم ہیں۔ جب سے اسلام کی تاریخ شروع ہوتی ہے اور اس وقت تک قائم رہیں گے جب تک قیامت نہیں آجاتی۔

صدیوں کی اس طویل مدت میں مذہبی جدل و پیکار کا بازار ہمیشہ جاری رہا۔ لیکن اس سے افتراق باہمی کے سوا کوئی چیز حاصل نہ ہوسکی۔ اسلام کو ضعف پہنچا۔ مسلمانوں کی ہوا اکھڑی ہوئی اور بڑی بڑی مسلم حکومتیں جنہیں دنیا کی کوئی طاقت تسخیر نہیں کر سکتی تھی، جنگ باہمی کے باعث ہست سے نیست ہو گئیں۔

ہم ہر اس فرقے کو مسلمان سمجھتے ہیں، جو خدا کی یکتائی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبیین ہونے پر غیر مشروط اعتقاد رکھتا ہے۔ جو قرآن کو کتاب الٰہی مانتا اور سنت رسول کو اسوہ حسنہ قرار دیتا ہے۔ جو کلمۂ شہادت کا اقرار کرتا ہے اور کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتا ہے۔ اس کے بعد جتنے بھی اختلافات ہیں وہ نظری اور فکری بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں فروعی زیادہ اصولی کم ہیں۔ لہٰذا انہیں معیار کفر و اسلام نہیں قرار دیا جا سکتا۔ مذکورہ بالا شرائط پر جو فرقہ بھی پورا اترتا ہے وہ مسلمان ہے۔ لہٰذا اسمٰعیلیوں کا اسلام بھی شک و شبہے سے ماورا ہے جیسا کہ مصر کے فاضل جلیل استاذ ابوزہرہ نے اپنی کتاب امام جعفر الصادق مطبوعہ مصر میں وضاحت کے ساتھ اس کا اعتراف فرمایا ہے۔ اور انہیں ان فرقوں سے بالکل الگ قرار دیا ہے جو آراء منحرفہ کے حامل اور اسلام سے دور ہیں۔ [1]

اس جگہ یہ تصریح کر دینا ہم ضروری سمجھتے ہیں۔ کہ اسمٰعیلیوں سے مراد بوہرہ حضرات ہیں۔ جن کے داعی مطلق موجودہ زمانے میں ہز ہولی نس ملا طاہر سیف الدین ہیں۔ خوجہ یعنی آغا خانی حضرات بھی اگرچہ اسی فرقے کی ایک شاخ ہیں۔ لیکن وہ ہمارے موضوع سے خارج ہیں۔ اس لیے کہ ان کا سلسلہ درحقیقت اس وقت سے شروع ہوتا ہے۔ جب اسمٰعیلی حکومت دم توڑ

رہی تھی۔ اور حسن بن صباح اس کی تجدید و احیاء کے لیے دوسری سرزمین تلاش کر رہا تھا (بوہروں اور خوجوں کے عقاید میں بھی یکسانیت نہیں ہے) اور ہم صرف اس عہد کو زیر بحث لانا چاہتے ہیں۔ جب اسمٰعیلی برسر حکومت تھے۔ اور انہوں نے اپنے دور حکومت میں بڑے وقیع اور شاندار کارنامے انجام دیئے تھے۔ انہوں نے تمدن، تہذیب، معاشرت، علوم و فنون، تعمیرات، ہر گوشۂ حیات میں اپنے غیر فانی نقوش چھوڑے ہیں۔ اور یہ نقوش اتنے سخت جان ہیں کہ اب تک مٹ نہیں سکے۔ اگرچہ ——— صدیوں سے انہیں دور زمان مٹا رہا ہے۔

خلفائے فاطمیین اور ان کے فرقہ اسماعیلیہ کے عقاید اور اصول و مدارج دعوت پر ہمیں صرف اس حد تک گفتگو کرنی ہے کہ اس پس منظر میں ہم ان کی سرگرمیوں اور کارناموں کا جائزہ لے سکیں۔ بغیر اس کے ان کے اقدام و عمل کو صحیح طور پر سمجھنا ممکن نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اپنی دعوت کے اعتبار سے فکری طور پر اتنا منتظم، عقلی طور سے اتنا فلسفیانہ، نفسیاتی اعتبار سے اتنا اثر آفریں، اجتماعی لحاظ سے اتنا جامع ضروریات انسانی، انفرادی لحاظ سے اتنا محکم اور عملی نقطۂ نظر سے اپنے افراد جماعت پر اتنا حاوی اسلامی فرقوں میں اسماعیلی فرقے کے سوا کوئی فرقہ بھی نہیں ہے۔

یہ ایک مستقل فلسفہ ہے۔ یہ ایک مستقل فکر ہے۔ یہ ایک مستقل نظام ہے۔ یہ ایک مستقل دستور ہے۔ یہ ایک مستقل ضابطہ ہے اور یہ سب باہم ایک دوسرے سے اس درجہ مربوط ہیں۔ جیسے زنجیر کی کڑیاں۔ باہم پیوستہ ہوتی ہیں۔ اور ان میں سے اگر ایک بھی نکال لی جائے تو ساری زنجیر اپنی وحدت کھو دیتی ہے۔

اسماعیلیوں نے حکومت بھی کی۔ لیکن بُرے دن بھی دیکھے۔ ان کی حکومت کی مدت، ایام ابتلا کے مقابلے میں کم ہے۔ بہت کم ہے۔ اسلام کے بہت سے فرقے ابتلا عام کا مقابلہ نہ کر سکے اور فنا ہو گئے۔ آج معتزلی کہاں ہیں؟ مانزیدی کس شہر میں بستے ہیں؟ اشاعرہ کیا ہوئے؟ سب فنا کے گھاٹ اتر گئے۔ حالانکہ یہ سب ایک مخصوص فلسفے کے داعی

تھے۔ اور ان کا فلسفہ انقلاب آفریں بھی تھا۔ انہوں نے ایک نئی فکر کی بنیاد ڈالی۔ اور دفاع اسلام کے سلسلے میں لازوال کارنامے انجام بھی دیئے[2]

ان کے پاس تنظیم بھی تھی، قوت بھی، اقتدار اور سطوت بھی، بلکہ حکومت بھی۔ اور یہ حکومت ایک طویل عرصے تک ان کے ہاتھ میں رہی۔ مامون الرشید کے عہد حکومت سے حکومت ان کے ہاتھ میں آئی[3] اور پھر مدت مدید تک یہ اس طرح حکومت پر قابض رہے کہ جسے چاہا قتل کرا دیا۔ جسے چاہا حوالۂ زنداں کر دیا، جس سے خفا ہوئے۔ اس کی جاگیر و جائداد ضبط کر لی۔ جو ان کا معتوب ہوا کہیں کا نہ رہا۔ لیکن جب ابتلاء عام سے انہیں دوچار ہونا پڑا تو انہوں نے راہ فرار اختیار کی۔ ایک ملک سے دوسرے ملک میں پہنچے۔ مگر کہیں قدم نہ جم سکے۔ بالآخر دنیا سے رخصت ہو کر تاریخ میں اپنا ذکر چھوڑ گئے۔

یہی حال ماتریدیہ اور اشاعرہ اور دوسرے فرقوں کا ہوا ہے[4] جن کا وجود تاریخ کی زینت تو ہے لیکن عالم موجودات سے کوئی تعلق نہیں رکھتا[5]

لیکن کیا بات ہے کہ سخت ترین ابتلاء عمومی کے باوجود اسمٰعیلی زندہ رہے؟ آج بھی زندہ ہیں اور دنیا کے ہر گوشے میں موجود ہیں۔ ہندوستان و پاکستان ہو یا شام و عراق، لبنان و اردن ہو یا جبل دروز، مصر ہو یا لیبیا، سوڈان ہو یا ایران۔ شورائیہ روس ہو یا برطانوی دولت مشترکہ، افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں یا مغرب کی گل پوش وادیاں یہ ہر جگہ موجود ہیں، اور اپنی انفرادیت کے پورے تحفظ کے ساتھ موجود ہیں۔ آخر کیوں؟

دنیا میں "عقلیت" کا طوفان آیا ہر قوم اس میں ایک تنکے کی طرح بہنے لگی مسلمانوں کے کئی فرقے بھی اس گرداب بلا میں پھنسے اور ایسے پھنسے کہ نکلنا مشکل ہو گیا۔

دنیا میں بہت سے "ازم" نمودار ہوئے، سوشلزم، کمیونزم، نیشنل سوشلزم اور انہوں نے دنیا کی ایک بڑی آبادی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ عامۃ المسلمین کی ایک معقول تعداد بھی اس سیل بیکراں سے اپنے آپ کو محفوظ نہ رکھ سکی، لیکن اسماعیلی اپنی جگہ چٹان کی طرح جمے رہے۔ ٹس سے مس نہیں ہوئے ——— کیوں؟

دنیا میں بہت سی معاشی تحریکیں اٹھیں۔ بندۂ مزدور نے سر اٹھایا، کاشتکار اور

کسان اپنے کھیتوں سے باہر نکلے۔ آجر اور اجیر کے درمیان اختلاف پیدا ہوا۔ محنت اور سرمایہ، ایک دوسرے کے رقیب اور حریف بن کر میدانِ رزم میں اترے۔ لیکن اس شورش اور ہنگامے میں اسماعیلیوں کا نام کہیں نہیں آتا؟ ——— اس کی کوئی وجہ تو ہوگی؟

مذہب بیزاری، شعائرِ دین کا استخفاف، عملی طور پر مذہب کے احکام سے روگردانی کی وبا عام ہے۔ اور اس سے کوئی قوم اور فرقہ بھی محفوظ نہیں ہے۔ لیکن یہ چیز کم سے کم اگر کسی فرقے میں ہے تو وہ اسماعیلی ہیں ——— اس کا راز؟

اس کا راز اور سبب ایک اور صرف ایک ہے۔

وہ یہ کہ اسماعیلیوں کا نظام اتنا مربوط اور مضبوط۔ ان کا فلسفۂ افکار و عقاید اس درجہ محکم اور پائدار ہے کہ طوفانوں کی یورش اس پر بہت کم اثر انداز ہو سکتی ہے۔ یہ بات بھی نہیں ہے کہ اس فرقے کے لوگ، جاہل، ناخواندہ، بے علم اور بے بہرہ ہوں۔

اس فرقے کے لوگوں میں ہائی کورٹ کے جج بھی ہیں۔ وکیل اور بیرسٹر بھی، تاجر اور سرمایہ دار بھی، جہاں گرد اور اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی، سیاست دان اور امورِ مملکت کے رازداں بھی۔ لیکن اپنی تنظیم، اپنی جماعت اپنے افکار اور اپنے عقاید سے اس طرح وابستہ ہیں جیسے گل اور بوئے گل؛

درحقیقت یہ فرقہ اپنے افراد و جماعت کی عقل، دماغ، فکر اور عمل۔ ہر چیز پر حاوی ہے۔ گو اس کے ہاتھ میں حکومت نہیں ہے۔ نہ کسی کو یہ جیل بھیج سکتا ہے۔ نہ پھانسی دے سکتا ہے۔ نہ کسی کی جاگیر، جائیداد اور کاروبار ضبط کر سکتا ہے۔ لیکن اپنے نظام اور فلسفے کے بل پر اس نے سب کو اس طرح جکڑ رکھا ہے کہ کوئی اس کے دائرہ سے قدم باہر نہیں نکال سکتا۔ یہی راز ہے۔ اس کے زندہ رہنے کا اور یہی چیز ہے جو اسے زندہ رکھے گی۔

اس فرقے کے افکار و عقاید کا اگر تجزیہ کیا جائے اور بہ نظرِ غائر مطالعہ کیا جائے تو اس میں عمیق ترین فلسفہ کی کارفرمایاں نظر آئیں گی۔ اور امرِ واقعہ یہ ہے کہ یہی فلسفہ ہے جو اس کی بنیاد اور اساس کا کام دیتا ہے۔

آئندہ ابواب میں ہم اسماعیلیوں یا دوسرے الفاظ میں فاطمیوں کے مدارج دعوت، اصطلاحاتِ دعوت اور اصحابِ دعوت پر الگ الگ زیادہ سے زیادہ عام فہم انداز میں گفتگو کرنے کی کوشش کریں گے جس کی روشنی میں آئندہ ابواب کے مطالب کا فہم دشوار نہ رہ جائے گا!

◎

ماخذ

لہ امام جعفر صادقؒ (استاد ابوزہرہ) مطبوعہ مصر ص ۱۶۶

لہ "المعتزلہ" (زہدی حسن جار اللہ) مطبوعہ دار الفکر العربی، مصر ص ۱۴۴

لہ امام احمد بن حنبلؒ (استاد ابوزہرہ) مطبوعہ مصر ص ۲۳۲

لہ "المعتزلہ" (زہدی حسن جار اللہ) مطبوعہ دار الفکر العربی۔ مصر ص

لہ "مرآۃ الاسلام" (ڈاکٹر طٰہٰ حسین) ص ۱۴۱

لہ مذہب اسلامیہ (استاد ابوزہرہ) مطبوعہ مصر ص ۳۱۳

اسماعیلی فرقے کی ابتدا

ذیل میں پہلے چھ ائمہ شیعہ کی فہرست دی جاتی ہے۔ ساتویں امام سے اختلاف شروع ہوتا ہے۔ جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

پہلے چھ متفق علیہ امام یہ ہیں :۔

(۱) حضرت علیؓ ——— جو ۶۶۱ عیسوی میں ایک خارجی کے ہاتھوں شہید ہوئے

(۲) حضرت حسنؓ ——— جنہوں نے ۶۶۹ء میں وفات پائی۔

(۳) حضرت امام حسینؓ ——— جو ۶۸۰ء میں بمقام کربلا شہید ہوئے۔

(۴) امام علی زین العابدینؒ ——— ابن امام حسینؓ جنہوں نے گوشۂ اعتکاف میں زندگی بسر کی۔ اور ۷۱۲ء میں وفات پائی۔

(۵) امام محمد الباقر ——— جو مدینۂ منورہ میں قیام پذیر رہے اور ۷۴۱ء میں اس دنیا سے رخصت ہوئے۔

(۶) امام جعفر الصادق ——— جو دیارِ رسولؐ کے مکین تھے۔ اور ۷۶۵ء میں اپنے رب سے جاملے۔

امام جعفر صادق کے دو بیٹے تھے:
اسماعیل اور موسیٰ الکاظم،

اسماعیل کا انتقال اپنے والد امام جعفر صادق کی زندگی میں ہو گیا تھا۔ اس لیے انہوں نے موسیٰ کاظم کے لیے نص کی۔ بعض مؤرخین کہتے ہیں۔ انہوں نے اسماعیل کی زندگی میں ان سے خفا ہو کر موسیٰ کاظم کے لیے نص کی تھی۔ لیکن اسماعیلی اس دعوے کو تسلیم نہیں کرتے بہرحال یہیں سے شیعہ جماعت میں اختلاف پیدا ہوتا ہے۔ اثنا عشری امام موسیٰ کاظم کو ساتواں امام مانتے ہیں۔ جن کی ایران، جنوبی عراق اور دوسرے مقامات میں بہت بڑی تعداد آباد ہے [1] لیکن فرقہ باطنیہ یا سبعیہ حضرت اسماعیل کو ساتواں امام مانتا ہے۔ فاطمی امامت کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے۔

بعض اسماعیلی حضرت علیؓ کو "اساس" مانتے ہیں۔ لہٰذا امامت وہ حضرت حسنؓ سے شروع کرتے ہیں۔ اس طرح امام حسن پہلے اور حضرت اسماعیل ساتویں امام قرار پاتے ہیں۔ اور جو اصولی طور پر یہ حق رکھتے تھے کہ اپنے صاحبزادے محمد کے لیے بحیثیت آٹھویں امام کے نص کر جائیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور وہ اس اندیشہ سے کہ ہارون الرشید ان کا دشمن ہے [2] ایران کے مقام میں پوشیدہ طور پر جا کر۔ اور "محمد المکتوم" کے نام سے اقامت گزیں ہو گئے۔ جہاں خفیہ طور پر انہوں نے اسماعیلی تحریک اپنے داعیوں کے ذریعے شروع کی۔

محمد المکتوم کے زمانہ ستر سے لے کر خلافت فاطمی کے قیام تک کا جو زمانہ ہے۔ وہ "دورِ ستر" کہلاتا ہے [3]

ابن حزم نے مذکورہ سلسلہ ائمہ کی ترتیب و نسب پر اعتراض کیا ہے [4]۔ لیکن مقریزی نے بڑے تذبذب و لہجہ میں اس کی تردید کی ہے [5]

امامت کے تصور کی بنیاد و اساس یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیک وقت نبی بھی تھے، امام بھی، سالارِ عساکر بھی اور حاکم وقت بھی۔ آپؐ کے دہن مبارک سے نکلا

کا ہر لفظ فرمان اور قانون بھی تھا۔ کیونکہ آپ جو کچھ فرماتے تھے وہ من جانب اللہ ہوتا تھا
۔ آپ قاضی بھی تھے اور حاکم بھی۔

ایسی مستجمع الصفات ذاتِ گرامی کے جانشین کے لیے ناگزیر تھا کہ وہ پورے طور پر آپ کا صحبت یافتہ، مزاج شناس اور تربیت کردہ ہو۔ اسے آپ کے عزائم، مقاصد اور رجحان و میلان کا پورا پورا علم ہو۔ اور ایسی شخصیت ایک ہی تھی۔ وہ حضرت علیؓ ابن ابی طالب کی ذات ستودہ صفات تھی علیؓ، آپ کے برادر عم زاد تھے۔ آپ کے خویش تھے، آپ کے دو محبوب نواسوں ——— حسن اور حسین ——— کے والد تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ بچپن سے لے کر آخر وقت تک، ہر موقعہ اور مرحلے پر دل و جان سے آپ کے ساتھ شریک رہے تھے۔

لیکن آں حضرتؐ نے جب وفات پائی، تو علیؓ کا انتخاب خلیفہ کی حیثیت سے نہیں ہوا۔ باری باری سے تین خلفاء ——— ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ ——— منتخب ہوئے جو علیؓ سے عمر میں بھی بڑے تھے۔

حضرت عثمانؓ کے بعد جب حضرت علیؓ خلیفہ منتخب ہوئے تو ان کے خلاف شام میں ایک مستقل محاذ بن گیا۔ اور بالآخر ۶۶۱ء میں ایک خارجی ابن ملجم کے ہاتھوں انہوں نے جام شہادت نوش فرمایا۔

حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد امیر معاویہ نے تختِ خلافت حاصل کر لیا۔ جو اب تک شام کے گورنر چلے آ رہے تھے۔ یہ نئی خلافت نہ صرف حضرت علی کے پیروؤں اور ماننے والوں کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ بلکہ اور دوسرے بھی بہت سے صالح اور پاک باز مسلمان اس کے خلاف تھے

امیر معاویہ نہ صرف یہ کہ خاندانِ رسالت سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے۔ بلکہ وہ بنو امیہ کے ایک فرد تھے۔ اور یہ بنوامیہ وہ تھے جو فتح مکہ تک برابر اسلام اور داعیِ اسلام کے خلاف پورے جوش اور شدت کے ساتھ معرکہ آرا رہے تھے۔

اس کے علاوہ عام ناراضی کا ایک سبب اور بھی تھا۔ امیر معاویہ نے نہ صرف یہ کہ

دارالخلافہ کو مدینہ منورہ کے بجائے دمشق کو رکھا۔ بلکہ اپنے بیٹے یزید کو وارث سریر خلافت بنا دیا۔

امیر معاویہؓ کی وفات کے بعد امام حسینؓ نے اس نظام حکومت کے خلاف جو ان کی نظر میں اسلامی نہ تھا، صف آرائی کی۔ اور اپنے مٹھی بھر ساتھیوں کے ساتھ قدیم شہر بابل کے قریب ایک مقام کربلا میں شہادت پائی۔ یہ واقعہ ۸۰ ہجری کا ہے۔

مسلمانوں کی ایک خاصی بڑی جماعت خونِ حسین کا انتقام لینے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا عقیدہ تھا کہ خلافت کا استحقاق صرف علیؓ اور فاطمہؓ کی اولاد کو ہے۔ یہی لوگ ہیں جو شیعہ کہلاتے ہیں۔

۷۵۰ء میں اموی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ عوام میں ایسی بے اطمینانی، بددلی، انتشار اور پراگندگی کا عالم تھا کہ ایک نئی حکومت کا تشکیل پذیر ہونا بہت آسان ہو گیا تھا۔ چنانچہ بنو عباس نے موقعہ سے فائدہ اٹھایا۔ اور تخت خلافت پر متمکن ہو گئے۔ یہ عم رسولؐ حضرت عباس بن عبدالمطلب کی اولاد میں سے تھے۔ عباسیوں نے بغداد تعمیر کیا اور اس کو اپنا دارالخلافہ بنایا۔

شیعہ جس طرح امویوں کی حکومت سے خوش نہ تھے۔ اسی طرح عباسیوں کی حکومت سے بھی رضامند نہ تھے۔ وہ اپنے اس اعتقاد پر سختی کے ساتھ قائم تھے کہ خلافت آل بیت رسولؐ کا حق ہے۔ انہی کو ملنا چاہیے تھی۔

ان حالات کا نتیجہ یہ ہوا کہ شیعہ تحریک زیر زمین پروان چڑھتی اور نشوونما پاتی رہی۔ جس کا مقصد صرف یہ تھا کہ تخت خلافت پر اولاد علیؓ و فاطمہؓ کو متمکن کیا جائے۔ چونکہ اب تک حکومت و طاقت آل بیت رسولؐ کے ہاتھ میں نہیں آئی تھی۔ لہٰذا انہیں خلیفہ کے بجائے امام کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔

جب تک بنو فاطمہ کی حکومت قائم نہیں ہو گئی "دعوت" کا سلسلہ پوشیدہ طور پر جاری رہا۔ پھر علانیہ ہو گیا۔

دعوت اور اس کے مختلف مدارج پر ہم آئندہ باب میں گفت گو کریں گے۔ ذیل میں

دو جدولیں پیش کرتے ہیں۔
پہلی جدول خاندان علی کرم اللہ وجہہ کی ہے
دوسری جدول طوائف امامیہ اثنا عشریہ اور اسماعیلیہ یا سبعیہ کی ہے۔

جدول

خاندان حضرت علی کرم اللہ وجہہ

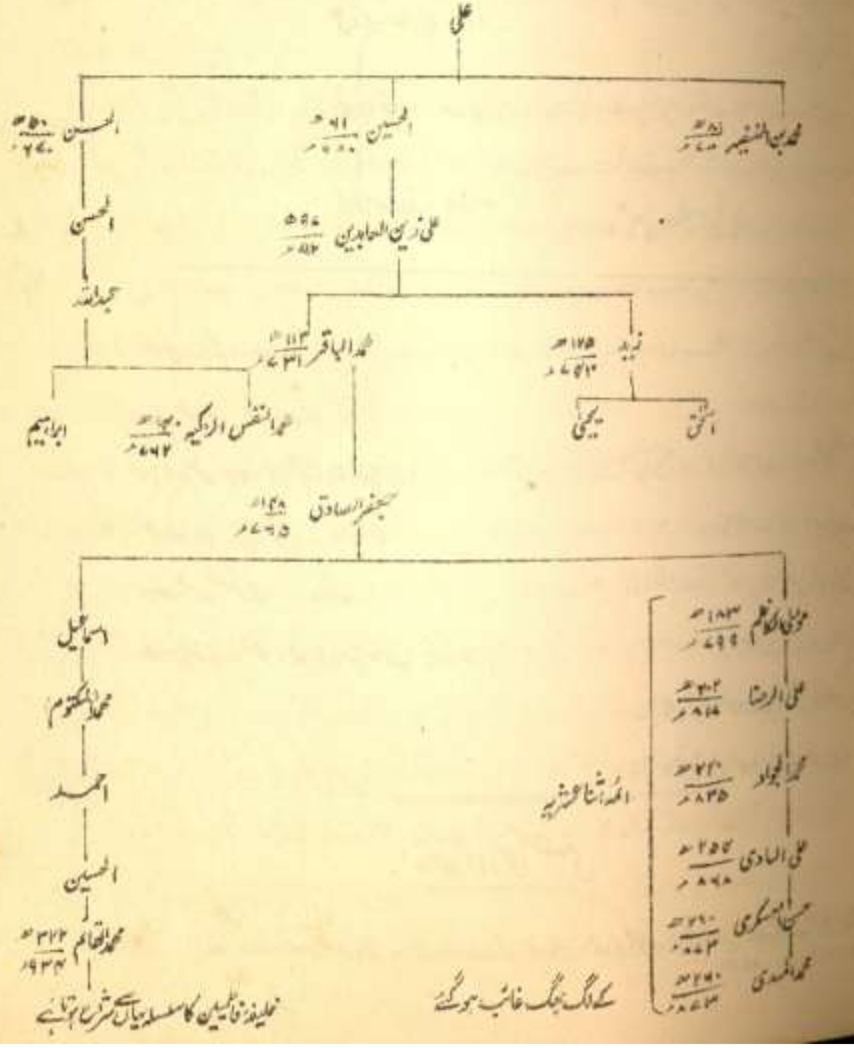

جدول

طوائف امامیہ اثنا عشریہ و اسماعیلیہ یا سبعیہ

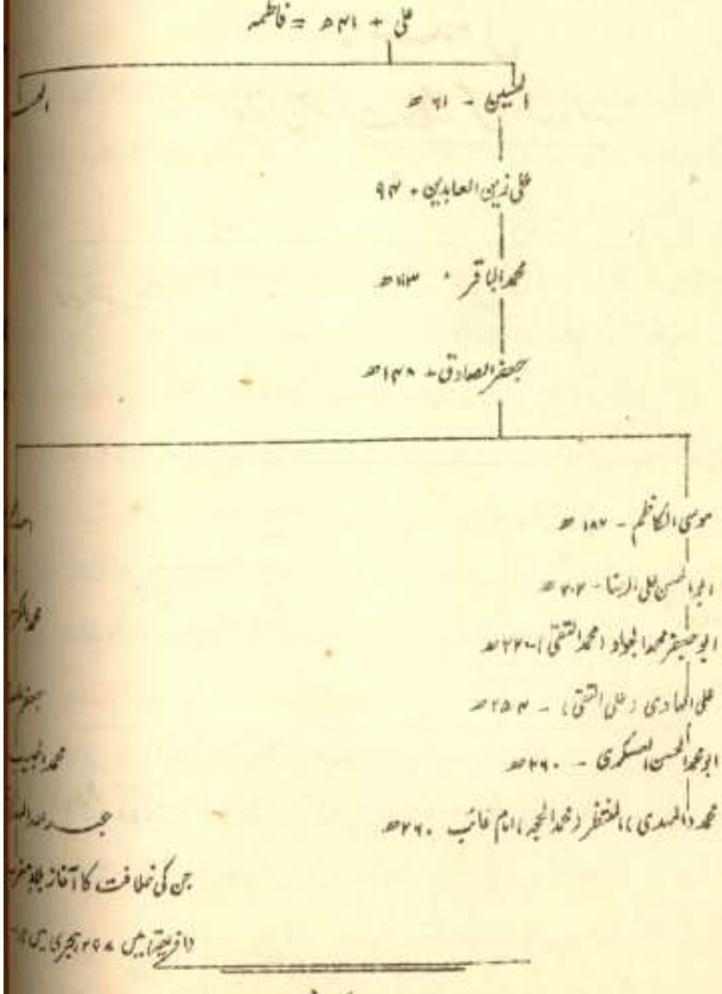

ماخذ اور حواشی

The Muslim world (Hart-Fort Semenary Foundation) ... 1959.

؂ حسن ابراہیم حسن "المعزلدین اللہ" طبع قاہرہ ۱۹۴۸ء صفحہ ۲۷

؃ محمد کامل حسین "المجالس المستنصریہ"۔ طبع قاہرہ۔

؄ ابو محمد علی بن محمد بن سعید بن حزم بن غالب بن صالح الظاہری، اندلسی۔ رمضان ۳۸۴ ہجری (۷ نومبر ۹۹۴ء) میں بہ مقام قرطبہ پیدا ہوئے۔ ان کے والد المنصور محمد بن ابی عامر کے وزیر تھے۔

ابن حزم جامع علوم کثیرہ تھے۔ متعدد کتابیں تالیف کیں۔ ان کے صاحبزادے کا بیان ہے کہ انہوں نے اپنے والد (ابن حزم) کی بقلم خود لکھی ہوئی چار سو تالیفات جمع کیں۔ جو کم و بیش ۸۰ ہزار اوراق پر مشتمل تھیں۔

ابن حزم علمائے متقدمین پر بے باکی سے نکتہ چینی کیا کرتے تھے۔ ان کی تیغ زبان سے شاید ہی کوئی سلامت رہا ہو۔ چنانچہ فقہائے وقت نے انہیں ہدفِ ستم بنایا۔ اور حکومت کو ان کا مخالف بنا دیا۔ آخر ایک بادیہ میں جاکر گوشہ نشین ہوگئے۔ وہیں ۴۵۶ھ میں وفات پائی۔

مؤلفات ابن حزم میں سب سے زیادہ اہم کتاب "الفصل فی الملل والنحل" ہے۔ جو ۱۳۱۷ھ میں مطبع ادبیہ قاہرہ سے شائع ہو چکی ہے۔ اس کے حاشیے پر شہرستانی کی الملل و النحل بھی ہے۔

ابن حزم کے احوال و سوانح کی تفصیل مطلوب ہو تو کتب ذیل کی طرف رجوع کیا جائے:۔

۱۔ وفیات الاعیان، ج ۲ صفحہ ۲۱، ۲۴۔
۲۔ القفطی: "اخبار العلماء" صفحہ ۱۵۶۔
۳۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام۔ مادہ "ابن حزم"۔ وغیرہ۔

؅ مقریزی کے الفاظ یہ ہیں:۔

"ابن حزم نے جو کچھ لکھا ہے یہ وہی قول ہے جو فاطمیوں کے دشمنوں کا چلایا ہوا ہے۔ خود ابن حزم قرطبہ کے رہنے والے تھے۔ جہاں بنو امیہ حکمران تھے۔ اور یہ بنو امیہ، فاطمیوں کے بدترین دشمن تھے۔ ابن حزم نے اپنے بادشاہوں کے شہر میں فاطمیوں سے متعلق جو باتیں سنیں، نقل کر دیں جیسا کہ مخالف کیا کرتے ہیں۔"

اس دور میں صالح، نیکوکار اور خدا ترس لوگ گھٹتے جاتے ہیں اور وہ جو خدا کو فراموش کر چکے ہوں اور دین سے تمسخر کرتے ہوں اور اصول دین کا استخفاف کرتے ہوں، فاسق اور فاجر ہوں۔ روز بروز بڑھتے جاتے ہیں۔

کبھی کبھی اس دور میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ ائمہ مستقرین نمودار ہو جاتے ہیں جیسے مصر کے خلفاء فاطمیہ علانیہ طور پر نمودار ہوئے۔ [۱]

دورِ ستر کا آغاز حضرت آدم ؑ سے ہوا۔ اس سے پہلے دور کشف اور دورِ فترت تھا۔ دورِ ستر کا مطلب یہ ہے کہ علم ظاہر اور علم باطن الگ الگ ہو گئے۔ چونکہ لوگ اپنی فطرت کی ناہمواری اور کجی کے باعث، علم باطن کا تحمل نہیں کر سکتے تھے اس لیے وہ خواص کے لیے مخصوص رہا۔ اور علم ظاہر عوام کے لیے عام کر دیا گیا۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علم ظاہر یعنی شریعت کو تو عام رکھا۔ لیکن علم باطن حضرت علیؑ کو عطا ہوا۔ اب تا یوم قیامت جملہ ائمہ علی اور فاطمہ (رضی اللہ عنہا) کی اولاد سے ہوں گے۔ آخری امام قائم القیامۃ ہوگا۔ اور وہ دورِ کشف کا پہلا امام ہوگا۔ اس کے بعد دورِ فترت، اور اس کے بعد دورِ ستر آئے گا۔ اور یہ سلسلہ ادوار اس وقت تک جاری رہے گا۔ جب تک عالم انسانی کے تمام زشت کار اور خاطی نجات کے سزاوار نہ ہو جائیں۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ائمہ مسندِ امامت سے سریر مملکت پر بھی متمکن ہو جاتے ہیں۔ کشور کشائی اور جہانگیری کے کارنامے بھی انجام دیتے ہیں۔ لیکن عام طور پر وہ سیاست سے کنارہ کش رہتے اور امور مذہبی تک اپنی سرگرمیاں محدود رکھتے ہیں۔ [۱] غرض سقیفۂ بنو ساعدہ کے بعد سے خلافت اور امامت میں دوئی پیدا ہو گئی۔

خلافت بیتِ رسولؐ سے باہر چلی گئی۔ لیکن امامت وہیں رہی [۲]

اور یہ عقیدہ صرف اسماعیلیوں ہی کا نہیں۔ جملہ شیعی فرقے اس امر پر متفق ہیں۔ اور ہم آہنگ بھی [۳]۔

شیعہ عام طور پر، اسماعیلی خاص طور پر، خلافت کی اصطلاح پر امامت کو ترجیح دیتے ہیں۔ خلافت کا مفہوم وہ "امامتِ کبریٰ" ہے اور امامت نماز کا مفہوم "امامت صغریٰ"

سے ادا کرتے ہیں ۵ ان کا اعتقاد ہے کہ "امامت دین کا رکن رکین اور اسلام کا ستون ہے۔ جو امام کے ہاتھ پر بیعت نہ کرے، گمراہ ہے اور اگر اسی حالت میں مر جائے تو اس کی موت کفر و نفاق کی موت ہے ۶ ان کا یہ اعتقاد بھی ہے کہ" علیؓ، محمدؐ کے وصی تھے اور آپؐ کے بعد خدا نے امامت کے لیے علی کو اختیار کیا۔ ان کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ :-

۱۰ھ ہجری میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب حجۃ الوداع سے فارغ ہو کر واپس تشریف لائے تو غدیر خم پر جو مکے اور مدینے کے مابین ایک مقام ہے، ٹھہرے۔ اس موقع پر آپؐ نے علیؓ کو اپنا ویسا ہی بھائی بنایا، جیسے ہارون، موسیٰ کے تھے۔ فرمایا:۔ علی منی کھارون من موسیٰ"۔
آپؐ نے فرمایا۔ اے خدا! جو علیؓ کو دوست رکھے تو بھی اسے دوست رکھ جو علیؓ کا دشمن ہو تو بھی اس کا دشمن بن جا۔ جو علیؓ کی مدد کرے تو بھی اس کی مدد کر۔ اور جو علیؓ کا خذلان چاہے تو بھی اسے خذلان سے دوچار کر" حضرات شیعہ کے ہاں اس حدیث کو ۷ غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ کیونکہ وفات سے کچھ ہی مدت پہلے یہ ارشاد صاف اشارہ ہے علیؓ کی امامت کی طرف۔ شیعوں کا یہ عقیدہ بھی ہے کہ آنحضرتؐ نے علیؓ کو علوم لدنی سے سرفراز فرمایا۔ اور ان علوم کو دوسرے تمام صحابہ سے مخفی رکھا۔ یہ وہ علوم ہیں جو نسل علی میں سے ہر امام اپنے بعد آنے والے امام کو تلقین کرتا ہے ۸

امام کی طرف سے خواہ وہ پردۂ اخفا میں مستور ہو یا منصۂ وجود پر موجود ہو "دعوت" کا سلسلہ برابر جاری رہتا ہے۔ جو داعیوں کے ذریعہ انجام پاتا ہے۔
دعوت اور داعی کا لفظ بھی نیا نہیں ہے۔ خالص اسلامی اصطلاح ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے فرماتا ہے : داعیًا إلى اللّٰہِ
یہ دعوت ایک مستقل نظام کی تابع ہے جس کی تفصیل یہ ہے :-

① **نبی** ـــــ یہ دعوت کا محور اور مرکز ہوتا ہے یہ ظاہری شریعت کی تر
دیتا ہے

② **وصی** ـــــ نبی کے بعد وصی کا درجہ ہے۔ باطنی علوم کی تعلیم اس
ذمے ہے۔

وصی کو "اساس" اور "صامت" بھی کہتے ہیں۔

③ **امام** ـــــ اس کا مرتبہ وصی کے بعد ہے۔

امام کا کام ایک طرف یہ ہے کہ شریعت ظاہر کے حفظ و بقا اور استحکام او
کے لیے ساعی رہے۔ دوسری طرف اس کی ذمہ داری یہ ہے کہ باطنی علوم کی بھی
اہل لوگوں کو ـــــ تعلیم و تلقین کرنا ہے۔

④ **باب الابواب** ـــــ علوم باطنی کے سلسلے میں امام کے بارہ مددگار
ہیں جو "باب" کہلاتے ہیں۔ اور ان میں سے پہلا اور اور اعلیٰ شخص باب الابواب
کہلاتا ہے۔

یہ لوگ صرف باطنی علوم کی تعلیم و تلقین کے لیے وقف رہتے ہیں۔ یہ جہاد سے مستثنیٰ
ہیں۔ امام کے حضور ہی میں رہتے ہیں۔

انہیں اصطلاح میں "لیلی حجت" کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں۔

⑤ "لیلی حجت" کے مقابلے میں "نہاری حجت" ہے۔ اس زمرے میں جو لوگ
ہوتے ہیں۔ ان کی تعداد بھی بارہ ہوتی ہے

ان کا کام شریعت ظاہر کی تعلیم و تلقین ہے۔

زمین کی تقسیم بارہ جزیروں میں کی گئی ہے۔ ہر جزیرے میں ایک حجت نہاری
بھیجا جاتا ہے۔ یہ لوگ جہاد سے مستثنیٰ نہیں ہوتے ہیں۔ ان پر جہاد اسی طرح فرض ہے
جس طرح دوسرے مسلمانوں پر

⑥ **مبلغ** ـــــ یہ وہ لوگ ہیں جو نبی یا وصی یا امام کی طرف سے مختلف
مقامات پر تبلیغ کے لیے بھیجے جاتے ہیں

مبلغ تین طرح کے ہوتے ہیں ۔

الف ـــــ داعی البلاغ

ب ـــــ داعی مطلق

ج ـــــ داعی الدعاۃ

ان تینوں داعیوں کے الگ الگ حدودِ کار ہوتے ہیں

ـــــ : داعی بلاغ تبلیغ کرتا ہے

یعنی شریعت ظاہرہ اور علوم باطنی کی تبلیغ و تلقین اس کے ذمے ہوتی ہے ۔

ـــــ : داعی مطلق وہ ہے جو امام کے زمانۂ غیبت و ستر میں اس کا جانشین اور قائم مقام ہوتا ہے ۔ اسے وہ تمام اختیارات حاصل ہیں جو امام کو حاصل ہوتے ہیں ۔

ـــــ : داعی الدعاۃ ، عام داعیوں کا سربراہ ہوتا ہے ۔ یعنی ان داعیوں کا سربراہ جو داعی بلاغ ہوتے ہیں ۔

⑥ **ماذون** ـــــ یہ وہ شخص ہے جو اس آدمی سے جو دعوت قبول کرے ثابت قدمی ، فدویت اور اخفا کا عہد و میثاق داعی کی طرف سے لیتا ہے ۔

⑦ **مکاسر** ـــــ اس کا کام یہ ہے کہ لوگوں کے دلوں میں اس مذہب و مسلک سے متعلق جس پر وہ قائم ہیں بحث و دلیل سے شک و شبہ پیدا کرے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پھر وہ ذہناً قبولِ دعوت کے لیے تیار ہو جاتا ہے [۲]

غرض اسماعیلی دعوت کا مقام انہی اصولوں پر مبنی ہے جن پر برابر عمل ہوتا چلا آ رہا ہے

ماخذ

[۱] تاریخ فاطمیین مصر (ڈاکٹر زاہد علی مرحوم) شائع کردہ ۔ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن ، ۱۹۴۸ء ۔ ص ۴۹۳ ۔

[۲] ایضاً ، ص ۴۹۹ ۔

۳ ۔ نورمبین حبل اللہ المتین (حن محمد جان محمد چنارا) طبع بمبئی ۱۹۳۶ء ، ص ۷
اس کتاب کی خاص الخاص اور اہم ترین اہمیت یہ ہے کہ یہ ایک ایسے اسماعیلی کی لکھی ہوئی ہے جو اپنی جماعت میں ایک نمایاں حیثیت کا حامل تھا۔

دوسری خصوصیت اس کتاب کی ——— جو بہت زیادہ اہم ہے ——— یہ ہے کہ یہ خاص برائے اسماعیلیان" لکھی گئی ہے۔

کسی مذہب یا مسلک کے رد و اثبات میں دوسرے کیا کہتے ہیں؟ بلاشبہ یہ چیز بھی اپنے دلائل اور مواد کی روشنی میں قابلِ غور ہو سکتی ہے اور اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن کسی مذہب یا مسلک کے بارے میں خود صاحب مذہب یا صاحب مسلک کیا کہتا ہے اس کی اہمیت دوسروں کے اقوال و افکار کے مقابلے میں بہرحال زیادہ ہے۔

چنانچہ نورمبین کے مندرجات اسی لیے زیادہ اہم اور توجہ طلب ہیں کہ وہ ایک ذمہ دار اسماعیلی کے قلم سے نکلے ہیں۔

۴ المعز الفاطمی (ابراہیم جلال) شائع کردہ دائرۃ المعارف الاسلامیہ (مصر) طبع ۱۹۴۴ء ، ص ۵ ۔

۵ " المقدمہ " (ابن خلدون) المطبعۃ الخیریہ بالقاھرہ ۱۳۲۲ھ ص ۱۰۲

۶ ابوجعفر محمد بن یعقوب الکلینی : " الکافی " طبع تہران ۱۲۸۱ھ ۔

۷ تقریباً انہی الفاظ اور اسی مفہوم پر مشتمل کتب صحاح میں بھی بعض روایتیں موجود ہیں۔ جہاں تک حضرت علیؑ کی مرتبت اور شرف کا تعلق ہے اس سے تو کسی مسلمان کو مجالِ انکار نہیں البتہ اس سے ان کی ولایت اور وصیت کا جو نتیجہ نکالا جاتا ہے وہ اھل السنت اور اصحاب شیعہ کے یہاں متفق علیہ نہیں بلکہ مختلف فیہ ہے۔

۸ مجموعۃ الوثائق الفاطمیہ ۔ المجلد الاول (ڈاکٹر جمال الدین شیال ، پروفیسر تاریخ اسلام ، اسکندریہ یونیورسٹی) مطبع لجنۃ التألیف والترجمہ والنشر ، ۱۹۵۸ء ، ص ۱۷ ، ۱۸ ۔

۹ تاریخ فاطمیین مصر ص ۵۰ ، ۵۱ ۔

◎

مدارج دعوت

گذشتہ صفحات میں اسماعیلی دعوت کے نظام اور دستور پر روشنی ڈالی جا چکی ہے اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ دعوت بدرجہ منتظم، مرتب اور مربوط اصولوں پہ قائم تھی۔ اس میں فلسفے کی آمیزش بھی تھی۔ دین کا تقدس بھی۔ نفس کی تطہیر بھی۔ علم کی بصیرت بھی۔ اور فکر و نظر کی وسعت بھی۔ ساتھ ہی ساتھ یہ ایسا نظام تھا۔ جو اپنے مستجیب کی گفتار و رفتار کا نہ صرف احتساب کرتا تھا۔ بلکہ کسی مرحلے پر بھی۔ احتساب کی قدغن کو کمزور نہیں ہونے دیتا تھا۔ اس کی کامیابی اور حفظ و بقا کا اصل راز یہی ہے۔

اب ہم بتانا چاہتے ہیں کہ اسماعیلی دعوت کے مدارج کیا تھے؟

ان مدارج کی تفصیل دلچسپ بھی ہے اور معلومات افزا بھی۔ اور اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ نشر دعوت کے یہ مدارج کس درجہ نفسیاتی اور کشش انگیز ہیں۔

دعوت اسماعیلی کے مدارج نو (۹) ہیں۔ جنہیں ہم الگ الگ باب کی صورت میں پیش کرتے ہیں!

دعوتِ اوّل

داعی نہایت وقار کے ساتھ مسندِ ارشاد پر متمکن ہوتا ہے۔ قبل اس کے کہ دعوت کا سلسلہ شروع کرے، سب سے پہلے وہ اس شخص سے جسے دعوت دینا چاہتا ہے وہ چند ٹیڑھے سوال، تاویلِ آیات اور معانیٔ امورِ شریعت سے متعلق کرتا ہے۔ بعد ازاں علومِ طبعیہ اور دیگر مسائل سے متعلق چند چونکا دینے والے سوالات چھیڑتا ہے۔

اور اس مرحلے کے طے کرنے کے بعد وہ اس شخص سے کہتا ہے کہ اے شخص اسرارِ دین پوشیدہ ہیں۔ اکثر لوگ ان سے ناواقف ہیں اور ان کے منکر ہیں۔ اور اگر اس امت کے لوگ ان اسرار سے واقف ہوتے تو بخدا لئے لایزال ان امور سے متعلق جو اللہ تعالے نے ائمہ اہلِ بیت سے مختص رکھے ہیں۔ باہم مختلف الآرار نہ ہوتے۔

داعی کی یہ باتیں سن کر مدعو چونکتا ہے اور اس میں اشتیاق کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ ان امور کے ادراک کی طرف مدعو کو راغب دیکھ کر داعی معنی قرات اور شرائع دین سے متعلق تقریر کرتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ امت میں یہ تفرقہ، گمراہی اور آفات، تمام نتیجہ ہیں کہ لوگ ائمہ دین سے روگردان ہو گئے ہیں۔ حافظین ملت خیر المرسلین کو نظر انداز کرنے لگے ہیں۔ اور دوسروں سے تمسک کرتے اور ان کی پیروی کرتے ہیں۔ اور یہ بات شک و

شبہ سے بالا ہے کہ وہ صرف ائمہ ہدیٰ ہی ہیں جو شریعت کے محافظ ہیں اور اس کے اسرار و رموز سے پورے واقف ہیں۔ قرآن کے معانی ظاہری و باطنی اور تاویل و تفسیر سے قرار واقعی آگاہ ہیں۔

مگر لوگ ہیں کہ ائمہ کرام سے رو گرداں ہو چکے ہیں۔ اپنی عقل کے تابع بن گئے ہیں۔ ان لوگوں کی پیروی کرنے لگے ہیں جو طالبانِ دنیا ہیں۔ جن کے سر پر تاجِ شاہی اور ہاتھ میں شمشیر آبدار ہے۔ یہ لشکر ظالمان کے معین اور مفتریان و فاسقان زمان کے مددگار بن گئے ہیں۔ انہوں نے ان لوگوں سے ناطہ جوڑ لیا ہے جو کتاب اللہ میں ردوبدل کر دیتے ہیں۔ سنت رسول اللہ میں تبدیلی کر دیتے ہیں۔ دعوت نبوی کے مخالف ہیں۔ یہ مفسدان شریعت اور سالکان غیر طریقۂ مصطفوی اور معاندان خلفاء برحق و ائمہ ابرار ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ورطۂ گمراہی میں جا پڑے ہیں۔

اور حق یہ ہے کہ دین محمد کو خیالات کا تابع نہیں بنایا جا سکتا۔ چنانچہ خدا نے علم دین کو در پردہ مخفی کر دیا ہے۔ تاکہ اس کے اسرار شریفہ متبذل نہ ہونے پائیں۔ پس اسے شخص یاد رکھ اور معلوم کرلے کہ اسرار مکتوم الٰہی صرف فرشتہ مقرب بارگاہ الٰہی یا نبی مرسلؑ یا عبد موعودہ ہی پر واشگاف اور منکشف ہو سکتے ہیں۔ جن کے قلوب کا اللہ تعالیٰ از روئے تقوے امتحان کر چکا ہے۔

داعی کی یہ باتیں مدعو کے دل میں گھر کر جاتی ہیں۔ اور وہ اس کی طرف دل و جان سے مائل ہو جاتا ہے۔

اب داعی مدعو کی عنان توجہ دوسری طرف مبذول کرتا ہے اور اس کے سامنے چند مسائل پیش کرتا ہے اور پوچھتا ہے [1]

① رمی جمار[1] اور سعی صفا[2] کا مطلب کیا ہے!

② کیا وجہ ہے کہ حائضہ پر سے روزے تو ساقط نہیں ہوتے[3]۔ مگر نماز ساقط ہو جاتی ہے؟

③ اس کا سبب کیا ہے کہ جنابت[4] کے لیے تو غسل واجب ہے۔ لیکن بول و براز

کے لیے واجب نہیں ہے؟ ۳؎

۴ اس میں کیا حکمت ہے کہ خدا نے یہ دنیا چھ دن میں پیدا کی؛ کیا وہ ایک ساعت کے اندر خلق کائنات سے عاجز تھا؟

۵ معنیٔ صراط کیا ہیں؟ ۵؎

۶ کراماً کاتبین کون ہیں؟ اور ہم انہیں کیوں دیکھ نہیں پاتے؛ کیا وہ ہماری آنکھوں سے اس لیے اوجھل ہیں کہ ڈرتے ہیں ہم ان سے معارضہ و مجادلہ نہ کرنے لگیں۔ لہٰذا وہ چھپ کر ہمارے اعمال لکھتے ہیں اور ہمارے اعمال کے شاهد بن جاتے ہیں؟

۷ عذاب جہنم کیا ہے؟

۸ گنہگار کی اس کھال کو (جو شریک معصیت تھی) اس کھال سے (جو شریک معصیت نہ تھی) اللہ کیوں بدل کر عذاب دے گا؟ ۹؎

۹ "ویحمل عرش ربك فوقهم یومئذ ثمانیه" کے معنے کیا ہیں؟ ۱۰؎

۱۰ شیطان کیا اور اس کی صفت کیا ہے؛ اس کی قرارگاہ کہاں ہے؟

۱۱ یاجوج ماجوج اور ہاروت ماروت کون ہیں؟ کیا ہیں؟ کہاں ہیں؟

۱۲ ہفت دوزخ، ہشت بہشت، درخت زقوم ۱۱؎، دابۃ الارض ۱۲؎ رؤس الشیاطین ۱۳؎، شجر ملعونہ ۱۴؎ انجیر ۱۵؎ اور زیتون ۱۶؎ کیا ہیں؟

۱۳ "فلا اقسم بالخنس الجوار الکنس" کے معنے کیا ہیں؟ ۱۷؎

۱۴ حروف مقطعات ۱۸؎ کا مطلب کیا ہے؟

۱۵ ہفت آسمان، ہفت زمین، سبع مثانی ۱۹؎ اور (سال) کے بارہ ماہ کا راز کیا ہے؟

۱۶ کتاب وسنت کا عمل تم سے کس چیز کا متقاضی ہے؟

۱۷ فرائض لازمی کے معنے کیا ہیں؟

۱۸ سب سے پہلے نفس خود کے بارے میں سوچو کہ کہاں ہے؟ تمہاری روح،

اور اس کی صورت کی نوعیت کیا ہے ؟ اور اس کی قرارگاہ کہاں ہے ؟

(۱۹) (بدن میں آنے سے پہلے) روح کا حال کیا تھا ؟

(۲۰) انسان کیسا ہے ؟

(۲۱) آدمی اور جانور کی زندگی اور بہائم ؑ اور حشرات ؓ کی زندگی میں کیا فرق ہے ؟

(۲۲) حشرات کی زندگی اور نباتات کی روئیدگی کا حاصل کیا ہے ؟

(۲۳) اس حدیث کا مطلب کیا ہے کہ حوا کی تخلیق آدم کی پسلی سے ہوئی ؟

(۲۴) فلاسفہ کے اس قول کا مطلب کیا ہے کہ انسان "عالمِ صغیر" ہے اور عالم انسان کبیر ہے ؟

(۲۵) کیوں انسان کی قامت کشیدہ ہے ؟ اور قامتِ حیوان اس کے برعکس ؟

(۲۶) ہاتھوں اور پاؤں کی دس دس انگلیاں ہیں ؟ ہر انگلی میں تین تین پور کیوں ہیں؟ انگوٹھے میں صرف دو پور کیوں ہیں ؟ استخوانِ پشت میں بارہ اور استخوانِ گردن میں سات گرہیں کیوں ہیں ؟

(۲۷) صرف چہرے میں سات شگاف[۲۲] اور پورے بدن میں دو شگاف[۲۳] کیوں ہیں۔

(۲۸) اس کا سبب کیا ہے کہ انسان کی گردن بصورتِ مٓ ہے ؟ اور دونوں ہاتھ بشکل حٓ، اور شکم بصورتِ مٓ اور پاؤں بشکل دٓ واقع ہوئے ہیں ؟ کیا اس لئے تو نہیں کہ پیکرِ انسان نقشِ محمد نظر آئے ؟

(۲۹) قامتِ انسان بشکل الفٓ اور رکوع میں بصورت لٓ اور سجدے میں بروضع ھٓ کیوں ہے ؟ کیا اس لیے تو نہیں کہ لفظ "اللّٰہ" بن جائے ؟

(۳۰) کیا سبب ہے کہ استخوانِ انسان کی تعداد یہ ہے اور دندان و عروق، اور اعضائے رئیسہ کی تعداد اتنی ہے ؟

داعی اس طرح کے سوالات تشریحِ اعضا سے متعلق کرتا ہے اور اس کے بعد کہتا ہے۔

"کیا تم حال خود پر غور نہیں کرتے ؟ اور یہ کیوں نہیں مانتے کہ تمہارا پیدا کرنے والا حکیم و علیم ہے ۔ اس کا ہر فعل مبنی بر حکمت ہے ۔ اس کا کوئی کام ایسا نہیں جس میں اسرار ہائے نہاں نہ ہوں ، پھر کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ تبارک وتعالے نے حکم دیا ہے کہ ان اسرار و حکم پر غور کرو ؟ وہ فرماتا ہے" :۔

① فی الارض آیات للمؤمنین ۔ [25]

② وفی انفسکم افلا تبصرون ۔ [26]

③ ویضرب اللہ الامثال للناس ۔ [27]

④ لعلھم یتفکرون ۔ [28]

⑤ سنریھم آیاتنا فی الآفاق وفی انفسھم حتی یتبین انہ الحق [29]

کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اللہ تبارک وتعالے خود ہی امورِ پنہاں کی طرف ہماری رہنمائی کرتا ہے کہ اسرارِ مخفی سے آشنا ہو جاؤ ۔ اگر تم متنبہ اور رمز آشنا ہو گئے تو جملہ حیرت و شبہ و شک تم سے زائل ہو جائے گی ۔ اور تم پر معارف سینہ ظاہر ہو جائیں گے ۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ خود تم ہی نے اپنے نفوس کو مجہول بنا رکھا ہے ورنہ اللہ تعالے تو فرماتا ہے :۔

ومن کان اعمیٰ فھو فی الآخرۃ اعمیٰ واضل سبیلا ؟ [30]

اس تقریر دل نشین کے بعد جب داعی دیکھ لیتا ہے کہ اس نے جو کچھ بیان کیا ہے ۔ مدعو کے دل میں اس نے گھر کر لیا ہے ۔ تب وہ کہتا ہے :

"خبردار ! جلد بازی سے کام نہ لینا ۔ دین خدا اس سے کہیں بلند و برتر ہے ۔ کہ نا اہل اس سے آگاہ ہوں ۔ یہ کام عہد و میثاق کے بغیر ممکن نہیں ۔ کیونکہ یہ عادت اللہ چلی آ رہی ہے کہ خود وہ بھی جسے ہدایت کرتا ہے اس سے عہد و پیمان استوار کراتا ہے ۔ چنانچہ فرماتا ہے :۔

واذ اخذنا من النبیین میثاقھم ومنک ومن نوح و ابراھیم وموسیٰ وعیسیٰ بن مریم واخذنا منھم میثاقاً غلیظاً [31]

نیز ارشاد فرمایا:

من المومنین رجال صدقوا ما عاھدوا اللہ علیہ [۳۲]

علاوہ ازیں ارشاد ہوا:

یاایھا الذین امنوا اوفو بالعقود [۳۳]

اس کے علاوہ فرمایا:

و لاتنقضوا الایمان بعد توکیدھا [۳۴]

یہ اور اس طرح کی دوسری آیات تلاوت کرنے کے بعد داعی کہتا ہے:

بیعت کے لیے ہاتھ بڑھاؤ۔ اور ہم سے پختہ عہد کرو کہ کبھی بھی عہد شکنی کا ارتکاب نہ کروگے۔ نہ افشائے راز کروگے، ہمارے دشمن کے دشمن اور دوست کے دوست ہوگے۔

پھر جب مدعو داعی کے ہاتھ پر بیعت کرلیتا ہے تو داعی مدعو کی مالی استطاعت کو دیکھتے ہوئے اس سے امام کے لیے مالی نذر مانگتا ہے۔ اگر مدعو نذر پیش کر دیتا ہے تو اسے مجلس حکمت و موعظت میں شرکت کرتے رہنے کی اجازت مل جاتی ہے بصورتِ دیگر نہیں ملتی۔ اسماعیلیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ ہر ظاہر حکم شرع کے لیے حکم باطن لازمی ہے۔ اور ہر تنزیل کے لیے تاویل لابدی ہے۔ اس لیے اس فرقے کو "باطنیہ" بھی کہتے ہیں [۳۵]

ماخذ اور حواشی

[۱] المواعظ والاعتبار فی ذکر الخطط والآثار (تقی الدین احمد بن علی المقریزی)

[۲] رمی جمار، یعنی حج کے موقع پر جو کنکریاں پھینکی جاتی ہیں۔

[۳] دورانِ حج میں صفا اور مروہ کے مابین جو دوڑ لگائی جاتی ہے

[۴] یعنی دورانِ حیض میں روزے نہیں رکھے جاتے۔ مگر اس سے فراغت کے بعد قضا روزے رکھے جاتے ہیں۔

[۵] دورانِ حیض میں نماز بھی نہیں پڑھی جاتی۔ لیکن اس مدت کی قضا نماز نہیں پڑھی جاتی۔

[۶] اخراجِ منی کے بعد غسل واجب ہے۔ خواہ یہ اخراج بصورتِ احتلام ہوا ہو یا بہ سبب

مجامعت۔

۶ بظاہر بول و براز منی سے زیادہ ناپاک اور مکروہ ہیں۔ لیکن بول و براز کے بعد صرف استنجا ہے۔ غسل کی قطعاً ضرورت نہیں۔

حالانکہ بظاہر احوال ہونا یہ چاہیے تھا کہ بول و براز پر غسل واجب ہوتا۔ اور اخراج منی کے بعد

۸ پل صراط

۹ آیۂ قرآنی کی طرف اشارہ ہے:

كلما نضجت جلودهم بدلناهم جلودا غيرها ليذوقوا العذاب

یعنی جب ان کی کھالیں گل جائیں گی۔ تو ہم ان کی دوسری کھالیں بدل دیں گے۔ تاکہ اچھی طرح عذاب لذت آشنا ہوں۔ (سورۂ نساء۔ آیت ۵۶)

۱۰ ترجمۂ آیت:

"اور آپ کے پروردگار کے عرش کو اس روز آٹھ فرشتے اٹھائے ہوں گے۔"

(سورۂ حاقہ۔ آیت ۱۷)

۱۱ "زقوم" کا لفظ قرآن کریم میں ـــــ جہاں تک میری تحقیق کا تعلق ہے ـــــ تین جگہ آیا ہے

۱: ۲۳ ویں پارے کی سورۂ صافات میں۔ آیت ۶۲۔

۲: ۲۵ ویں پارے کی سورت "دخان" میں آیت ۴۴۔

۳: ۲۷ ویں پارے کی سورت "واقعہ" میں آیت ۵۲

ان ہر سہ مقامات میں صرف صافات کے اندر زقوم کی تعریف کی گئی ہے۔ باقی مقامات فقط زقوم کا فقط استعمال ہوا ہے

سورہ صافات میں زقوم اور اس کی تعریف بایں الفاظ ملتی ہے:۔

اذلك خير نزلا ام شجرة الزقوم انا جعلناها فتنة للظلمين انها شجرة تخرج في اصل الجحيم طلعها كانه رءوس الشياطين۔ فانهم لآكلون منها فمالئون منها البطون

ترجمہ: "بھلا یہ (دعوت) بہتر ہے یا زقوم کا درخت ہم نے اس درخت کو ظالموں کے لیے موجب امتحان بنایا ہے۔ وہ ایک درخت ہے جو قعر دوزخ میں سے نکلتا ہے۔ اس کے پھل ایسے ہیں جیسے سانپ کے پھن۔ تو وہ (دوزخی) لوگ اسے کھائیں گے اور اسی سے پیٹ بھریں گے۔" (سورہ صافات آیت ۶۲ - ۶۶)

۶ روئے زمین کا ہر جاندار:

وما من دآبۃ فی الارض الا علی اللہ رزقھا۔

"کوئی جاندار روئے زمین پر نہیں جس کی روزی اللہ کے ذمے نہ ہو۔" (سورۃ ہود - آیت ۶)

۷ سانپ کے پھن۔ ملاحظہ ہو ۵۔

۸ اشارہ ہے آیہ قرآنی کی طرف:

وما جعلنا الرؤیا التی اریناک الا فتنۃ للناس والشجرۃ الملعونۃ فی القرآن۔ ونخوفھم فما یزیدھم الا طغیانا کبیرا

۹ "اور ہم نے جو کچھ آپ کو (معراج میں) دکھایا۔ اور قرآن میں جس درخت کی مذمت کی گئی ہے، ہم نے ان دونوں چیزوں کو ان لوگوں کے لیے موجب گمراہی کر دیا۔ اور ہم ان کو ڈراتے رہتے ہیں۔ لیکن ان کی سرکشی بڑھتی جاتی ہے۔

(سورۃ بنی اسرائیل - آیت ۶۰)

۱۰ انجیر۔

۱۱ زیتون

۱۲۔ ترجمہ آیت:

"میں قسم کھاتا ہوں ان ستاروں کی جو (سیدھے چلتے چلتے) پیچھے کو ہٹنے لگتے ہیں اور پھر (پیچھے ہی کو) چلتے رہتے ہیں"!

"وہ ستارے جو سیدھے چلتے چلتے دفعتہً پیچھے ہٹ جاتے اور پھر پیچھے ہی چلتے رہتے ہیں پانچ ہیں۔"

۱- زحل ۲- مریخ ۳- مشتری ۴- زہرہ ۵- عطارد۔

۱۸ مثلاً "الٓمٓرٰ" - "کٓھٰیٰعٓصٓ" وغیرہ۔

۱۹ سورہ فاتحہ - اس میں سات آیتیں ہیں ۔

۲۰ درندے ۔

۲۱ کیڑے مکوڑے ۔

۲۲ انسان کے چہرے میں سات شگاف ہیں - دو کان کے - دو ناک کے - دو آنکھ کے - ایک منہ کا - کل سات

۲۳ باقی بدن میں صرف دو شگاف ہیں یعنی مقام بول و براز ۔

۲۴ "عرق" رگ کو کہتے ہیں - عروق جمع ہے - یعنی رگیں ۔

۲۵ ترجمہ آیت،

"اور یقیناً (ایمان) لانے والوں کے لیے زمین میں بہت سی نشانیاں ہیں"۔

۲۶ ترجمہ آیت ؛ (سورہ ذاریات - آیت - ۲۰)

"اور خود اپنی ذات میں بھی کیا تم کو (خدا کی نشانیاں) دکھائی نہیں دیتیں"؟

(سورہ ذاریات - آیت ۲۲)

۲۷ ترجمہ آیت ؛

"اور اللہ تعالےٰ لوگوں کی ہدایت کے لیے یہ مثالیں بیان فرماتا ہے"۔

(سورہ - نور آیت ۳۶)

۲۸ ترجمہ آیت ؛

اور ہم یہ مثالیں لوگوں کے (نفع کے) لیے بیان کرتے ہیں - تاکہ وہ غور کریں -"

(سورہ حشر - آیت ۷۲)

۲۹ ترجمہ آیت :

"ہم عنقریب ان کو اپنی نشانیاں ان کے گرد و نواح میں دکھا دیں گے اور خود ان کی ذات میں بھی، یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے کا کہ یہ (قرآن) حق ہے"۔ (سورہ حم سجدہ آیت ۵۳

۴۰ـہ ترجمہ آیت:

"اور جو شخص دنیا میں (راہِ نجات دیکھنے سے) اندھا رہے گا۔ تو وہ آخرت میں بھی (منزلِ نجات تک پہنچنے سے) اندھا رہے گا۔ اور (کہیں) زیادہ گم کردہ راہ ہوگا۔"

(سورہ بنی اسرائیل ۔ آیت ۷۲)

۴۱ـہ ترجمۂ آیت:

"اور جب کہ ہم نے تمام پیغمبروں سے اقرار لیا اور آپ سے بھی۔ اور نوحؑ اور ابراہیمؑ اور موسےٰؑ اور عیسیٰؑ ابن مریمؑ سے بھی۔ اور ہم نے ان سب سے خوب پختہ عہد لیا۔"

(سورۃ احزاب ۔ آیت ۷)

۴۲ـہ ترجمہ آیت:

"ان مومنین میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں کہ انہوں نے جس بات کا اللہ سے عہد کیا تھا۔ اس میں سچے اترے۔"

(سورۃ احزاب ۔ آیت ۲۳)

۴۳ـہ ترجمہ آیت:

"اے ایمان والو ۔ اپنے کیے ہوئے عہد پورے کرو" ۔

(سورہ مائدہ ۔ آیت ۲)

۴۴ـہ ترجمہ آیت:

اور اپنی قسمیں مستحکم کرنے کے بعد مت توڑو۔"

(سورہ نحل ۔ آیت ۹۱)

۴۵ـہ قلائد الجواہر فی احوال الجواہر،

"گفتار سوم در کیفیت دعوت دعاۃ فاطمیہ" طبع بمبئی ۱۳۰۱ ھ

یہ کتاب فارسی میں ہے اور اب نایاب ہے۔ یہ نواب صدیق حسن خاں مرحومؒ (بھوپال) کے نام سے معنون ہے اس کا قلمی نسخہ سید وصی احمد صاحب بلگرامی سابق ڈپٹی کلکٹر (بہار) مقیم کراچی کے پاس خود انہی کا نقل کیا ہوا موجود تھا جو انہوں نے ازراہِ کرم بغرض استفادہ عاریۃً مجھے مرحمت فرمایا۔ جس کے لیے میں ان کا سپاس گزار ہوں۔

◎

دعوتِ دوم

○

مدعو کے دل میں جب داعی کی باتیں بیٹھ جاتی ہیں۔ اور وہ دیکھ لیتا ہے کہ تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھا ہے نیز یہ کہ مدعو نذر امام کے لیے اپنا مال بھی پیش کر چکا ہے۔ تو اب دوسری مجلس جمتی ہے۔

اس دوسری مجلس میں داعی مدعو سے کہتا ہے:۔

اللہ تبارک و تعالیٰ صرف اس بات سے خوش نہیں ہو جاتا کہ اس نے اپنے بندوں کو جو احکام دیئے ہیں۔ ان کی وہ پابندی اور تعمیل کریں۔ وہ اس وقت خوش ہوتا ہے۔ جب یہ بندے ائمہ حق کی پیروی کریں کہ ان ائمہ حق کو خدا ہی نے ہدایت مرداں و حفظ شریعت کے لیے مقرر فرمایا ہے۔ اتنا کہہ چکنے کے بعد داعی ان امور کی مدلل اور مبرہن طور پر تفصیل و تشریح کرتا ہے جو کتب اسماعیلیہ میں مرقوم ہیں [1]

اب جب داعی محسوس کرتا ہے کہ مدعو کا دل ائمہ حق کی محبت اور عقیدت سے سرشار ہو گیا ہے تو تیسری دعوت کا آغاز ہوتا ہے [2]

حواشی اور ماخذ

[1] اس سلسلے میں اسماعیلیوں کی کتب ذیل خاص طور پر قابل غور و مطالعہ ہیں

۱ کتاب الایضاح والبیان فی الجواب عن مسائل للامتحان" (از حسین بن علی بن محمد بن الولید داعی مطلق ہشتم)

۲ کتاب الہمۃ فی آداب اتباع الائمہ (نعمان بن محمد) دارالفکر العربی (مصر)

۳ رسائل اخوان الصفا۔

۴ المجالس المؤیدیہ (ہبۃ اللہ بن موسیٰ شیرازی۔ باب الابواب امام مستنصر) دارالفکر العربی (مصر)

عہ "قلائد الجواہر فی احوال البواہر (ذکر دعوت دوم)

دعوتِ سوم

○

پھر جب مدعو دعوتِ سوم میں باریاب ہوتا ہے۔ تو داعی اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اور کہتا ہے:

"ائمۂ حق سات ہیں۔ جیسے ہفت ستارہ، ہفت آسمان، ہفت زمین"

ان ائمۂ حق کے اسماء شریفہ یہ ہیں:۔

(۱) حضرت علی علیہ السلام
(۲) حضرت حسن علیہ السلام
(۳) حضرت حسین علیہ السلام
(۴) امام زین العابدین رضی اللہ عنہ
(۵) امام محمد الباقر •
(۶) امام جعفر الصادق
(۷) قائم صاحب الزمان [۱]

جاننا چاہیے کہ قائم صاحب الزمان کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض محمد مکتوم بن اسمٰعیل بن امام جعفر الصادق کو اور بعض اسماعیل بن امام جعفر الصادق کو امام مانتے ہیں۔

بہرحال داعی ایسے توجیہات، دلائل اور براہین پیش کرتا ہے کہ مدعو یقین کرنے لگتا ہے کہ امام سات ہیں احساس طرح اس کے دل سے رشتۂ اعتقادِ امامیہ اثنا عشریہ کمزور پڑ جاتا ہے۔ جو بارہ اماموں کے قائل ہیں۔

اپنی تقریر کے دوران میں داعی بتاتا ہے۔ محمد بن اسماعیل، صاحبِ علم مستور اور صاحبِ علم باطن ہیں۔ ان کے سوا علم باطن کسی اور کو حاصل نہیں ہے۔ وہی اور صرف وہی ہیں جو تفسیر قرآن کی تاویل کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ وہی ہیں جن پر جملہ اسرارِ خداوندی منکشف اور منکشف ہیں اور یہ دعاۃ (داعی کی جمع) وارثانِ علمِ امام ہیں۔ کسی میں یارا نہیں کہ ان کی برابری کر سکے

اپنے ان افکار و عقائد کو داعی اس طرح مدعو کے دل میں اتار دیتا ہے اور اپنے خیالات پر ایسی ایسی دلیلیں لاتا ہے[۲] کہ مدعو کے لیے سرِ عقیدت خم کر دینے کے سوا چارہ نہیں رہتا

جب داعی محسوس کر لیتا ہے۔ کہ مدعو اس سے پورے طور پر متاثر ہو چکا ہے اور اس کی باتیں دل و جان سے قبول کر چکا ہے۔ اور یہ ساری باتیں اس کے دل پر نقش ہو چکی ہیں۔ تب دعوتِ چہارم کی باری آتی ہے۔ جو اپنی جگہ ایک الگ اور مستقل چیز ہے[۳]

حواشی و مآخذ

[۱] اسماعیلیوں کے ہاں غالب اکثریت چونکہ حضرت علی کو "اساس" مانتی ہے۔ اس لیے امامت کا سلسلہ ان سے نہیں۔ بلکہ حضرت امام حسنؓ سے شروع ہوتا ہے۔ لہٰذا حضرت علی اساس ہیں اور حضرت امام حسنؑ پہلے امام!

[۲] تفصیل کے لیے کتب ذیل سے رجوع کیا جائے۔

① رسائل اخوان الصفاء

② الحاکم بامر اللہ و اسرار الدعوۃ الفاطمیہ (از محمد بن عبداللہ عنان) شائع کردہ دار النشر الحدیث قاہرہ (مصر)

③ فرق الشیعہ (از محمد الحسن بن موسیٰ النوبختی جو ۱۳۲۰ھ میں مصر سے شائع ہو چکی ہے۔

[۳] قلائد الجواہر فی احوال الجواہر۔ ذکر دعوت سوم

دعوتِ چہارم

مجلس چہارم میں داعی بیان کرتا ہے کہ مجددین شرائع سات ہیں۔ اور ان ساتوں میں سے ہر ایک ناطق کے لقب سے موصوف ہے۔ ہر ناطق کا ایک جانشین اور اس کی شرع کا رائج کرنے والا ہوتا ہے یہ "صامت" کہلاتا ہے۔ پس جس طرح ناطق سات ہیں۔ اسی طرح صامت بھی سات ہیں۔ ان نطقا اور صامتین کی تفصیل حسب ذیل ہے:۔

(۱) ناطق اول آدم علیہ السلام ہیں۔

ناطق اول کے صامت یعنی صامت اول شیث علیہ السلام ہیں۔

پھر جب شریعت ابوالبشر منقرض ہو گئی تو ناطق دوم کا ظہور ہوا۔

(۲) ناطق دوم نوح علیہ السلام ہیں۔ ان کے ظہور پذیر ہوتے ہی شریعت آدم صفی اللہ یک قلم موقوف ہو گئی۔

ناطق دوم کے صامت یعنی صامت دوم سام تھے۔

پھر ان کا دور بھی اتمام کو پہنچا۔

(۳) اب ناطق سوم حضرت ابراہیم علیہ السلام مبعوث ہوئے۔ انہوں نے شریعت نوح علیہ السلام منسوخ فرمادی۔

خلیل اللہ ابراہیم السلام کے صامت حضرت اسماعیل ذبیح تھے۔
یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا پھر ختم ہو گیا
(۴) ناطق چہارم موسیٰ علیہ السلام ہیں۔ ان کے صامت اور وصی ہارون علیہ السلام ہوئے۔
ان کے بعد حضرت یوشع بن نون کو یہ منصب ملا۔
(۵) ناطق پنجم حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔
عیسیٰ علیہ السلام کے صامت اور وصی حضرت شمعونؑ تھے
(۶) ناطق ششم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔
آپ کے وصی اور صامت حضرت علی المرتضیٰ، ان کے بعد امام حسن، پھر امام حسین،
بعد ازاں علی بن حسین زین العابدین۔ پھر محمد الباقر بعدہ جعفر الصادق علیہم السلام آخر میں اسماعیل
بن جعفر جو ائمہ مستورین کے آخری صامت ہیں۔
(۷) ناطق ہفتم صاحب الزماں محمد بن اسماعیل ہیں۔ جن پر جملہ علم اولین و آخرین منتہی ہو گیا
ہے۔ اور ہدایت و نجات صرف انہی کی طاعت اور پیروی میں منحصر ہو کر رہ گئی ہے۔
اس طرح سات ناطقوں کا ذکر کرنے کے بعد داعی استدلال کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ یہ
سات کا عدد ہر جگہ موجود اور کارفرما نظر آتا ہے

- ——— آسمان سات ہیں
- ——— ہفت زمین کو سب جانتے ہیں
- ——— سمندر بھی سات ہی ہیں۔
- ——— ہفتے کے دن کتنے ہیں؟ سات!
- ——— اسی طرح "سبع سیارہ"!
- ——— اور کیا تم نہیں دیکھتے کہ انسان کے چہرے میں شگاف بھی سات ہی ہیں؟

غرض اس تقریر شائستہ اور توجیہ بائستہ سے کام لے کر داعی اپنی بات مدعو کے دل میں
جاگزین کر دیتا ہے۔ اس کے بعد پانچویں دعوت کا آغاز ہوتا ہے۔

حواشی اور ماخذ

ؔلہ صامت کے معنی ہیں خاموش ۔ اور ناطق کے معنی ہیں گویا ۔

ناطق اور صامت کے مابین جو فرق بیان کیا گیا ہے ۔ وہ یہ ہے :

"ناطق عہدِ رسالت میں رسول ہے اور صامت اس کی
شریعت کا اساس اور تاویل کرنے والا۔ پس رسول کی گویائی
منحصر ہوتی ہے ظاہر پر اور "اساس" رمز کشا ہوتا ہے ۔
باطن کا ۔۔۔!

یہ تفصیل قاضی القضاۃ نعمان بن محمد کی کتاب "اساس التاویل" (ذکر آدمؑ) میں ہے ۔ یہ کتاب اب تک جمع نہیں ہوئی ہے ۔ صرف اس کا قلمی نسخہ موجود ہے ۔ لیکن دوسری کتابوں میں اس کے حوالے جا بجا ملتے ہیں

ؔلہ یعنی اب یہ سلسلہ بند ہو گیا ۔

ؔلہ یہ شبہ پہلی مجلس میں وارد کیا جا چکا ہے ۔ جس کا مسکت جواب یہاں دیا گیا ہے ۔

ؔلہ قطف الجواھر فی احوال الجواھر ۔

◎

دعوتِ پنجم

○

اب پانچویں دعوت شروع ہوتی ہے۔

داعی بتاتا ہے کہ:

ہر امام صامت کے ساتھ بارہ نقیب اور انصار، مقربان خاص ہوتے ہیں۔ یہ "حجت" کہلاتے ہیں۔

ان کی تعداد بارہ ہے جیسے:

: ——— سال کے بارہ مہینے ہوتے ہیں

: ——— آسمان کے بارہ برج ہیں۔

: ——— اللہ تعالے نے جسم انسان کو زمین کے مثل پیدا کیا ہے

: ——— اور چار انگلیاں مانند جزائر ہیں۔ ہر انگلی میں تین پور ہیں۔ اس طرح چار انگلیوں میں بارہ پور ہوئے۔ یہ اشارہ ہے بارہ حجج (حجت کی جمع) کی طرف

: ——— اور انگوٹھا کہ ساری ہتھیلی اس کی تابع ہے۔ اس میں (انگوٹھے میں) صرف دو پور ہوتے ہیں ——— یہ اشارہ ہے اس امر کی طرف کہ امام اور وصی باہم جدا نہیں ہیں۔

: ——— اسی طرح ریڑھ کی ہڈی (پشت) بارہ گرہوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ ———

——— یہ بارہ گرہیں، بارہ حجتوں کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

: گردن میں سات گرہیں ہیں۔ وہ پشت سے خالی ہے

یہ اشارہ ہے نطقا اور ان کے جانشین ائمہ حق کی طرف ! ——— جیسے چہرۂ انسان م

سات شگاف ہیں۔ یہ بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں [1]

اس تقریر کو داعی خوب کھول کر اور پھیلا کر بیان کرتا ہے اور جب اچھی طرح اپنا دعو

اور اپنی دلیل مدعو کے خاطر نشین کر چکتا ہے۔ تب چھٹی دعوت کا اہتمام ہوتا ہے [2]

حواشی اور ماخذ

[1] گویا نطقا، صامتین اور ائمہ کی تفصیل یہ قرار پائی ہے:۔

① ناطق رسول ہوتا ہے۔

② صامت وصی کہلاتا ہے۔

③ ہر ناطق اور وصی کے ساتھ سات حدود یا حجج یا ائمہ ہوتے ہیں۔ ان میں سے ساتواں ہوتا ہے۔ جس سے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔

۱ ۔ اس اعتبار سے حضرت آدمؑ کے صامت یا وصی شیث تھے۔ پھر چھ امام یا حدود یا حج ہوئے۔ ساتواں امام ناطق بن گیا۔ یعنی حضرت نوح علیہ السلام۔

۲ ۔ حضرت نوح علیہ السلام کے وصی یا صامت حضرت سامؑ تھے۔ پھر چھ امام گزرے۔ ساتوی امام حضرت ابراہیمؑ تھے جو تیسرے ناطق بن گئے۔

۳ ۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جب ناطق کے مرتبے پر فائز ہوئے تو ان کے وصی یا صامت حضرت اسمٰعیل ذبیح اللہ ہوئے۔ اس کے بعد چھ امام نمودار ہوئے۔ ساتویں امام یا حجت حضرت موسےٰ علیہ السلام تھے جو چوتھے ناطق بن گئے۔

۴ ۔ حضرت موسےٰ علیہ السلام کے صامت یا وصی حضرت ھارون علیہ السلام تھے۔ اس کے بعد چھ امام ظہور پذیر ہوئے۔ ساتویں حضرت عیسےٰ علیہ السلام تھے۔ جو پانچویں ناطق بنے۔

۵ ۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے وصی یا صامت حضرت شمعون علیہ السلام تھے۔ اس کے بعد چھ امام آئے

ساتویں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ آپ ناطق ششم بنے۔

۶۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصی یا صامت حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے۔ پھر چھ امام آئے ساتویں امام محمد بن اسماعیل تھے۔ یہی ناطق ہفتم بنے۔

۷۔ ساتویں ناطق محمد بن اسماعیل ہیں۔ جن پر علم اولین و آخرین تمام ہوگیا۔

تفصیل کے لیے کتب ذیل سے رجوع کیا جائے۔

(۱) سرائر النطقاء (از جعفر بن منصور الیمن)

(۲) اسرار النطقاء (از جعفر بن منصور الیمن)

(۳) الفترات والقرانات (از جعفر بن منصور الیمن)

(۴) الادعیہ السبعہ للایام السبعہ (از امام جعفر۔ خلیفہ فاطمی)

(۵) تاویل الزکوٰۃ (از جعفر بن منصور الیمن)

یہ جملہ کتب اسماعیلی اکابر کی لکھی ہوئی ہیں۔ جو مخطوطات کی صورت میں ہیں۔ زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوئیں۔ لیکن مختلف کتابوں میں جستہ جستہ ان کے حوالے ملتے ہیں۔ دار الفکر عربی (مصر) نے ان میں سے کئی کتابوں اور اس طرح کی دوسری کتابوں کی طبع و اشاعت کا بیڑا عرصہ ہوا، اٹھایا تھا لیکن کچھ پتہ نہیں۔ یہ کام اتمام تک پہنچا یا نہیں؟

۸۔ تلاشا الجواهر فی احوال البواهر۔

◎

دعوتِ ششم

گزشتہ پانچ دعوتوں کے مقابلے میں یہ چھٹی دعوت اپنے موثرات و معنویات کے لحاظ سے زیادہ اہم ہے اور دعوت نہم تک موثرات و معنویات کی اہمیت میں غیر معمولی اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔

مدعو کے سامنے چھٹی مجلس میں داعی جن امور پر بحث و گفتگو کرتا ہے۔ وہ حسب ذیل ہیں:

① آیات قرآنی کی تفسیر بہ انداز خاص اور بہ اسلوب متفرقہ۔
② آئین نماز پر گفت گو۔
③ روزہ، اس کا فلسفہ، اور اس کی حقیقت پر اظہار خیال۔
④ زکوٰۃ اور اس کی ضرورت و افادیت اور اہمیت و قطعیت پر تقریر
⑤ خمس ـــــ خمس کی شرعی حیثیت اور اس کے مسائل و مصالح۔
⑥ حج، فلسفۂ حج اور مسائل حج۔
⑦ جہاد اور اس کی ضرورت، صورت، کیفیت، حیثیت اور شرائط
⑧ طہارت، اس کی تعریف اور اس کے اصول اور ضابطے۔
⑨ چند مزید امور مختلفہ شرعیہ اور ان کے متعدد پہلوؤں پر بحث و تمحیص ہے

ان مباحث و مسائل پر اور ان کے اطراف و جہات اور نکات پر سیر حاصل تقریر کے

بعد داعی اصل نقطۂ بحث پر آتا ہے اور اس بات سے مطمئن ہوجانے کے بعد کہ مدعو پورے طور پر معتقد اور قائل ہو چکا ہے۔ کہتا ہے۔

"امور و مسائل شرعیہ کا یہ محض ظاہری پہلو ہے۔ یعنی امور شرعیہ بہ سبیل رمز و کنایہ وضع کیے گئے، جن کا ظاہری مقصد سیاست و مصلحت ہے کہ لوگ فتنہ و فساد میں مشغول نہ ہوجائیں۔ نظم و ضبط قائم رکھیں اور حکومت کے راستے میں سنگِ گراں بن کر حائل نہ ہوں"!

اور ظاہر کی یہ تشریح کرنے کے بعد وہ باطن کا پردہ اٹھاتا ہے اور مدعو کو بتاتا ہے کہ:۔

① وضو کا باطنی مفہوم حب امام ہے۔

② تیمم کا باطنی پہلو یہ ہے کہ امام کی غیبت کے زمانے میں "حجت" ؑ سے رہنمائی حاصل کی جائے۔

③ اصطلاح احتلام کا باطن عبارت ہے افشاء رازسے۔ ایسے شخص کے سامنے افشائے راز کر دینا جو نہ اپنا ہم مذہب ہو نہ مقصود جس کی ہدایت ہو۔

④ صوم کا باطنی مطلب یہ ہے کہ اسرار امام کی حفاظت کی جائے اور ان سے متعلق دوسروں کے سامنے لب کشائی نہ کی جائے۔

⑤ زنا کا جو باطن ہے وہ یہ ہے کہ دین کے رموز و اسرار عوام کے سامنے فاش کر دیئے جائیں۔

⑥ غسل کا باطنی مفہوم ہے، تجدید عہد و پیماں۔

⑦ زکوٰۃ کا ظاہر تو یہ ہے کہ فاضل آمدنی میں سے ایک مقررہ رقم حکومت کو ٹیکس کی صورت میں دے دی جائے۔ اور باطنی مقصد یہ ہے کہ امور دین پر بصیرت حاصل کرکے نفس کو ہر قسم کی آلائشوں سے پاک اور طاہر کر دیا جائے۔

⑧ نماز باجماعت کا حقیقی اور باطنی مطلب یہ ہے کہ امام معصوم کی اقتدا کی جائے

⑨ کعبۂ مکرمہ سے مراد آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

⑩ باب سے مراد حضرت علی المرتضےٰ کرم اللہ وجہہ ہیں۔

(۱۱) اسی طرح صفا سے مراد نبی علیہ السلام ہیں

(۱۲) اور مروہ سے مراد وصی نبی علیہ السلام ہیں۔

(۱۳) اور موسم حج میں حاجیوں کی زبان پر جو "لبیک" کا لفظ جاری ہوتا ہے اس کا باطنی مفہوم دعوتِ امام کو قبول کر لینے کا اعلان و اعتراف ہے۔

(۱۴) سات بار خانۂ کعبہ کا جو طواف کیا جاتا ہے اس سے دراصل مراد ائمہ سبعہ سے محبت رکھنا اور ان کی اطاعت کرنا ہے

(۱۵) جنت کا اصل مفہوم یہ ہے کہ بدن کو تکلیفات لاطائل سے بچایا جائے۔

(۱۶) اور دوزخ کا اصل مطلب یہ ہے کہ بدن کو ہدفِ تکالیف بنایا جائے [۳]

غرض ظاہر شرع کے باطن کو اور امور شرعیہ کے رمز کو داعی اس طرح اور ایسے پیرائے میں بیان کرتا ہے کہ مدعو کے دل میں ایک ایک بات اترتی اور گھر کرتی چلی جاتی ہے۔

باطنی کے اسرار و رموز مدعو کو اچھی طرح سمجھا چکنے اور پورے طور پر اسے قائل و معتقد بنا چکنے کے بعد داعی فلسفے کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اور "اقوال افلاطون و ارسطاطالیس و فیثاغورث بر زبان می آورد۔" [۴]

دعوتِ ششم کا سلسلہ عرصۂ دراز تک جاری رہتا ہے اور جب داعی کو اچھی طرح یقین ہو جاتا ہے کہ مدعو کے دل میں اس کے بیان کردہ اسرار و رموز راسخ اور مستقر ہو گئے ہیں تب مجلس ہفتم شروع ہوتی ہے [۵]

حواشی اور ماخذ

[۱] اس سلسلے میں اسماعیلی حضرات کی چند کتابیں خاص طور پر توجہ طلب ہیں۔

(۱) تاویل دعائم الاسلام ——— اس کی طبع و اشاعت کا اہتمام دارالفکر العربی (مصر) نے کیا ہے۔ لیکن یہ کتاب طبع ہو کر منظرِ عام پر آچکی ہے یا نہیں۔ اس بارے میں قطعیت کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ اس کتاب کے اقتباسات بعض دوسری متعلقہ کتابوں میں ملتے ہیں۔

(۲) اساس التاویل ——— اس کتاب کی بھی وہی حیثیت ہے جو پہلی کی ہے۔ دونوں

کتابیں قاضی القضاۃ نعمان بن محمد (متوفی ۳۶۳ھ) کی جودتِ فکر اور زورِ قلم کا نتیجہ ہیں۔

ٹہ • محبت • (مجمع حج) پر گفتگو گذشتہ صفحات میں ہو چکی ہے۔

ٹہ مذاہب الاسلام (نجم الغنی) مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ ۱۹۲۴ء صفحہ ۲۶۵

یہ کتاب اگرچہ ایک ایسے شخص کی تصنیف ہے جو تعصب کی آلودگی سے اپنے قلم کو محفوظ نہیں رکھ سکا۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس نے بڑی محنت کے ساتھ اپنی کتاب میں ضروری مواد فراہم کر دیا ہے جس سے دوسرے تحقیق کرنے والے کافی فائدہ اٹھا سکتے ہیں

ٹہ قلائد الجواہر فی احوال الجواہر

ٹہ تاریخ فاطمیین مصر صفحہ ۵۰۹۔

◎

ساتویں دعوت

صاحب ولایت و ناصر شریعت کے لیے ناگزیر اور لابدی ہے کہ وہ اپنا ایک ندیم اور مددگار
رکھے تاکہ اس کی گفتار وہ دوسروں تک پہنچا سکے۔ اور ان کی خاطر کو مطمئن کر دے۔ اور واضح کرے
کہ ان ہر دو میں سے ایک تو اصل (جڑ) ہے اور دوسرا صدر۔ یہ گویا اشارہ ہے عالم سفلی سے عالم
علوی کی طرف۔

مثلاً اصلی ترتیب و قوام نظام میں مدبر عالم ایک ہے

اور جو کچھ اس اول سے بلا سبب اور بلا واسطہ صادر ہوا اور بہ وجود آیا ہے اسے صادر
اول یا عقل ثانی کہتے ہیں اور یہ اشارہ ہے کلام الٰہی کی طرف:

انما امرہ اذا اراد شیئا ان یقول لہ کن فیکون [2]

اور یہ اشارہ ہے بہ سوئے اول فی الرتبہ۔

اور ثانی فی الرتبہ کے بارے میں دوسری آیت ہے:

انا کل شیٔ خلقناہ بقدر [3]

اور حدیث سے بھی یہ ثابت ہے کہ اللہ تبارک و تعالےٰ نے سب سے پہلے جو چیز پیدا
کی وہ قلم ہے:

ان اللہ اول ما خلق القلم فقال للقلم اکتب، فکتب فی اللوح ما ھو کائن [4]

یہ کلام درحقیقت کلام فلاسفہ سے ماخوذ ہے جو کہتے ہیں کہ واحد سے واحد ہی کا صدور ہو سکتا ہے، صوفیہ نے اس مفہوم کو لے کر اپنی کتابوں میں بسط و تفصیل سے عبارت کو زیادہ ملمع کرکے پھیلایا ہے جب یہ دعوت مدعو کے ذہن نشین ہو جاتی ہے تو آٹھویں دعوت کا آغاز ہوتا ہے [5]

مصادر و حواشی

[1] قلائد الجواہر فی احوال البواہر" میں صدر کا لفظ آیا ہے۔ لیکن مولوی نجم الغنی نے "نائب" کا لفظ اپنی کتاب "مذاہب الاسلام" میں لکھا ہے اور ڈاکٹر زاہد حسین نے بھی تاریخ فاطمیین مصر میں "نائب" لکھا ہے، مولوی نجم الغنی اور ڈاکٹر زاہد حسین کی عبارت الفاظ و معانی بڑی حد تک ایک ہے جس سے تبادر ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے یہ بات مولوی نجم الغنی سے لی ہے۔ کیونکہ زمانی اعتبار سے مولوی نجم الغنی کی کتاب کو ڈاکٹر صاحب کی کتاب پر تقدم حاصل ہے

[2] پارہ ۲۳ آیت ۸۲ سورہ یٰسٓ

ترجمۂ آیت: "اس (خدا) کی شان تو یہ ہے کہ جب کسی چیز کو (عالم وجود میں لانا) چاہتا ہے۔ تو فرماتا "ہو جا" اور وہ ہو جاتی ہے۔"

[3] پارہ ۲۷، آیت ۴۹، سورہ "القمر"

ترجمۂ آیت: "بے شک ہم نے ہر چیز ایک مقرر انداز سے پیدا کی ہے۔"

[4] ترجمۂ آیت: "اللہ تعالٰے نے سب سے پہلے جو چیز پیدا کی وہ قلم ہے (پھر) اس سے فرمایا "لکھ" اس نے جو کچھ (تا قیامت واقع) ہونے والا ہے، لکھ ڈالا۔"

[5] قلائد الجواہر فی احوال البواہر" قلمی نسخہ

○

آٹھویں دعوت

یہ آٹھویں دعوت گذشتہ ساری دعوتوں کے اعتقاد پر موقوف ہے اور جب داعی دیکھ
ہے کہ مدعو نے ان دعوتوں کو اپنا جسزو ایمان بنالیا ہے تو وہ آٹھویں دعوت کا آغاز کرتا ہے۔ او
کہتا ہے :۔

یہ دونوں ذاتیں کہ ان میں سے ایک مدبّر وجود ہے اور دوسری صادر [1] ان کی حیثیت م
اور لاحق کی ہے [2] جیسے علّت کو معلول پر تقدم حاصل ہوتا ہے [3] اور یہ جملہ اعیان و اشخاص جو
دیکھتے ہو صادر [4] ہی سے پیدا ہوئی ہیں [5] اور اسی ترتیب سے جو معروف و معلوم ہے، وجود
آئی ہیں۔

معہذا سابق [6] کے لیے کوئی نام و نشان، اور صفت و بیان نہیں ہے۔ لہٰذا سے الفاظ کے ذریعہ
معتقد کیا جا سکتا ہے۔ پس خدا نہ موجود ہے نہ معدوم، نہ عالم ہے نہ جاہل، نہ قادر ہے نہ عاجز۔ یہی حال
دوسرے صفات کا بھی ہے۔ کیونکہ اگر خدا کو موصوف بصفات مان لیا جائے تو لازم آئے گا کہ وہ
کے ساتھ مشارکت رکھتا ہے۔ حالانکہ یہ محال اور باطل ہے۔ لیکن اگر ان صفات کی اس کی ذات
سے نفی کر دی جائے تو تعطیل [7] لازم آتی ہے اور یہ بھی محال اور باطل ہے۔ لہٰذا وہ [8] نہ قدیم
ہے [9] وہ نہ محدث [10] لہٰذا جو قدیم ہے وہ اس کا امر و کلمہ ہے اور جو کچھ محدث [11] ہے وہ اس کی مخلوق اور فطرت ہے

اور جب مدعو کے ذہن میں یہ بات جم جاتی ہے تو داعی اس کے ذہن کو اس طرف منتقل کرتا ہے کہ یہ دوسرو [11] اعمال ذات میں مدعو وجود کی اتباع کرتا ہے۔ اور آخرکار اس کے مرتبے پر پہنچ جاتا ہے۔ یعنی لاحق، سابق کے برابر ہو جاتا ہے۔ اسی طرح صامت [12] اپنے اعمال میں اس درجہ پیروی رسول کرتا ہے کہ اپنے مرتبے سے اونچا ہو کر ناطق [13] کے مرتبے تک پہنچ جاتا ہے۔ اسی طرح داعی ترقی کرتے کرتے وصی کے درجے تک پہنچ جاتا ہے۔ اور دونوں میں کسی طرح کا تفاوت اور فرق و امتیاز نہیں رہ جاتا۔ غرضکہ امور عالم اپنے اکوار و ادوار میں اسی طرح جاری رہتے ہیں

اور جب یہ مضمون داعی کے خیال میں مدعو ذہن نشین کر لیتا ہے تب وہ اس سے کہتا ہے:

معجزہ نبی صادق ناطق صرف یہی ہے اور اس کے سوا کچھ بھی نہیں ہے کہ سیاست جو منتظم اور مربوط ہو جائے۔ اور اسی سیاست و نظم کی مصلحت کو مد نظر رکھتے ہوئے نبی زمین و آسمان اور جواہر و اعراض کے حقائق سے باخبر کرتا ہے۔ کبھی ایسے انداز رمز آسا میں کہ علماء تک اس کا ادراک نہیں کر پاتے۔ اور کبھی بایں طور کہ عامی شخص بھی بہ آسانی سمجھ لیتا ہے غرض اسی طور پر شریعت نبی کا انتظام جاری رہتا ہے۔ اور لوگ اس کے تابع رہتے ہیں۔

اس کے بعد داعی بتاتا ہے کہ:

قیامت، قرآن، ثواب، عقاب، ان چیزوں کے معنیٰ کچھ اور ہی ہیں۔ یہ معنیٰ فہم عامہ سے کہیں بالا اور برتر ہیں کہ ذہن عام اس طرف جا ہی نہیں سکتا اور یہ معنے اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ کواکب و سیارات و ثوابت کے دورے ختم ہو کر پھر شروع ہو جاتے ہیں۔ ورنہ سیارات اور ثوابت میں کسی طرح کون و فساد [14] واقع نہیں ہو سکتا۔ ان کے طبائع برباد ہونے سے مادرا ہیں لہٰذا قیامت کے معنے یہ نہیں ہیں کہ اجرام علوی فنا ہو جائیں گے۔

داعی کی یہ تقریر ویسی ہی ہوتی ہے جیسا کہ فلاسفہ نے ان مسائل کو اپنی کتابوں میں بسط و تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے [15]

اسی تقریر میں داعی یہ بھی بتاتا ہے کہ:

اللہ تعالیٰ نے عالم علوی میں اول اپنے امر کے ذریعہ عقل کامل کو کہ جسے عقل کلی، عقل اول،

اول موجود اور صادر اول بھی کہتے ہیں، پیدا فرمایا۔ پھر نفس میں عقل سے کمال حاصل کرنے کا ذوق پیدا ہوا۔ لہٰذا نقصان سے کمال کی جانب نفس نے حرکت کی۔ اور حرکت بغیر آلے کے پوری نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لیے اجرامِ فلکی پیدا ہوئے۔ اسی نفس نے دوری حرکت کرائی اور اجرامِ فلکی کے حرکات کے باعث عناصرِ اربعہ کے طبائع پیدا ہوئے اور عناصرِ اربعہ کے باعث مرکبات یعنی جمادات، نباتات اور حیوانات عالم وجود میں آئے۔

ان سب مرکبات میں افضل اور اشرف انسان ہے اس لیے کہ اس میں انوارِ قدسی حاصل کرنے کی صلاحیت اور استعداد پائی جاتی ہے اور یہ عالم علوی سے تعلق رکھتا ہے اور عالم علوی میں عقل کامل کلی اور نفس ناقص کلی موجود ہیں۔ جنہوں نے کائنات کو ایجاد کیا ہے۔ لہٰذا عالم سفلی میں بھی ایسی عقل کلی کا ہونا ضروری تھا۔ جو نجات کا وسیلہ بن سکے۔

اصطلاح شرع میں اسی عقل کامل سفلی کو رسول کہتے ہیں اور رسول کی نیابت میں ایک نفس ناقص نجات کے طریقے بیان کرنے کے لیے ہوتا ہے جسے اس باب خاص میں رسول کے ساتھ وہ نسبت ہوتی ہے جو نفس کلیہ کو عقل کلی کے ساتھ کائنات کے ایجاد کرنے سے متعلق ہوتی ہے۔

یہ نفس ناقص جو رسول کا نائب ہوتا ہے، امام اور رسول کا وصی کہلاتا ہے۔

جس طرح افلاک کو عقلِ اول اور نفس اولی حرکت دیتے ہیں۔ اسی طرح رسول اور امام انسانوں کے نفوس کو نجات کی طرف حرکت دیتے ہیں۔ [۶]

معادر اور حواشی

[۱] یعنی مدبر وجود سے صادر ہوئی ہے۔

[۲] مقدم اور مؤخر۔

[۳] یعنی علت مدبر وجود ہے اور معلول صادر۔

[۴] یعنی معلول

[۵] فلاسفۂ یونان کا مذہب بھی یہی ہے۔ جواہر عالم اجسام کی علت / جواہر عالم عقل ہے۔

[۶] یعنی مرید جو (حدا)

۱ے تفصیل۔ "بیکار کردن کسے را"۔

۲ے خدائے تعالےٰ۔

۳ے غیر فنا پذیر

۴ے فنا پذیر

Compare the Gospel according to St Jhon ۵ے
chapter I, verses 1-2

1— The begining was the Word & The Word,
was with God, & The Word was God,
2— The Same was in the begining with
God

انجیل کا پورا حوالہ "تاج العقائد" الجواہر نے اپنے حاشیہ میں دیا ہے

۷ے یعنی صادر

۸ے یعنی امام اور وصی

۹ے یعنی نبی اور رسول

۱۰ے "کون و فساد" فلسفہ کی اصطلاح ہے۔ یعنی تعمیر اور تخریب۔

۱۱ے تاج العقائد المواہر فی احوال الجواہر (قلمی نسخہ)

۱۲ے مذاہب الاسلام۔ صفحہ ۲۶۹۔

○

نویں دعوت

○

یہ دعوت گویا ان دعوات ماسبق کا نتیجہ ہے جو داعی نفس مدعو میں راسخ کر چکا ہے۔ داعی جب اپنی جگہ پر مطمئن ہو جاتا ہے کہ مدعو میں آگے قدم بڑھانے کی استعداد اور کشف سرّ و بیان رمز کی صلاحیت قبول پیدا ہو چکی ہے۔ تو اسے وہ کتب فلسفہ کے مطالعے اور غور و تعمق کی ہدایت کرتا ہے اور پھر وہ علم طبیعیات اور علوم الٰہیہ کا شوق مطالعہ پیدا کرتا ہے جب داعی دیکھ لیتا ہے کہ اب مدعو علم فلسفہ پر کافی دسترس حاصل کر چکا ہے اور ان علوم کی گہرائی تک پہنچ چکا ہے تو وہ رُخِ حقیقت سے پردہ اٹھاتا ہے اور اسے باور کراتا ہے کہ

(۱) میں نے اب تک اصول و حدوث سے متعلق جو کچھ کہا اور بتایا ہے در اصل یہ سب رموز و اشارات ہیں بہ جانب معانی و مبادی اور انقلاب جواہر کے۔

(۲) وحی کی حقیقت تصفیۂ نفس کے سوا کچھ اور نہیں ہے

(۳) کہ نبی یہ ہے کہ جو بات اس کے دل میں القا ہوتی ہے اور اسے بہتر اور برتر معلوم ہوتی ہے۔ اسے وہ لوگوں کے سامنے بیان کر دیتا ہے اور اس کی تعبیر کلام الٰہی سے کرتا ہے

(۴) اس طرح اپنی شریعت کو حسب مصلحت و سیاست عام منظم اور مرتب کرتا ہے

(۵) اور جب کارِ نبی اور کارِ نبوت بیت ســـلار پایا تو پھر اس پر عمل کرنا اور اس کے حرفِ حــــرف کی تعمیل کرنا واجب نہ ٹھہرا۔ البتہ مصالحِ بزرگ کی رعایت اور مصلحت کے مطابق جو باتیں ہوں ان پر عمل کرنا اور ان کی پوری پوری تعمیل کرنا لازمی اور لابدی ہے

(۶) اور جو عارف کے مرتبے پر فائز ہو اس کے لیے تو کسی حکمِ شریعت پر عمل در آمد ضروری اور واجب نہیں۔ اس کے لیے تو بس معرفت ہی کافی ہے کیونکہ اصل الاصول صرف معرفت ہی ہے۔ جملہ کمالات کی انتہا اسی کی طرف ہے۔

(۷) اور مشروعات کی صورت میں جملہ اثقال اور قیود گراں بار جو ہیں، یہ صرف نامعرفت شناس لوگوں کے لیے ہیں جو احوال اعراض و اسباب سے یکسر ناواقف ہیں

(۸) اور منجملہ معرفت ایک یہ ہے کہ انبیاء ناطق جو صاحبِ شرائع ہوتے ہیں صرف سیاستِ عام کے واسطے مبعوث ہوتے ہیں۔

(۹) اور انبیاء حکمت خاصہ اصحابِ فلسفہ ہیں

(۱۰) وجودِ امام، عالمِ روحانی سے تعلق رکھتا ہے۔ کتبِ معارف کے سلسلے میں جو ریاضت اور مشقت کی جاتی ہے یہ بیداری اور مطالعہ کرنے والے کو امام تک پہنچا دیتی ہے۔

(۱۱) اور ظہورِ امام کا مطلب یہ ہے کہ داعیوں کے داعیوں سے احکام و اوامر اور ممنوعات و نواہی کا اظہار ہو یعنی امر و نہی کا ظہور بعینہٖ امام کا ظہور ہے[۳]

مصادر و حواشی

[۱] مبادی، جمع مبداء، بمعنی جائے آغاز کار شدن۔

[۲] جوہر چیزے کہ بذاتِ خود قائم باشد۔ ایں ضد عرض است بذاتِ خود قائم نباشد بلکہ قیام عرض بوسیلہ جوہر باشد۔ چناں کہ لون و نقش و رنگ در جامہ؛

[۳] یہاں سے ذیلِ دعوت تک کی جو تفصیلات اوپر گذری ہیں انہیں میں نے اس لیے درج کر دیا ہے کو تنزل

کتابوں میں ان کا ذکر وثوق اور دعوائے صحت واستناد کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ ورنہ امر واقعہ یہ ہے کہ ان تفسیر کو میں صحیح تسلیم نہیں کرتا بلکہ ایک حد تک انہیں گراہ کن خیال کرتا ہوں۔

اسماعیلیوں کی بہت بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ وہ ہمیشہ "ہجوم میں تنہا" رہے۔

کوئی اسلامی فرقہ ایسا نہیں ہے جس نے ان کی مزعومہ اور مبینہ خامیاں، کمزوریاں اور گمراہیاں بیان کرنے میں لعن و قلم کی ساری قوت نہ صرف کر دی ہو۔ لیکن اسماعیلیوں کی طرف سے جواب صرف سکوت کے ذریعہ دیا جاتا رہا۔

یہ امر واقعہ ہے کہ اسماعیلیوں کا نظام ایک مخصوص دعوت پر قائم ہے لیکن وہ نظام کیا ہے یہ بات اسماعیلیوں کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اور وہ اپنے اس نظام دعوت کو پردہ خفا میں رکھنے پر مُصر ہیں۔

چونکہ اس سلسلے میں خود اسماعیلیوں کی معتبر اور مستند کتابیں دستیاب نہیں ہوتیں۔ لہذا مورخین و محققین نے ظن و تخمین سے کام لے کر طبع آزمائی شروع کر دی اور چوں کہ دوسرے اسلامی فرقے اسماعیلیوں کے خلاف تھے۔ لہذا الزامات کو واقعہ بنا کر پیش کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا گیا۔ اور ایسی باتیں ان کے سر منڈھ دی گئی ہیں جن کا درایت کی رو سے حقیقت اور واقعہ سے کوئی تعلق ہو ہی نہیں سکتا۔

مثلاً کار نبوت اور کار شریعت کے بارے میں جو باتیں دعوت نہم میں لکھی گئی ہیں وہ قطعاً بے بنیاد معلوم ہوتی ہیں۔ اس لیے کہ جب "عارف" قیود شریعت سے آزاد ہے تو امام کو تو اور زیادہ ہونا چاہیے مگر ہم دیکھتے ہیں کہ آج بھی ان کا امام اپنی مذہبیت، دینداری، تقویٰ ظاہر شریعت کی پوری پوری پابندی کا پیکر نظر آتا ہے۔ ملا طاہر سیف الدین کے بدترین دشمن بھی اس سے انکار نہیں کر سکتے۔

لطف کی بات یہ ہے کہ ڈاکٹر زاھد حسین نے جو کتاب "تاریخ فاطمیین مصر" لکھی ہے وہ خود تمام تر ——— کم از کم جہاں تک دعوات تسعہ کا تعلق ہے ——— ایک کہانی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی ڈاکٹر صاحب مرحوم کا علمی پایہ تو یہ تھا کہ ڈاکٹر تھے اور اسماعیلی جماعت سے تعلق رکھتے تھے۔

ظاہر ہے وہ دعوے کر سکتے تھے "مستند ہے میرا فرمایا ہوا"۔ کیونکہ وہ گھر کے بھیدی بھی تھے۔

لیکن گھر کے بھیدی ہونے کے باوجود یہ دعوے نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ اسماعیلیوں سے متعلق کتب متداول کے علاوہ ——— چند قلمی نسخوں سے قطع نظر کر کے ——— ان کا مبلغ علم بھی وہی ہے جو دوسرے غیر اسماعیلیوں کا چونکہ ڈاکٹر صاحب بعد میں اپنے آبائی فرقہ سے منحرف ہو گئے تھے اس لیے انہیں اور زیادہ

چھان بین کرکے قلم اٹھانا چاہیے تھا۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ ان کا مبلغ علم بھی اس سلسلے میں دوسرے اسماعیلیوں سے زیادہ نہیں ہے۔ موصوف نے اپنی کتاب میں اسماعیلیوں کی دعوات تسعہ کا جو ذکر کیا ہے وہ حرف بحرف مولوی نجم الغنی کی کتاب "مذاہب الاسلام" سے منقول اور ماخوذ ہے اور مولوی نجم الغنی مرحوم ظاہر ہے غیر اسماعیلی اور اسماعیلیوں کے مخالف ہونے کے باعث اسی مواد سے کام لے سکتے تھے جو عام طور پر مل سکتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے قلائد الجواھر فی احوال الجواہر کو سامنے رکھ کر اسماعیلیوں کے بارے میں تحقیق کا کمال دکھایا ہے اور قلائد الجواہر فی احوال الجواھر کے مصنف بھی اسماعیلی نہیں تھے۔ لہٰذا انہوں بھی جو کچھ لکھا وہ ادھر ادھر سے خوشہ چینی کرکے لکھا۔

خود مولوی نجم الغنی کو بھی اس حقیقت کا احساس تھا۔ چنانچہ اپنی کتاب میں انہوں نے اعتراف بھی کر لیا ہے۔

رہا اسماعیلی مذہب کا فلسفہ سے متاثر ہونا تو بے شک یہ ایک حقیقت ہے اور اخوان الصفا وغیرہ اس حقیقت کا ناقابل تردید ثبوت ہیں۔ لیکن کسی اسلامی فرقے کا فلسفے سے متاثر ہونا۔ کوئی نئی چیز نہیں ہے معتزلہ، اشاعرہ اور ماتریدیہ وغیرہ کی جو کتابیں ملتی ہیں۔ اور دوسرے مصنفین، محققین اور مورخین نے جو معلومات ان کے بارے میں فراہم کیے ہیں۔ انہیں پیش نظر رکھنے سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہوجاتی ہے کہ کئی اسلامی فرقے ایسے تھے جو اپنے فلسفے میں اسماعیلیوں سے کہیں زیادہ آگے بڑھے ہوئے ہیں لیکن ان کے بارے میں اتنا تند اور تلخ لٹریچر نہیں ملتا جتنا اسماعیلیوں کے بارے میں ملتا ہے۔

اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ مذکورہ فرقے فنا ہو چکے ہیں۔ اس کے برعکس اسماعیلی موجود ہیں اور اپنے پورے نظام دعوت اور نظام دین کے ساتھ موجود ہیں۔ مخالف نقطۂ نظر رکھنے والوں کو یہ بات کھٹکتی ہے اور جب انہیں کوئی ٹھوس چیز نہیں ملتی تھی داستان سرائی شروع کر دیتے ہیں ——— چوں

ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند!

بہرحال اسماعیلیوں کے نظام دعوت کے سلسلے میں حقائق سے لکھنے والوں نے کم کام لیا ہے ظنیات پر زیادہ بھروسہ کیا ہے۔

○

میثاق

○

داعی، مدعوے جو عہد لیتا ہے اس کا ذکر بھی ضروری ہے

سب سے پہلے وہ مدعوے کہتا ہے:

"میں تم پر خدا کے اس عہد (میثاق) نیز رسول، پیغمبروں اور فرشتوں کا وہ ذمہ واجب کرتا ہوں جو خدا نے ان سے لیا ہے کہ تم نے جو کچھ میرے بارے میں یا اس شہر کے اندر جو امام ہمام جلوہ فرما ہیں ان کے بارے میں، یا ان کے اہل بیت اور اصحاب کے بارے میں وہ تمام باتیں پوشیدہ رکھو گے جو سن چکے ہو، یا آئندہ سنو گے، جو تمہیں معلوم ہیں یا آئندہ چل کر معلوم ہوں گی۔ اور ان باتوں سے کوئی بات خواہ وہ بڑی ہو یا چھوٹی ظاہر اور افشا نہیں کرو گے۔ بجز ان باتوں کے جن کے لیے میں نے تمہیں اجازت دے دی ہے کہ انہیں کہہ سکتے ہو۔ اسی طرح صاحب امر نے تمہیں جس بات کی اجازت دے دی ہے اسے فاش کر سکتے ہو

تم پر لازم ہے کہ میرا حکم مانو اور کسی طرح کی تعدی اور سرکشی کا مظاہرہ نہ کرو، نہ عہد سے قبل نہ عہد کے بعد۔

تمہیں چاہیے کہ اس بات کی گواہی دو کہ:

(۱) خدائے تعالیٰ پاک ہے اور ایک ہے۔
(۲) محمدؐ خدا کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔
(۳) بہشت و دوزخ اور موت اور بعث حق ہیں۔
(۴) قیامت آنے والی ہے۔ اس کے آنے میں کوئی شک نہیں
(۵) جو قبر میں جائے گا۔ خدا اُسے ضرور اٹھائے گا۔
(۶) نماز ہمیشہ وقت پہ پڑھو۔
(۷) ماہ رمضان کے روزے رکھو۔
(۸) (اگر استطاعت ہو تو) حج (ضرور) کرو۔
(۹) خدا کے راستے میں جہاد کرو۔ بالکل اسی طرح جیسے خدا نے حکم دیا ہے۔
(۱۰) اللہ تعالیٰ نے جو امور فرض کیے ہیں اور رسولؐ کی سنت سے جو ثابت ہے۔ ان سب کے ظاہر اور باطن دونوں پر عمل کرو گے۔
(۱۱) اولیاء اللہ کو دوست رکھو گے۔
(۱۲) دشمنانِ خدا سے دشمنی رکھو گے۔
(۱۳) انبیاء اور رسل جو کچھ خدا کی طرف سے لائے ہیں وہ انہی شرائط سے وابستہ ہے

اس کے بعد داعی، مدعو سے کہتا ہے۔

"میں تمہیں قسم دیتا ہوں۔ اور تم سے عہد لیتا ہوں کہ ان تمام امور پر وفاداری کے ساتھ استوار رہو گے۔ ان سے نہ سرتابی کرو گے۔ نہ ان کے خلاف جاؤ گے۔ اس عہد کو نہ کمزور ہونے دو گے۔ نہ اس سے منحرف ہو گے۔"

اس کے بعد داعی مدعو سے کہتا ہے۔

"کہو، ہاں؟"

اس کے جواب میں مدعو کہتا ہے۔

"نعم!"

اس مرحلے سے فارغ ہونے کے بعد داعی پھر مدعو کو مخاطب کرتا ہے اور اس سے گویا ہوتا ہے
"میں نے تم سے جو عہد و میثاق لیا ہے، یہ ایک امانت ہے۔ اس میں خیانت نہ کرنا
جن باتوں کا میں تم سے عہد لے چکا ہوں۔ انہیں کبھی اور کسی حالت میں بھی فاش نہ کرنا
نہ میری زندگی میں، نہ میرے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد، نہ غیظ و غضب
کی حالت میں، نہ رضا اور رغبت کی صورت میں، نہ خوف و شدت کے وقت، نہ
طمع اور لالچ کے ماتحت۔

میں تم سے عہد و میثاق لیتا ہوں اس بات کا کہ اللہ سے اور اس کے ولی سے
خیانت کا ارتکاب نہیں کرو گے۔ نہ میرے بھائیوں سے، نہ میرے دوستوں سے
نہ کسی ایسے شخص سے جس کے بارے میں تمہیں علم ہو کہ میرا ہے یا مجھ سے متعلق ہے کسی
طرح کی خیانت کرو گے، نہ مال کی امید میں نہ معمولی تمنا کی لگن میں۔

اور اگر تم نے ایسا کیا!

اگر تم نے جانتے بوجھتے ہماری مخالفت کی، تو تم خدا سے اور اس کے ملائکہ
مقربین سے بری ہو جاؤ گے۔ وہ خدا جو خالق آسمان و زمین ہے اور جس نے تمہیں بھی
پیدا کیا ہے، تمہیں پھلنے پھولنے کے مواقع دیئے ہیں۔ تم پر شفقت اور رحمت کا نزول
کیا ہے۔

اگر تم نے ایسا کیا تو تم رسولان ذی شان اور ملائکہ مقربین سے بری ہو جاؤ گے
کروبیاں، روحانیاں، کلماتِ تامات، سبع مثانی، قرآن و توریت و زبور
و انجیل و ذکر حکیم اور ہر وہ دین جو خدا کو پسندیدہ ہے۔ ہر وہ عہد جس سے اللہ راضی
اور خوشنود ہے ان سب سے تم بری ہو جاؤ گے۔

تم بارگاہِ خداوندی سے خارج ہو جاؤ گے۔

تم گروہِ اولیاء سے جدا ہو جاؤ گے۔

بہت جلد خدا تمہیں ذلیل اور رسوا کرے گا، تم سے انتقام لے گا اور تمہیں
عقوبت اور تعزیر کا سزاوار بنا دے گا۔

تم جہنم میں پھینک دیئے جاؤ گے جہاں رحمت کا گزر نہیں۔

تم اللہ تعالیٰ کی رحمت اور شفقت سے دور ہو جاؤ گے۔

تم پر خدا کی طرف سے وہ لعنت ہو گی جو اس نے ابلیس پر کی تھی۔ کہ اس پر جنت حرام کر دی اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کدۂ جہنم بنا دیا جہاں آگ کے شعلے بھڑک رہے ہیں۔

جو عہد تم کر چکے ہو اگر اس کے ذرا بھی خلاف کیا تو قیامت کے دن خدا سے اس حالت میں ملو گے کہ وہ تم پر برہم ہو گا اور وہ برہمی ایسی ہو گی کہ اگر پا برہنہ تیس حج کر ڈالو تو ایک بھی قبول نہ ہو گا۔

اگر تم نے مخالفت کی تو جو کچھ تمہاری ملکیت میں ہو گا وہ سب صدقہ فقراء بن جائے گا جس سے ذرا بھی اجر و منفعت کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

اگر تم نے مخالفت کی تو تمہارے سارے غلام راہ خدا میں آزاد ہو جاویں گے۔

اگر تم نے مخالفت کی تو تمہاری بیویوں پر طلاق پڑ جائے گی۔ نہ تمہیں رجعت کا حق ہو گا نہ خیار کا۔ تمہاری آل اولاد، مال و زر، اسباب و املاک، تمہاری جملہ حلال چیزیں حرام ہو جائیں گی۔

میں تم سے تمہارے امام کی طرف سے عہد لیتا اور قسم دیتا ہوں اور تم عہد کرتے ہو اور قسم کھاتے ہو کہ اگر تمہاری نیت یا عقد یا ضمیر تمہارے عہد و میثاق کے خلاف ہو تو اس عہد کی از اول تا آخر تم پر تجدید لازم آئے گی۔ اللہ تبارک و تعالیٰ تم سے سوا پابندی میثاق اور وفائے عہد کے کسی اور چیز کا جویا نہیں نہ کسی اور چیز کو وہ تم سے قبول کر سکتا ہے۔

اس کے بعد پھر داعی مدعو سے کہتا ہے:

کہو: ہاں!

اور وہ جواب میں کہتا ہے:

"نعم —!" لہ ، کہ

مصادر و حواشی

لہ اسی طرح کے میثاق جو کسی خلفاء کی بوقت بیعت لیا کرتے تھے۔ لہٰذا یہ جدت صرف اسماعیلیوں کی ہی نہیں ہے۔

۲ اس میثاق سے دعوتِ نجم کے مندرجات کی پر زور تردید ہوتی ہے۔ کیونکہ اس میں بھی
ساقۃ ظاہر کی تعمیل بھی ایک شرط ہے اور فرائض الٰہی و سنتِ رسول کی پابندی بھی شرط لازم
۳ تلائد الجواہر فی احوال الجواہر (قلمی نسخہ)

تاویل

اسماعیلیوں کی دعوت اور مدارج دعوت پر گزشتہ صفحات میں گفتگو ہو چکی ہے۔ اس دعوت میں سب سے زیادہ جس چیز سے کام لیا جاتا ہے۔ یعنی تاویل، اس کا مختصر ذکر بھی کر دیا جائے۔ تو بہتر ہے اسماعیلی حضرات کے ہاں اہم ترین اصول یہ ہے کہ ہر ظاہر کا ایک باطن ہوتا ہے۔ ہر تنزیل کی ایک تاویل ہوتی ہے۔ اور ان حقائق کا علم صرف امام کو یا اس کے واسطے سے دوسرے خواص کو ہوتا ہے۔

لیکن یہ تاویل یوں ہی حسب مرضی نہیں ہوتی۔ اس کے کچھ حدود اور شرائط ہیں۔ اور ان حدود و شرائط کی بجا آوری امام اور داعی پر واجب ہے۔ ہم دیکھتے ہیں وہ لوگ جو اس فرقے سے کسی سبب کے ماتحت قطع تعلق کر چکے ہیں یا یہ فرقہ ان سے ترک موالات کر چکا ہے۔ اپنی کتابوں میں مختلف اور متعدد اسماعیلی مسائل سے اختلاف رکھنے اور اس کا برملا اظہار کرنے کے باوجود اسے مانتے اور دوسروں کو بتاتے ہیں کہ تاویل یوں ہی اندھا دھند نہیں ہو سکتی۔ اس کے لیے جو حدود اور شرائط معین ہیں۔ ان پر عمل کرنا۔ اور انہیں پیش نظر رکھنا ضروری اور ناگزیر امر ہے

تاویل کرنے والے داعیوں کو جو ہدایتیں کی گئی ہیں۔ وہ یہ ہیں۔

(۱) داعی کو چاہیے کہ تاویل اس حدود سے متجاوز نہ ہو۔ یعنی جس طرح اس نے سنا ہے اسی طرح دوسروں کو بتائے اور اس میں کسی طرح رد و بدل اور تغیر نہ کرے ورنہ دین میں خلل پڑ جائے گا۔

(۲) نیز یہ امر ملحوظ رہے کہ تاویل اس طرح نہ کی جائے کہ سننے والا (سامع) معرفت باطن کو کافی سمجھ

کہ ظاہری شریعت کے احکام کو معطل قرار دے اور حرام کو حلال سمجھ لے اور ظاہر کو اس کے
ہی سے ساقط کر دے۔ چنانچہ جب بعض لوگوں نے یہ سنا کہ جنت موت اور ظاہر و تقلید سے
تو انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ جنت و جہنم یہی ہیں۔ ان کے سوا کوئی جنت و جہنم نہیں ہے۔ اور بعض
جب یہ معلوم ہوا کہ اعمال شریعت کے مثولات درحرت کے حدود دیے ہیں۔ تو انہوں نے
مان کر ظاہری اعمال ترک کر دیے۔ دوسری صدی کے نصف اول کے دو بڑے داعی مغیرہ
ابوخطاب جب اس راز سے واقف ہو گئے کہ شراب کا باطن "فلاں حد ہے" تو انہوں نے
سے پرہیز کر کے شراب کو حلال سمجھ لیا۔ قاضی نعمان بن محمدؒ نے اس خطرے سے بہت ڈرایا
مجلس کے آخر میں بار بار ہدایت کی ہے کہ باطن کی معرفت کے ساتھ ظاہر پر عمل بھی ضروری ہے

علم باطن یا علم تاویل کے بارے میں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اسماعیلی حضرات کے نزدیک
زمانے میں تنزیل یا ظاہر شریعت کی تعلیم و تربیت کے لیے ایک نبی مبعوث ہوتا ہے جو
کے اوضاع یعنی نماز اور وضو اور دوسرے شعائر و فرائض اور واجبات کی تعلیم دیتا ہے۔
نبی کو ناطق اور اس کے وصی کو "صامت" کہتے ہیں۔

نبی اپنے خاص اور معتمد اتباع میں سے کسی ایک کو اپنا وصی مقرر کرتا ہے۔ یہ وصی باطن
یعنی علم تاویل کا رمز آشنا ہوتا ہے۔ اس وصی کو اللہ تعالیٰ کی مرضی اور اشارے سے نبی یہ
سونپتا ہے۔ وصی کے لیے کئی اصطلاحی نام ہیں۔ صامت، اساس اور سوس
صامت کے معنی ہیں خاموش رہنے والا۔ چونکہ یہ ظاہر شریعت کے بارے میں خاموش رہتا
ہے۔ اس لیے صامت کہلاتا ہے اور نبی چونکہ اس کی تعلیم دیتا ہے اس لیے اسے ناطق کہا جاتا ہے
وصی جن لوگوں کو اہل اور سزاوار سمجھتا ہے ان سے رازداری کا عہد لے کر
شریعت کے اسرار و رموز ان پر منکشف کر دیتا ہے۔
ناطق یعنی نبی جب اس دنیا سے رخصت ہونے لگتا ہے تو اس کا سارا علم وصی کی طرف
منتقل ہو جاتا ہے۔

ظاہر کے باطن کے لیے صرف ایک لفظ "تاویل" ہی نہیں ہے۔ اسے باطن، رمز، حقیقت اور حکمت کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں۔

تاویل کا علم، نبی سے وصی کو، اس سے ائمہ کو ملتا ہے۔ یہ وہ ہستیاں ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالےٰ ارشاد فرماتا ہے:

لا یعلم تاویلہ الا اللّٰہ والراسخون فی العلم [۸]

اس سے مراد ائمہ اہل بیت نبوی ہیں

قرآن مجید میں اللہ تبارک و تعالےٰ ارشاد فرماتا ہے:۔

واتینا ابراھیم الکتاب والحکمۃ [۹]

"حکمت" سے مراد تاویل کا علم ہے۔

"تاویل اللہ تعالےٰ کا وہ علم ہے جو مخزون ہے [۱۰]

ظاہر کی مثال ایک خواب کی سی ہے اور باطن اس خواب کی تعبیر ہے۔ تاویل پھل ہے اور تنزیل چھلکا۔

ظاہر میں اختلاف، تناقض اور کجی ہے۔

ظاہر علم کثیف ہے۔

ظاہر تقلید محض ہے۔ بلا دلیل۔

تاویل کے سلسلے میں ایک بات اور بھی پیش نظر رہنی چاہیے۔

یہ ضروری نہیں ہے کہ تاویل صرف ایک ہی معنی میں منحصر ہو۔ اس میں اختلاف ہو سکتا ہے۔ تاویل مخاطب کے فہم و ادراک کے مطابق کی جاتی ہے جیسا کہ حضرت امام جعفر صادقؑ سے ثابت ہے [۱۱]

نیز تاویل وقت اور عصر کے لحاظ سے بھی تغیر پذیر ہو سکتی ہے [۱۲]

تاویل کی حقیقت، ہیئت اور طرز و اسلوب کو سمجھ لینے کے بعد ضروری ہے کہ ظاہر و باطن یا مثل و ممثول، یا تاویل کی چند مثالیں بھی پیش نظر رہیں۔ یہ مثالیں حکیم ناصر خسرو کی "وجہ دین" اور دوسری اسماعیلی کتب میں بکثرت موجود ہیں۔ ہم ذیل میں صرف چند پر اکتفا کرتے ہیں۔

۱ــــ وضو

وضو سے مراد ہے۔ نفس کو آلودگی سے پاک کرنا

یا دعوت کے اضداد ہے سے اظہار براءت کرنا۔

یا حضرت علیؑ کا اقرار کرنا۔ کیونکہ وضو اور علی ہر ایک میں تین حرف ہیں۔

۲ــــ احداث وضو

احداث وضو سے نفس کی نجاستیں مراد ہیں۔ یعنی نفاق۔ شرک، کفر۔

۳ــــ نماز

نماز سے مراد ہے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اقرار کرنا۔ کیونکہ صلوٰۃ اور محمد ہر ایک میں چار حروف ہیں۔

۴ــــ قبلہ رخ

قبلے کی طرف رخ کرنا۔ یعنی امام کی طرف متوجہ ہونا۔

۵ــــ رمضان

شریعت کے باطنی حکم کو اہل ظاہر سے پوشیدہ رکھنا۔

۶ــــ ادائی زکات

استاد کا شاگرد کو علم عطا کرنا۔ تعلیم دینا۔ پڑھانا۔

۷ــــ نصاب زکواۃ

ناطق[۱۳] کا اساس[۱۴] کو اپنے علم کے چالیسویں حصے کی تعلیم دینا[۱۵]

۸ــــ کعبہ

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم۔

۹ــــــــ **بابِ کعبہ**

حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ

۱۰ــــــــ **تلبیہ**

تلبیہ یعنی لبیک کہنا جو ہر حاجی کی زبان پر زمانۂ حج میں جاری ہوتا ہے۔ اس سے مطلب ہے امام کی دعوت کا جواب دیا صواب دینا۔

۱۱ــــــــ **صفا و مروہ**

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ

۱۲ــــــــ **غلافِ کعبہ**

شریعت کے باطن کو ظاہر سے ڈھانکنا۔

غرض یہ ہے تاویل - اور اس کی تعریف و حقیقت حضرات اسماعیلیہ کے ہاں ۔[16]

مصادر اور حواشی

[1] ان کا شمار اکابر فقہاء اسماعیلیہ میں ہوتا ہے۔

[2] یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اسماعیلیوں کے بارے میں یہ جو مشہور ہے کہ انہوں نے ہر چیز مباح کردی ہے، عوام کو حلال کردیا ہے۔ فرائض ساقط کر دیے ہیں اور شریعت معطل کر دی ہے غلط ہے۔

[3] افتتاح الدعوۃ ص ۳۶

[4] خاموش۔

[5] جز

[6] جز

[7] رازداری کا عہد اس لیے لیا جاتا ہے کہ ایسی باتیں عام نہ ہونے پائیں جو عوام کی فہم سے بالاتر ہیں۔ اور ان سے ان کے مبتلائے فسق و فجور و معصیت ہو جانے کا اندیشہ ہے۔

[8] یعنی اللہ تعالٰی اور راسخین علم کے سوا۔ اس کی تاویل کوئی اور نہیں جانتا۔

[9] ہم نے ابراہیم کو کتاب اور حکمت دی۔

۱۰ اساس التاویل (بحوالہ ہمارا اسماعیلی مذہب ص ۳۹۷ طبع حیدرآباد دکن)

۱۱ ہمارا اسماعیلی مذہب ص ۳۹۷

۱۲ المجالس المؤیدیہ ج ۵ ص ۹۰

۱۳ نبی

۱۴ وصی

۱۵ اس سے ثابت ہوا کہ وصی نبی سے بڑھ کر نہیں ہے جیسا کہ بعض کہتے ہیں

۱۶ تاویل بہرحال کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو صرف شیعوں یا اسماعیلیوں ہی کے ہاں پائی جاتی ہے اہل السنت کے علماء و فقہا بھی اس کے قائل ہیں۔ اور ثبوت میں یہ آیۃ قرآنی پیش کرتے ہیں۔

وذروا ظاهر الاثم وباطنه

اسی طرح دابۃ الارض کے سلسلے میں بھی جو تاویلیں کی گئی ہیں۔ ان سے تفاسیر کے صفحات بھرے پڑے ہیں ایک حدیث بھی ——— جس کی صحت کے بارے میں مجھے وثوق نہیں ——— پیش کی جاتی ہے کہ ——— ما من آیۃ الا ولها ظاهر و باطن۔

یعنی قرآنی شریعت کی کوئی آیت ایسی نہیں ہے جس کا ایک ظاہر اور ایک باطن نہ ہو صوفیاء کے ہاں بھی بکثرت تاویل کی مثالیں ملتی ہیں بلکہ اگر کہا جائے کہ نظام تصوف تاویل ہی کی بنیاد پر قائم ہے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ "ابوالطیب" سے کئی سربرآوردہ صوفیا "فنس ارادہ" مدد لیتے رہے ہیں۔

وہ شعرا جنہوں نے علم اور تصوف اور روحانیت کی تبلیغ شاعری کے ذریعہ کی ہے تاویل کے بغیر ایک قدم نہیں چل سکتے۔ مولانا رومؒ کی مثنوی، جامیؒ کے اشعار۔ اقبالؒ کا کلام اس حقیقت کا شاہد ہے۔ حافظؒ کی تو ساری شاعری "تاویل" ہی تاویل ہے۔

معراج سے متعلق سرمد کا یہ شعر بھی سن لیجیے:۔

ملا گوید کہ برشد احمدؐ بہ فلک
سرمد گوید فلک بہ احمدؐ در شد

○

مسئلہ امامت

○

اہلِ ظاہر اور اہلِ نص و توقیف کا اختلاف

اسماعیلی فرقہ صرف وقت اور جذبات کا پیدا کیا ہوا نہیں ہے۔ جیسے بہت سے دوسرے فرقے ہیں نظر آتے ہیں۔ یہ فرقہ ایک مخصوص نظامِ فکر کا نتیجہ ہے۔ اور یہ نظامِ فکر حد درجہ مدلل، مبرہن اور اتنا زیادہ قلب کے بجائے دماغ کو اپیل کرنے والا ہے کہ حیرت اس پر نہیں ہوتی کہ ہر چہار طرف سے زغۂ اعداء میں محصور ہونے کے باوجود یہ ابھرا اور پھلا پھولا کیسے؟ حیرت اس پر ہوتی ہے کہ اس کی دعوت محدود کیوں رہی؟

ذیل میں ہم مسئلہ امامت پر اس فرقے کے افکار و نظریات کا جائزہ لیتے ہیں۔ جس سے اندازہ ہوگا کہ نقل کے علاوہ عقل کی رو سے بھی کتنے پُر زور انداز میں انہوں نے اپنا نقطۂ نظر دوسروں کے سامنے رکھا ہے۔ دلائل ایسے قاطع اور ساطع دیے ہیں کہ ایک معمولی آدمی کے لیے نہ ان کا جواب دینا آسان ہے نہ توڑ کرنا ممکن ہے نہ دفاع اور مزاحمت سہل ہے۔ مثال کے طور پر مسئلہ امامت کو لیجیے۔

جہاں تک آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کا تعلق ہے۔ وہ ہر قسم کی بحث و نزاع سے بالاتر ہے۔ اہل السنت امامیہ اسماعیلی اور دوسرے تمام فرقے اس بات پر

متفق ہیں کہ آپ نبیؐ تھے۔ اللہ تعالے نے آپؐ کو منصب رسالت تفویض کیا تھا۔ آپؐ کی نبوت پر ایمان لانا اور اس کی شہادت دینا اسلام کی شرطِ اول ہے۔ اگر کوئی شخص اللہ تعالے کی واحدانیت پر تو ایمان رکھتا ہے۔ مگر آپؐ کی رسالت کا قائل نہیں۔ وہ مسلمان نہیں۔

آپؐ کے بعد، امیر یا خلیفہ یا امام کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ یہ بھی کوئی نزاعی یا اختلافی مسئلہ نہیں ہے۔ تمام فرقے اس کے قائل ہیں کہ ایک خلیفۃ الرسولؐ یا امیر المومنین۔ یا امام المسلمین ہونا چاہیئے کہ بغیر اس کے نظم ملت استوار نہیں ہو سکتا۔

اہل السنت اور فرقہ اسماعیلیہ، بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں اصحاب ظاہر اور اصحابِ نص و توقیف کے مابین اختلاف پیدا ہوتا ہے۔ جو فروعی نہیں بلکہ اساسی اور اصولی ہے یہ اختلاف ہے۔ قیام امامت سے متعلق۔

اصحاب ظاہر یعنی اہل السنت کے نزدیک اگر کسی شخص پر امت کی اکثریت اتفاق کرکے اس کی بیعت کرلے تو انعقاد امامت ہو گیا۔ اب وہ شخص خلیفۃ الرسولؐ اور امیر المؤمنین ہے۔ ساری امت پر اس کی اطاعت اس وقت تک فرض ہے۔ جب تک وہ احکام اسلامی کے خلاف کوئی حکم صادر نہ کرے۔ لا طاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق۔ اس کے علاوہ فروعی اور اجتہادی مسائل میں اس کی رائے سب پر بالا ہوگی۔ وہ غلطی کرسکتا ہے۔ ارتکاب گناہ کرسکتا ہے۔ غلط رائے قائم کرسکتا ہے۔ غلط فیصلہ دے سکتا ہے۔ ان خطاؤں اور لغزشوں کے باوجود اس کی امامت اور خلافت قائم رہے گی۔ اس کے خلاف خروج نہیں کیا جاسکتا۔ بغاوت نہیں کی جاسکتی۔ اسے معزول نہیں کیا جاسکتا۔

لیکن اسماعیلیوں کے ہاں اس طرح انعقاد امامت نہیں ہو سکتا۔ ان کے ہاں پیش رو کو پس رو کے لیے نص کرنی چاہیے۔ بغیر نص کے کوئی شخص مرتبہ امامت پر فائز نہیں ہو سکتا اور پیش رو یہ نص اپنی ذاتی پسند اور مرضی سے نہیں کرسکتا۔ وہ اسی کے لیے نص کرے گا۔ جس کے لیے اللہ تعالے کا حکم ہے۔ چنانچہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے لیے شروع شروع میں تو صرف بطور ایماء نص کرتے رہے جسے یہ حضرات "نصوص خفیہ" کہتے ہیں۔ اس کے بعد غدیر خم کے مقام پر آپؐ نے باقاعدہ اور علی الاعلان

نص فرمائی - جو نص جلی کہلاتی ہے۔

امامت از روئے نص اس لیے لازمی ہے کہ یہ دین کا ایک اہم ترین رکن ہے۔ اسی پر دین کا نظام استوار ہونا اور ملت کی فلاح منحصر ہوتی ہے۔ نبیؐ سے بڑھ کر نہ امت کا کوئی خیر خواہ ہو سکتا ہے نہ اس سے بڑھ کر مصالح عمومی کا کوئی اور رمز شناس ہو سکتا ہے امت کی فلاح و صلاح کی ذمہ داری تمام تر اسی پر ہوتی ہے۔ وہ امت کو افراتفری کی حالت میں چھوڑ کر دنیا سے رخصت نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ دنیا سے رخصت ہونے سے پہلے اس اہم ترین مسئلہ کو حل کرتا جائے۔ اور کسی شخص کو نص کر کے اپنا وصی اور جانشین بناتا جائے۔ اور یہ شخص ایسا ہونا چاہیے جو پاک نہاد اور پاک جامہ ہو اس سے چھوٹا بڑا کوئی گناہ نہ سرزد ہوا ہو۔ نہ اس سے ارتکاب گناہ کا امکان ہو۔

یہی وہ جگہ ہے جہاں سے اہل ظاہر اور اصحاب نص کا راستہ جدا ہو جاتا ہے۔ اہل ظاہر اصحاب نص کے اس نظریہ کو تسلیم نہیں کرتے ان کے نزدیک کسی شخص پر امت کی اکثریت کا اتفاق انعقاد امامت کیلیے کافی ہے[۲] وہ کہتے ہیں۔ امامت رکن اسلام ہوتی تو اسے بھی اسی طرح واضح اور مشرح ہونا چاہیے تھا۔ جیسے دوسرے ارکان اسلام یعنی نماز وغیرہ ہیں۔ تاکہ کسی طرح کی غلط فہمی، اشتباہ یا اختلاف کا سوال ہی نہ پیدا ہوتا۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ امامت کی ضرورت، امام کی عصمت اور شرائط امامت سے متعلق مختصراً ان دلائل کا ذکر بھی کر دیا جائے۔ جنہیں مشہور اسماعیلی داعی اور شیخ کبیر علامہ حمید الدینؒ نے اپنی کتاب "المصابیح فی اثبات الامامت" میں بیان فرمایا ہے[۳]

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور حکمت بالغہ کے ساتھ ہوا تھا۔ یہ آپؐ کی ذمہ داری تھی کہ اپنے عہد کے اور بعد میں آنے والی نسلوں تک یہ حکمت پہنچائیں بعد میں آنے والی نسلیں آپؐ کے عہد میں موجود نہیں تھیں۔ یعنی وہ لوگ جو قیامت

تک پیدا ہوتے رہیں گے۔ ایک وقت میں جمع نہیں ہو سکتے تھے۔ لہذا رسولؐ پر واجب آیا کہ بعد میں آنے والے لوگوں کے لیے۔ اور ان لوگوں کے لیے جو اس کے زمانے میں تھے۔ مگر سعادت قبول دعوت سے محروم تھے۔ دنیا سے رخصت ہوتے وقت کسی کو اپنا قائم مقام بنا جائے۔ جو اس فریضہ کو ادا کرتا رہے۔ جسے آپ اپنا قائم مقام کر گئے۔ پس وہی امام ہے۔

○———

شریعت، سنت، رسوم اور اقوال میں کمی بیا دتی ہو سکتی ہے۔ تبدیلی بھی ناممکن نہیں۔ تغیر بھی ہو سکتا ہے۔ ان سب چیزوں کو واقع نہ ہونے دینے کے لئے اور شریعت وسنت کی حفاظت کے لیے، رسولؐ پر واجب ہے کہ کسی کو یہ کارِ حفاظت سونپ جائے۔ پس وہ امام ہی ہے جو اس کارِ حفاظت پر امرالٰہی اور نصِ نبوی سے مامور ہوتا ہے۔

○———

تنزیل اور شریعت کی زبان عربی ہے۔ ایک ایک لفظ کے متعدد معنی اور مفہوم ہو سکتے ہیں۔ اس تعدد معنی کے باعث ہر شخص اپنی فہم و دانش اور عقل و ادراک کے مطابق جس لفظ کی جو تاویل چاہے کرسکتا ہے۔ اور اپنے نقطۂ نظر کی دلیل قرآن ہی سے لا سکتا ہے۔ مثلاً اللہ تبارک وتعالےٰ کا ارشاد ہے

مامنعك ان تسجد لما خلقت بيدى شه

اس آیت میں اللہ تعالےٰ نے اپنے لیے "ید" یعنی ہاتھ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ معتزلہ کے نزدیک "ید" سے مراد قوت وطاقت ہے۔ بعض کے نزدیک اس کا مطلب نعمت ہے۔ ایسے لوگ بھی ہیں جو "ید" کے معنی اسی ہاتھ کے لیتے ہیں جو ہمارا آپ کا ہے۔ یعنی جسم کا ایک جزو۔

از روئے لغت ان میں سے کوئی معنی بھی غلط نہیں ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس کثرتِ معنی میں ایک ہی معنی ایسا ہو سکتا ہے جو درست اور چسپاں ہو

اس معنیٰ کی نشان دہی اور اس کا آخری فیصلہ صرف معرّف ہی کر سکتا ہے
اور یہی وہ معرف ہے جو امام وقت ہے۔

گروہِ انسانی میں ہر شخص کا مزاج جدا، طبیعت الگ، خصلت دوسری، آرزو اور خواہش کچھ اور، حوادث نامعلوم۔ اور کثیر کوئی نرم ہے۔ کوئی گرم۔ کوئی جلد باز ہے، کوئی سست کار۔ کسی پر غیظ و غضب کا غلبہ ہے۔ کوئی متحمل اور نرم خو۔

پس رسول کے لیے لازم ہے کہ دنیا سے رخصت ہوتے وقت کسی امام کو نامزد کر دے جو ان سب باتوں سے بالا ہو۔ جو صحیح ترین فیصلہ کرے۔ جیسا کہ اللہ تبارک و تعالے ارشاد فرماتا ہے:

فلا و ربك لا يؤمنون حتى يحكموك فيما شجر
بينهم، ثم لا يجدوا في انفسهم حرجا مما قضيت
ويسلموا تسليما ۝

اور کھلی ہوئی بات ہے آپ م کے بعد بھی ایک ایسا حاکم ہونا چاہیئے اور وہ حاکم صرف امام ہی ہو سکتا ہے۔

اللہ تبارک و تعالے کی ایک صفت یہ ہے کہ وہ عادل ہے!

جو لوگ آپؐ کے زمانے میں تھے۔ ان کے لیے آپؐ کا وجود باعث رحمت تھا۔ وہ آپؐ کے سبب غضب خداوندی۔ قہر اور عذاب الٰہی سے محفوظ و مامون تھے۔ جیسا کہ اللہ تعالے نے فرمایا ہے:

وما ارسلناك الا رحمة للعالمين - وما كان
الله ليعذبهم وانت فيهم وما كان الله
معذبهم وهم يستغفرون ۝

پس امام ہی کی وہ ہستی ہے جو اپنے عہد کے لوگوں کے لیے باعث رحمت ہے اور عذاب خداوندی سے انہیں بچاتی ہے۔

○———

آپؐ کی ذات ایک وسیلہ تھی جو انہیں خدا تک پہنچاتی تھی۔ جیسا کہ اللہ سبحانہ وتعالےٰ ارشاد ہے:

یایھاالذین آمنوا اتقوا اللہ وابتغوا الیہ الوسیلہ وجاھدوا فی سبیلہ لعلکم تفلحون ؎

اب یہ "وسیلہ" ذات امام ہی ہو سکتی ہے۔

○———

اپنی امت کے خطاکاروں کے لیے بارگاہ الٰہی میں آپؐ استغفار بھی فرمایا کرتے تھے۔ جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے۔

وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ ولو انھم اذ ظلموا انفسھم جاؤک فاستغفروا اللہ واستغفر لھم الرسول لوجدوا اللہ توابا رحیما ؎

آپؐ چونکہ قیامت تک کے لیے خدا کے آخری رسول ہیں۔ لہٰذا آپؐ کے بعد جو نسلیں آئیں گی۔ انہیں اس نعمت سے بہرہ ور ہونا چاہیے۔ جو آپؐ کے عہد کے لوگوں کو حاصل تھی۔ پس لازم ہوا کہ ہر زمانے میں نبی ہو کا ایک قائم مقام اندوسے نص موجود رہے۔ جو لوگوں کے لیے باعث رحمت ہو۔ ان کے لیے طالب مغفرت ہو۔ اور خدا تک پہنچنے کا وسیلہ اور ذریعہ ہو۔

ایسا شخص امام ہی ہو سکتا ہے۔

○———

قیامت تک جتنے لوگ بھی آئیں گے۔ آپؐ ان سب کے نبی ہیں۔ آپؐ کی دعوت، آپؐ کا پیام سب کے لیے ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :۔

ادع الی سبیل ربك بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ [10]

جب تک آپ اس دنیا میں رہے حکمت اور موعظت حسنہ کے ساتھ اپنے رب کی طرف لوگوں کو دعوت دیتے رہے ۔ لیکن ان لوگوں کے مقابلے میں جو وفات نبویؐ کے بعد سے قیامت تک آئیں گے ۔ آپؐ کے عہد کے لوگوں کی تعداد بہت ہی کم تھی ۔ تو کیا بعد میں آنے والی نسلیں ، جن کے افراد کی تعداد حد شمار سے خارج ہے ۔ حکمت اور موعظۃ حسنہ کی دعوت سے محروم رہ جائیں گے ؟ یہ بات عدل الٰہی کے منافی ہے ۔ ان آنے والے لوگوں کے لیے بھی ایک داعی کی ضرورت ہے جو انہیں حکمت اور موعظۃ حسنہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف بلائے اور ایسا داعی امامؑ کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا

ارشادِ ربانی ہے :۔

خذ من اموالھم صدقۃ تطھرھم وتزکیھم

وصل علیھم ان صلاتك سکن لھم [11]

آپؐ کے بعد وہ کون ہو سکتا ہے جو امت سے زکات لے اور زکات لے کر اسے گناہوں سے پاک و صاف کر دے ۔ امت کے لیے دعائے خیر کرے ۔ اور یہ دعائے خیر اس کے لیے مایۂ تسکین ہو ؟ ——— کیا امامؑ کے سوا کوئی اور بھی ؟

زشت کاروں اور عصیاں شعاروں کے لیے اللہ تعالیٰ نے حدیں (سزائیں) مقرر کی ہیں ۔ ان حدود کا اجراء صرف امام ہی کر سکتا ہے ۔ یا وہ شخص جسے اس نے کام پر مامور کیا ہو ۔ لوگوں سے غلطیاں ، خطائیں ، لغزشیں ہوتی ہی رہتی ہیں ۔ اور ان کی سزا بھی (حدود کے اندر بھی اور حدود سے ہٹ کر بھی) صلب [12] جلد [13] ، رجم [14] نفی [15] وغیرہ کی صورت میں دی جاتی ہے ۔

اور یہ کام صرف ایسا شخص ہی انجام دے سکتا ہے جو کامل بغیر جانبداری کیساتھ ہر طرح کے تعصبات اور جذبات سے بالا ہو کہ یہ کام انجام دینے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ یہ صلاحیت عام لوگوں میں نہیں پائی جا سکتی۔ صرف امام ہی میں پائی جا سکتی ہے۔ لہذا از روئے نص قیام امامت واجب آیا۔

—— ○

باہمی خرخشوں اور مناقشوں کے لیے اللہ تعالٰی نے حکم دیا ہے کہ لوگ نبی اکرمؐ کی طرف رجوع ہوں۔ ارشاد فرمایا ہے:۔

یاایھاالذین آمنوا اطیعوا اللہ واطیعواالرسول واولوالامر منکم، فان تنازعتم فی شیٔ فردوہ الی اللہ والرسول ان کنتم تومنون باللہ والیوم الآخر، [۵]

جب تک آپؐ اس دنیا میں رونق افروز تھے۔ آپؐ ہی سب کے مرجع تھے۔ آپؐ کے بعد بھی ایسے آدمی کی ضرورت ہے جس کی طرف اختلاف باہمی کی صورت میں لوگ رجوع ہوں۔ اور ایسا شخص امام ہی ہو سکتا ہے۔

—— ○

معاملات شریعت میں قیاس کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں۔ اللہ تعالٰی صاف الفاظ میں فرماتا ہے:۔

وما اختلفتم فیہ من شیٔ فحکمہ الی اللہ ورسولہ [۶]

یہ حکم قیامت تک کے لیے ہے خدا نے یہ نہیں کہا کہ جب تک رسالت مآب دنیا میں موجود ہیں وہ مرجع ہیں۔ ان کے بعد تم خود اپنے اختلافات کا فیصلہ کر لیا کرو یہ حکم قیامت تک کے لیے ہے کہ اختلاف کا فیصلہ حکم الٰہی و رسولؐ سے کیا جائے اور آپؐ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد صرف امام ہی فتویٰ دے سکتا ہے۔ اور اس کا فیصلہ آخری اور قطعی ہے۔

اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے :-

یوم ندعوا کل اناس بامامھم فمن اوتی
کتابہ بیمینہ فاولٰئک یقرؤن کتابھم
ولا یظلمون فتیلا

اس ارشادِ خداوندی سے لازم آیا کہ ہر زمانے میں لوگوں کا ایک امام ہونا چاہیے

اللہ تعالےٰ نے جو اطاعت واجب کی ہے - وہ ہے خدا کی اطاعت ، رسولؐ کی اطاعت اور اپنے اولوالامر کی اطاعت -

اولوالامر سے مراد ائمہ کرام ہیں

انسان کے اعمال پر جزا کا مرتب ہونا ضروری ہے - جس کے لیے ہر زمانے میں ترغیب اور ترہیب کی ضرورت ہے - جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تھی - یہ بات خدا کی شانِ عدل کے خلاف ہے کہ آپ کے بعد ترغیب و ترہیب کا سلسلہ یک قلم بند ہو جائے - یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا - اور اس کا جاری رکھنے والا امام ہوگا

یہ امام جس کا وجود ناگزیر ضروری ہے - اس منصب پر اسی وقت فائز ہو سکتا ہے کہ وہ معصوم ہو -

امام اگر معصوم نہ ہو تو ہو سکتا ہے - بعض احکام میں وہ صراطِ نبیؐ سے انحراف کر جائے جس کا نتیجہ ظلم اور افتراق بین المسلمین کی صورت میں رونما ہوگا -

پس ثابت ہوا کہ امام کی عصمت ، امت کی شیرازہ بندی اور اتحاد و اتفاق کے لیے لابدی اور ضروری ہے

معاملات و مسائل دین میں لوگ ظاہر ہے امام ہی کی طرف رجوع کریں گے۔ اگر امام معصوم نہ ہو تو اس سے غلطی اور خطا کا صدور ممکن ہے جو لوگوں کی گمراہی کا سبب ہوگی۔ او راکہ خود گم است کرا رہبری کند۔"

وہ امام ہی ہے جو حدود کا اجراء اور نفاذ کرتا ہے۔ اگر اس کے اعمال ایسے ہوں کہ خود اس پر حد واجب ٹھہرے تو وہ کیوں کر دوسروں پر حد جاری کر سکتا ہے۔ لہٰذا امام کو معصوم ہونا چاہیے کہ اس پر حد جاری ہونے کا سوال ہی نہ پیدا ہو۔ اگر وہ معصوم ہوگا تو اس سے ایسے افعال سرزد ہی نہیں ہو سکتے جو حد کو واجب کرتے ہیں۔

امام کی اطاعت کو قرآن میں اللہ اور رسول کی اطاعت کے بالکل ساتھ ساتھ بیان کیا ہے۔

اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولوالامر منکم

لہٰذا اگر امام کو معصوم نہ مانا جائے تو اس کا اتصال اللہ اور رسول کی اطاعت کے ساتھ ایسا ہی ہے۔ جیسے ٹاٹ میں مخمل کا پیوند۔ یا جیسے موتی کا اتصال جانوروں کی مینگنی سے۔ شریف کا اتصال کمینے سے۔ طاہر کا اتصال نجس سے۔

"قیامت تک کے لیے آپؐ کی رسالت قائم ہے۔ اور اپنے پیام رسالت کا پہنچانا آپؐ کا فریضہ ہے۔ آپؐ کے بعد اس امانت کا امین امام ہے۔ کیونکہ وہ آپؐ کا قائم مقام ہے اور امین کے لیے ضروری ہے کہ خیانت کا امکان اس میں نہ ہو۔ امام اگر معصوم ہوگا۔ تب ہی امکانِ خیانت اس سے خارج ہو سکتا ہے

کوئی شخص کسی شخص کا قائم مقام، وکیل یا نائب صرف اس کی مرضی ہی سے بن

سکتا ہے۔ امام اس دنیا میں رسولؐ کا قائم مقام اور نائب ہے۔ لہذا اس منصب پر وہ رسولؐ کے ایمان و نفس ہی سے فائز ہو سکتا ہے۔[۵] [۶] [۲۱]

منصب امامت، شرائط امامت اور عصمتِ امام سے متعلق جو تصریحات گزشتہ صفحات میں پیش کی گئی ہیں ان سے اتفاق یا اختلاف ایک الگ اور جداگانہ چیز ہے لیکن اس حقیقت سے کوئی فہیم شخص انکار نہیں کر سکتا۔ کہ اپنے نقطۂ نظر کے اثبات میں جو دلائل یہ فرقہ اپنے پاس رکھتا ہے انہیں کمزور اور بودا نہیں کہا جا سکتا۔ ان میں وزن ہے۔ اور انہیں ایسے سلجھے ہوئے انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ طبیعت ان سے اباء نہیں محسوس کرتی۔ دل چسپی محسوس کرتی ہے۔

مصادر و حواشی

[۱] خالق کی معصیت اگر ہوتی ہو تو مخلوق کی طاعت نہ کرنا چاہیے۔

[۲] مقدمہ ابن خلدون ص ۱۹۶

[۳] مقدمہ ابن خلدون ص ۲۱۰

[۴] نیز ملاحظہ ہو ملا محمد بن محمد نیشاپوری کی کتاب "اثبات الامامۃ"

[۵] ترجمہ:-

"تجھے اس بات سے کس چیز نے روکا ہے کہ جسے میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے پیدا کیا ہے۔ تو اسے سجدہ نہ کرے"۔ (پارہ سورت ۳۸۔ آیت ۷۵)

[۶] ترجمہ:-

"پس (اے محمدؐ) قسم ہے آپ کے پروردگار کی۔ جب یہ لوگ اپنے قضیے آپ سے فیصل نہ کرائیں۔ اور جو فیصلہ آپ کر دیں اسے جان و دل سے قبول نہ کریں۔ یہ ایمان سے ہرگز بہرہ ور نہیں ہو سکتے۔"

(پارہ سورت ۴ آیت ۶۵)

[۷] ترجمہ آیت

"ہم نے آپؐ کو (اے محمدؐ) تمام عالم کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ اور خدا ایسا نہیں کہ آپؐ ان لوگوں میں موجود ہوں اور وہ انہیں مبتلائے عذاب کر دے۔ نہ وہ ایسا ہے کہ جو لوگ استغفار کرتے ہوں انہیں مبتلائے عذاب کر دے۔ (سورۃ ۸ - آیت ۳۳)

۷ ترجمہ

"اے ایمان والو خدا سے ڈرو اور اس تک پہنچنے کے لیے وسیلہ تلاش کرتے رہو۔ اور اس کے راستے میں جہاد کرو تاکہ فلاح یاب ہو جاؤ۔" (سورت ۵ - آیت ۳۹)

۸ ترجمہ

اور جو رسول بھی ہم نے بھیجا اس سے ہمارا مقصد یہ تھا کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔ اور جب (اے محمدؐ) ان لوگوں نے آپؐ کی نافرمانی کی۔ اور اپنے اوپر (نافرمانی کر کے) ظلم کیا۔ اگر (اس وقت) یہ لوگ آپؐ کے پاس آتے اور استغفار کرتے اور (اے محمدؐ) آپؐ بھی ان کے لیے طلب مغفرت کرتے تو یہ دیکھ لیتے کہ اللہ بڑا ہی توبہ قبول کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔"

۹ ترجمہ:

(اے محمدؐ) اپنے رب کے راستے کی طرف لوگوں کو حکمت اور موعظہ حسنہ (دانش اور عمدہ نصیحت) کے ذریعہ بلایئے۔

۱۰ ترجمہ

"(اے محمدؐ) آپؐ ان کے مال سے زکات لیا کریں کہ زکات قبول کر کے آپؐ انہیں گناہوں سے پاک صاف کر دیتے ہیں۔ ان کے لیے دعائے خیر بھی کریں کیونکہ آپؐ کی دعا ان کے لیے باعث تسکین ہے۔"
(سورۃ ۹ آیت ۸۴)

۱۲ پھانسی۔

۱۳ سزائے تازیانہ۔

۱۴ سزائے سنگ ساری۔

۱۵ جلاوطنی کی سزا۔

۱۶ ترجمہ

"اے ایمان والو! اللہ کی اور رسولؐ کی اور جو تم میں سے صاحب حکومت ہوں۔ ان کی اطاعت کرو۔ اگر کسی معاملے میں تم آپس میں مختلف الرائے ہو تو۔ اللہ اور رسول ؐ کے حکم کی طرف رجوع کرو۔"

(سورت ۴۔ آیت ۶۲)

ثلہ ترجمہ

"اور جن امور میں تم آپس میں اختلاف رکھتے ہو۔ ان کا فیصلہ اللہ اور (اس کے) رسولؐ کے حکم پر موقوف) ہے

(سورۃ ۴۲ آیت ۸)

تلہ ترجمہ

"اس (قیامت کے) دن ہم سب لوگوں کو ان کے پیشواؤں سمیت طلب کریں گے جن کا نامۂ اعمال داہنے ہاتھ میں ہوگا۔ وہ (خوش خوش) اپنے نامۂ اعمال کو پڑھنے لگیں گے۔ ان پر ذرا بھی ظلم نہ ہوگا

(سورۃ ۱۷ آیت ۷۳)

بلہ ترجمہ آیت گزر چکا ہے

یہاں یہ بات پیش نظر رکھنی چاہیے کہ اسماعیلی "اولوالامر" سے حاکم وقت نہیں۔ بلکہ ائمۂ اہل بیت

نلہ المصابیح فی اثبات۔ الامامۃ مقالہ ۲۔ مصباح ۳

ثلہ اس آیت میں گویا ارشاد یہ فرمایا گیا ہے کہ قیامت کے دن سب لوگ اپنے اپنے عہد کے امام کے ساتھ خدا کے حضور میں حاضر ہوں گے۔ اور ان کا نامۂ اعمال ان کے سامنے رکھ دیا جائے گا۔ جو لوگ نیک صفات اور نیکوکار رہے ہوں گے۔ وہ اسے پڑھ کر خوش ہوں گے۔ اور جنت میں داخل ہو جائیں گے جو بد سرشت اور زشت کار رہے ہوں گے۔ وہ جہنم میں دھکیل دیئے جائیں گے۔ ان میں سے جو مستحق سفارش ہوں گے۔ امام ان کی شفاعت اور سفارش حضور رب میں کرے گا۔

○

مقامِ امام

اسماعیلیوں کے نزدیک امام کی بیعت ضروری اور لازمی ہے۔ دلیل میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول حسب روایت امام جعفر صادقؒ پیش کرتے ہیں:۔

من مات ولم یعرف امام زمانه مات میتة جاهلیة [1]

امام جعفر صادق کا یہ قول بھی اپنے مسلک کی تائید میں پیش کرتے ہیں:۔

"زمانہ جاہلیت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک جاہلیت کفر، دوسری جاہلیت ضلال (گمراہی) وہ جاہلیت جسے جاہلیت کفر کہتے ہیں۔ آں حضرتؐ کی بعثت سے پہلے تھی اور وہ جاہلیت جسے جاہلیت ضلال کہتے ہیں اپنے عہد اور زمانے کے امام سے ناواقف ہونا ہے [2]

امام عصمت میں، خصائل میں، ہر چیز میں نبی کا مثل ہوتا ہے۔ البتہ وہ نبی نہیں ہوتا۔ جیسا کہ المصابیح [3] میں تحریر ہوتا ہے کہ:

ان علی بن ابی طالب کان جامعا لجمیع ما کان فی النبیؐ

من الفضائل الا الوحی الذی خص اللہ بہ بنبیہ -

یعنی حضرت علی بن ابی طالب ان تمام خصائل کے جامع تھے جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں پائے جاتے تھے سوا وحی کے - کہ اللہ تعالیٰ نے وحی کے لیے اپنے نبی کو خاص کر لیا تھا -

اس گفتگو کا حاصل یہ نکلا کہ امام نبوت سے قطع نظر باقی تمام امور میں رسول کے مانند ہوتا ہے - اسی لیے اسے معصوم مانا جاتا ہے اور اس کی اطاعت واجب ہے

اسماعیلی حضرات اس دعوے کی دلیل میں حدیث ذیل پیش کرتے ہیں :

علی منی بمنزلۃ ھارون من موسیٰ الا انہ لا نبی بعدی

یعنی علیؓ کو مجھ سے وہی نسبت ہے جو ہارونؑ کو موسیٰؑ سے تھی - مگر جس طرح میرے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے "

یہ حدیث تھوڑے سے لفظی رد و بدل کے بعد اہل السنت کے ہاں بھی مروی ہے - اہل السنت اس سے حضرت علیؓ کی بزرگی اور کرامت پر استدلال کرتے ہیں - اسماعیلی اسے حضرت علیؓ کی امامت کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں -

امامت کا تعلق سیاست مدن ، نظم مملکت ، تنظیم و تدبیر مملکت سے اتنا نہیں ہے - جتنا تزکیۂ قلب ، تصفیۂ روح اور تطہیر اخلاق سے ہے - اور یہ کام کثرت رائے سے نہیں انجام پا سکتا - یہ تو "ناز بخشِ خدائے بخشندہ" والا معاملہ ہے - یعنی امام کی تعیین نص سے ہوتی ہے اور نص مبنی ہوتی ہے ایمائے الٰہی پر - یعنی دوسرے الفاظ میں امام کا انتخاب عوام نہیں کر سکتے - جو صرف ظاہر سے آشنا ہوتے ہیں - یہ انتخاب صرف خدا ہی کر سکتا ہے - جو ظاہر و باطن دونوں سے واقف ہوتا ہے - انسان اپنے انتخاب میں غلطی کر سکتا ہے - لیکن خدا کا انتخاب غلط نہیں ہو سکتا -

نص سے مراد یہ ہے کہ پیش رو امام پس رو کے لیے اپنی وفات سے پہلے صاف اور غیر مبہم الفاظ میں اس امر کی تعیین کر دے تاکہ کسی غلطی یا غلط فہمی یا غلط کاری کا امکان باقی نہ رہے -

چنانچہ حضرت علیؓ کی امامت پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نص کے ثبوت میں اسماعیلی

واقعہ پیش کرتے ہیں کہ حجۃ الوداع کے بعد جب آپؐ مکہ معظمہ سے تشریف لے چلے تو غدیر خم کے مقام پر آپؐ رکے اور ارشاد فرمایا کہ یہاں کے سارے جھاڑ جھنکاڑ اکھاڑ دوائے جائیں۔ تاکہ سب لوگ جو ساتھ آرہے تھے بہ آسانی مجتمع ہو سکیں۔

جب یہ کام ہو چکا تو آپؐ نے تمام صحابہؓ اور حاضرین کے سامنے حضرت علیؑ کا ہاتھ اپنے دست مبارک میں لے کر اتنا اونچا کیا کہ بغل کی سفیدی نظر آنے لگی۔ پھر فرمایا۔

من کنت مولاہ فعلی مولاہ اللھم وال من والاہ وعاد من عاداہ ؏

یعنی جس کا میں دوست ہوں اس کا علیؑ بھی دوست ہے۔ بار الہا! جو علیؑ سے محبت رکھے تو بھی اس سے محبت رکھیو۔ اور جو علیؑ کا دشمن ہو تو بھی اس سے ناراض رہنا ؏

اس طرح آپؐ نے بتا دیا کہ نص کی صورت کیا ہوتی ہے؟ اور وہ کس طرح کی جاتی ہے یہ اس لیے کیا کہ لوگوں پر حجت تمام ہو جاتے۔ اور پھر کسی کو یارائے انکار و شک نہ رہے!

مصادر و حواشی

؎ ترجمہ حدیث:۔

جو شخص اس حالت میں مرے کہ اپنے امام عصر سے ناآشنا ہو تو وہ جاہلیت (کفر) کی موت مرا۔

اہل السنت کے ہاں اس مفہوم کی حدیث بایں الفاظ مروی ہے:۔

من مات ولیس فی عنقہ بیعتہ فمات میتۃ جاھلیۃ۔

یعنی جس شخص نے بایں طور وفات پائی کہ اس کی گردن میں (امام کا) قلادۂ بیعت نہیں تھا۔ پس وہ جاہلیت (کفر) کی موت مرا۔

؎ دعائم الاسلام (قاضی نعمان بن محمد) ذکر ولایۃ الائمہ۔

؎ مقالۂ دوم

؎ دعائم الاسلام (ذکر ولایۃ المومنین)

؎ اس مفہوم کی احادیث اہل السنت کے ہاں بھی مروی ہیں۔

امام غائب اور امام حاضر

○

ایک اختلاف ——— ایک تجزیہ

اسماعیلیت اور شیعیت کے اسباب اختلاف

اثنا عشری حضرات امام غائب کے قائل ہیں جس کا انتظار ہو رہا ہے۔ لیکن اسماعیلیوں کے ہاں امام حاضر موجود ہے۔ ایک امام اس دنیا سے رخصت ہوتا ہے تو آخری مرتبہ آنکھ بند کرنے سے پہلے وہ کسی کے لیے نص کر جاتا ہے اور پیچھے ہی امام کا انتقال ہوتا ہے۔ یہ امام جس کے لیے نص ہو چکی ہے فوراً مسند امامت پر متمکن ہو جاتا ہے۔ اس کے اس حق اور استحقاق کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔

سچ پوچھیے تو اسماعیلیوں اور اثنا عشریوں کا یہ اختلاف کوئی معمولی اختلاف نہیں ہے بلکہ اسے بنیادی اور اہم ترین حیثیت حاصل ہے

اسماعیلی اکابر میں علامہ حمید الدین غیر معمولی شخصیت کے مالک اور صاحب علم و فضل، بزرگ گزرے ہیں۔ ان کی کتابیں استدلال میں پیش کی جاتی ہیں۔ ان کے ارشادات سے حوالے کا کام لیا جاتا ہے۔ اور گو ان کی تحریروں میں کہیں کہیں مناظرے کا رنگ جھلکتا ہے — اور یہ چیز اس زمانے میں عام تھی اس لیے حیرت انگیز بھی نہیں — لیکن ساتھ

ہی ساتھ جس ژرف نگاہی، قوتِ استدلال، حسنِ بیان اور نکتہ سنجی سے وہ اپنے موضوع پر بحث کرتے ہیں۔ وہ انہی کا حصہ ہے۔ اس باب خاص میں شاید ہی کوئی دوسرا ان کا شریک و سہیم نظر آ سکے۔

علامہ حمیدالدین کے نزدیک امام کو غائب ماننا اور اس کے داعی کو اس کے خصائل اور امتیازات کا حامل ماننا کفر سے کم نہیں۔

اس موضوع پر انہوں نے نسبتہً وضاحت اور تفصیل سے گفت گو کی ہے۔ کوئی شبہ نہیں اس گفت گو سے کسی کو کتنا ہی اختلاف ہو اور یہ استدلال کسی کے لیے کتنا ہی ناگوار کیوں نہ ہو۔ مگر ماننا پڑے گا کہ اس میں وزن ہے۔

علامہ موصوف اس بحث پر گفت گو کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

"اثنا عشری حضرات کی ایک گمراہی یہ ہے کہ وہ ایسے امام کی امامت کے معتقد ہیں، جس کا کوئی وجود نہیں۔ لہٰذا اس کی اطاعت بھی واجب نہیں۔ اگر ان حضرات سے اس بارے میں سوال کیا جائے تو دلیل دیتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ امام کی غیبت بالکل اسی طرح جائز ہے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی غیبت جائز تھی جب آپ مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ تشریف لے گئے تھے۔

لیکن یہ اس پر غور نہیں کرتے کہ جب آپؐ مکے سے مدینے تشریف لے گئے تھے۔ تو موجود تھے۔ اور لوگ اس امر سے بہت اچھی طرح واقف تھے۔ کہ آپؐ کہاں تشریف لے گئے ہیں؟ نیز یہ بات بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ جاتے وقت آپؐ نے حضرت علی رض کو اپنا قائم مقام اور جانشین بنا دیا تھا۔ جب تک یہ نہ کر لیا مکے سے باہر قدم نہیں نکالا۔

علاوہ ازیں اثنا عشری حضرات سے ہم دریافت کرتے ہیں کہ وجوب امامت کی علت کیا ہے؟

امامت کا وجوب اس لیے ہوا کہ مخلوق خدا اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کے وسائل سے محروم تھی کہ براہِ راست خدا سے جو کچھ معلوم کرنا ہوتا معلوم کر لیتی۔ لہٰذا

اللہ تبارک و تعالٰی نے رسول بھیجا کہ وہ انہیں تعلیم دے۔
چونکہ رسولؐ قیامت تک زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ اور کارِ رسالت کو قیامت تک جاری اور باقی رہنا تھا۔ لہٰذا امام کی ضرورت لاحق ہوئی۔ یہ امام رسولؐ کا قائم مقام ہوتا ہے اور اس کا کام یہ ہے کہ لوگوں کو صلاح و معاد کی طرف بلائے۔
پس (ان حقائق کی روشنی میں یہ بات واضح ہو گئی کہ) یہ حضرات ایک ایسے امام کے معتقد ہیں جو نہ معروف ہے ——— یعنی جسے سب لوگ نہیں جانتے ——— اور نہ یہ امام بذاتِ خود لوگوں کو خدا کی اطاعت کی دعوت دے سکتا ہے اس لیے کہ یہ تو غائب ہے اور یہ کام غائب سے سرانجام نہیں پا سکتا۔

مزید یہ کہ:
اللہ تعالٰی فرماتا ہے کہ ہم نے جب تمہیں پیدا کیا اس وقت تم کچھ نہیں جانتے تھے۔ لہٰذا تم نے اپنا دین کس سے سیکھا؟ تم تو اس سے ناواقف ہو۔ کیونکہ تم نے نہ امام معصوم سے سیکھا ہے نہ ایسے شخص سے اخذ کیا ہے جو امام معصوم کی طرف سے اس کام پر مامور ہو۔ پھر آخر تم نے اپنا دین کس سے سیکھا ہے؟
اس سوال کے دو ہی جواب ہو سکتے ہیں جو یہ دے سکتے ہیں۔
یا تو یہ جواب میں کہیں گے کہ ہم نے اپنا دین امام معصوم سے سیکھا ہے یا پھر ہم نے اپنا دین اس شخص سے اخذ کیا ہے جو امام معصوم مفترض الطاعۃ کی طرف سے اس کام پر مامور تھا۔
اس صورت میں ان سے سوال کیا جائے گا!
امام معصوم کون ہے؟
اس کا جواب ان کے پاس نہیں۔ کیونکہ ان کے امام کا وجود ہی (غیبت کے باعث) محال ہے؟ البتہ جواب میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے ثقات سے سیکھا ہے۔
اس قول سے دو باتیں ان پر لازم آتی ہیں۔

یا تو یہ کافر ثابت ہوتے ہیں۔ کیونکہ انہوں نے متعاماتِ ائمہ کو جنہیں اللہ نے ثابت کیا ہے۔ باطل کر دیا ہے۔ اور اس امر کو جسے اللہ نے محکم اور استوار کیا تھا۔ توڑ دیا ہے۔ اس لیے کہ اگر ثقات کا وجود ان کے نظریہ کے مطابق مان لیا جائے [3] تو ہر زمانے میں ائمہ سے استغنا لازم آتا ہے۔ اور یہ کفر ہے۔ ورنہ پھر یہ اپنے دین میں شک کرنے والے ثابت ہوتے ہیں۔ کیونکہ انہوں نے دین ایسے لوگوں سے سیکھا ہے جن کی طاعت اللہ تعالیٰ نے واجب نہیں کی [4] حالانکہ وہ صاف الفاظ میں فرماتا ہے کہ

"انہیں حکم دیا گیا ہے کہ صرف اللہ کی بندگی کی نیت سے یک رخ ہو کر اس کی عبادت کریں [5]"

اور جہاں اخلاص ہوگا۔ وہاں شک کا گزر نہیں پس ثابت ہوا کہ یہ اللہ کی عبادت میں شک سے بری نہیں ہیں؟

اور اگر یہ ائمہ کے وجوب کو تسلیم کرتے ہیں تو ائمہ ابرار کو چھوڑ کر ثقات [6] سے دین سیکھنے کے باعث یہ کفر کے مرتکب ٹھہریں گے۔

ان حضرات کی کمزوری میں سے ایک یہ بھی ہے کہ یہ جانتے ہیں کہ امام معصوم ہر زمانے میں ایک ہوتا ہے۔ اس امام کے سوا جتنے لوگ بھی ہیں ان سے غلطی اور خطا کا صدور بالکل ممکن ہے۔ بایں ہمہ یہ لوگ فلاں بن فلاں کی روایت کو جو کسی امام کی طرف منسوب کی جاتی ہے۔ قبول کر لیتے ہیں۔ گویا ان کے راوی اپنی روایتوں میں معصوم ہیں۔

جب ان سے سوال کیا جائے کہ تم نے اپنا دین کس سے سیکھا ہے؟ تو یہ جواب دیتے ہیں کہ ہم نے ثقات سے سیکھا ہے۔

اس طرح خود بخود ائمہ کی امامت باطل ہو جاتی ہے [7] کیونکہ ثقات کا وجود مستلزم ہے ائمہ سے بے نیازی اور استغنا کا۔

معادر و حواشی

۱؎ ثقات سے مراد اصحاب اجتہاد ہیں۔

۲؎ یعنی اگر ثقات سے دین سیکھا جا سکتا ہے۔ تو پھر ائمہ کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ کیوں کہ جو کام اللہ نے ائمہ کے لیے خاص کیا تھا اسے ثقات انجام دے ہی رہے ہیں۔

۳؎ اللہ تعالیٰ نے رسولؐ کی اطاعت واجب کی ہے اور رسولؐ کی نص کے بموجب ائمہ کی۔ ثقات کا کہیں ذکر نہیں۔ لہٰذا ان کی اطاعت بھی واجب نہیں۔ اور جب ان کی اطاعت واجب نہیں تو دینی اعتبار سے انہیں امام کا ہم پلہ کس طرح مانا جا سکتا ہے؟

۴؎ یعنی مجتہدین۔

۵؎ امام کو معصوم اسی لیے بنایا گیا ہے کہ اس سے غلطی کا صدور نہ ہو سکے۔ اور لوگ انشراح قلب سے اس کی اطاعت کر سکیں۔ پس امام کے علاوہ جتنے لوگ بھی ہیں۔ وہ بہرحال معصوم نہیں ہیں۔ ان سے غلطی ہو سکتی ہے۔ لہٰذا انشراح قلب کے ساتھ ان کی اطاعت نہیں کی جا سکتی۔

۶؎ ثقات اگر ائمہ معصومین کی جگہ لے لیں تو ظاہر ہے۔ ائمہ کا وجود بے کار ہو جاتا ہے۔ اور امام سے استغناء کفر ہے۔

دلائل کا اسلوب

تربیت کے حدود و مدارج

گذشتہ صفحات میں یہ بات میں واضح کر چکا ہوں کہ اسماعیلی نظام دعوت بہت پرکار اور منظم ذہنیت کا ہے۔ یہ نظام نقل پر بھی مبنی ہے۔ اور عقل پر بھی اور نفسیات پر بھی۔ ان تینوں چیزوں نے مل کر اس نظام کو اتنا محکم اور استوار کر دیا ہے کہ بڑے بڑے زلزلے انقلابات اور ہنگامے بھی اس میں تزلزل نہ پیدا کر سکے۔

عہد صحابہ میں کسی حد تک اور عہد تابعین میں بڑی حد تک ایسے فرقے پیدا ہوتے جو اپنا مخصوص مکتب فکر رکھتے تھے۔ اور ان کی فکر بھی عقل و نقل پر مبنی تھی۔ لیکن جب ان مبتدع الفکر فرقوں کو زلزلوں، آندھیوں اور ہنگاموں کا مقابلہ کرنا پڑا تو وہ مقابلہ نہ کر سکے، فنا ہو گئے۔ آج ان کا نام صرف تاریخ کے صفحات میں موجود ہے۔ ورنہ عالم موجودات سے وہ رخصت ہو چکے ہیں۔ اس کے برعکس اسماعیلی فرقہ، اگرچہ ہر چہار طرف سے طاقت ور اور با اقتدار دشمنوں اور مخالفوں کے حصار میں تھا۔ اور اسے فنا کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا گیا۔ زمین دشمن تھی، آسمان دشمن تھا۔ شجر و حجر دشمن تھے۔ بایں ہمہ ابتلا کے ان ادوار کو اس فرقے نے استقلال و عزیمت کے ساتھ جھیلا۔ اور اپنے

اور موت نہیں طاری ہونے دی۔ اس کا اقتدار بھی معجزہ تھا۔ اسے معجزہ نہیں تو اور کیا کہیں گے کہ ممالک محروسہ و مقبوضہ و مفتوحہ کی غالب ترین اکثریت عقائد میں بنیادی طور پر اس سے اختلاف رکھنے کے باوجود اس کی رعایا بنی ہوئی تھی؟ اس کا زوال بھی معجزہ تھا سے معجزے کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ اس کے وجود کو ہست سے نیست کر دینے میں سلطان صلاح الدین اور دوسرے عناصر نے اپنا پورا جاہ و جلال ختم کر دیا، پھر بھی یہ نہ صرف زندہ رہا بلکہ زندگی کا ثبوت بھی دیتا رہا۔ عہدِ زوال میں اس کی کیفیت بالکل یہ تھی کہ "ادھر ڈوبے اُدھر نکلے" ایک جگہ سے اس نے رختِ سفر باندھا اور دوسری جگہ پڑاؤ ڈال دیا۔ ایک طرف کی سرزمین تنگ ہو گئی۔ تو دوسری طرف کی سرزمین نے آغوش کشادہ کر دیا۔

اس کی اس زندگی کا راز اس کے مسلسل، مرتب اور منظم اصولِ حیات میں مضمر ہے اس نے کبھی بھی "دعوت" کا سلسلہ منقطع نہیں ہونے دیا۔ اور یہ دعوت ہر زمانے میں خواہ وہ اقتدار کا ہو یا انحطاط کا برگ و بار لاتی رہی۔

جن لوگوں کو دعوت دی جاتی تھی۔ انہیں عقل و نقل ہر طرح سے قائل کرنے کی کوشش کی جاتی تھی اور ساتھ ساتھ ایسے دلائل کا انبار لگا دیا جاتا تھا جو عام فہم کے ایک آدمی کے لیے قابلِ قبول اور قابلِ غور ہوتے تھے۔

اسماعیلی فرقہ اثنا عشری نہیں ہے یعنی یہ بارہ اماموں کو نہیں مانتا۔ یہ اپنے آپ کو سبعیہ یعنی ہفت امامی کہتا ہے۔

لیکن اس کا نظام ہفت امامی کیوں ہے؟

اس مسئلے پر اس نے بڑے اہم، دور رس اور دلچسپ نکتے پیدا کیے ہیں۔

اس سلسلے میں بہتر ہوگا کہ ہفت امامی نقطۂ نظر کے محرکات و عوامل ہم ایک ایسے شخص کی زبانی پیش کریں جو پیدائشی طور پر اس فرقے سے وابستہ تھا اور خود اپنی زندگی کا بڑا حصہ اس نے ایک اسماعیلی ہی کی حیثیت سے گزارا۔

"ہماری دعوت کی بنیاد سات پر ہے۔ جسے عدد کامل کہتے ہیں۔ اسی وجہ سے ہمارا فرقہ فرقۂ سبعیہ کہلاتا ہے۔ ہمارے اسماعیلی مذہب کے سات ادوار میں سات ہی نطقا اور

سات ہی ائمہ کا ہونا ضروری ہے۔ جو دین کے افلاک کے جاتے ہیں اور جن کا سلسلہ جسمانی عالم کی صفائی تک جاری رہے گا۔

اللہ تعالیٰ نے عالم روحانی میں سات عقول منبعثہ۔ عالم جسمانی میں سات افلاک اور سات کواکب سیارہ۔ عالم زمین میں سات اقلیمیں۔ عالم زمانہ میں سات دن۔ عالم انسانی میں سات منہ کے منافذ۔ عالم جسد میں سات اعضائے رئیسہ، عالم نباتات میں سات بالیاں۔ عالم شریعت میں کلمۂ طیبہ کے سات مقاطع۔ اور عالم قرآن میں سات مثانی کے مقابلے پر اپنے دین میں سات نطقاء اور سات ائمہ قائم کیے ہیں۔ ان نطقاء اور ائمہ کے ہمیشہ سات سات ہونے میں کبھی فرق نہ آئے گا۔ کیونکہ یہ وہ خدا کی مخلوق ہے۔ جس میں کبھی کوئی فتور نظر نہیں آئے گا جیسا کہ خدا فرماتا ہے:۔

ماترٰی فی خلق الرحمٰن من فتور۔

یہ خدا کی وہ صنعت ہے جس میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں پائی جائے گی۔ نیز ارشاد ہوتا ہے۔ ولن تجد لسنت اللہ تبدیلا۔"

اگر مذکورہ تعداد کو گھٹائیں یا بڑھائیں تو دین میں تغیر لازم آئے گا۔ جو ناممکن اور محال ہے۔[1]

جو لوگ اس دعوت کو قبول کر لیتے ہیں وہ اگرچہ شامل جماعت ہو جاتے ہیں لیکن ایک عرصے تک انہیں زیر تربیت رکھا جاتا ہے۔ اور یہ تربیت مختلف مدارج اور حدود کی حامل ہوتی ہے۔

"مستجیب سے جو سوال کیے جاتے ہیں۔ ان کا ماخذ رسائل اخوان الصفا میں معترضین کے تعلیمی مدارج کی تصدیق تاویل الدعائم سے ہوتی ہے۔ سیدنا قاضی نعمان فرماتے ہیں کہ مستجیب کی مثال نومولود کی ہے۔ جو پیدا ہونے سے پہلے تین ظلمات یعنی تین تاریکیوں میں پوشیدہ تھا

[1] ایک تاریخی شکم

- دوسری رحم کی
- اور تیسری جنین کی۔

ان تاریکیوں کی تاویل "مستور و کتمان" ہے۔ مولود کے پیدا ہونے کے بعد اس کی ظاہری حالت درست کی جاتی ہے۔ یعنی اس کا نال کاٹا جاتا ہے۔ پھر اس کے بدن پر تیل کی مالش کی جاتی ہے اور اس کے اعضاء پر عرفوں کی رسم کے مطابق پٹیاں (جسے عصائب کہتے ہیں) باندھی جاتی ہیں۔ تاکہ اس کے اعضاء مضطرب نہ ہونے پائیں۔ یعنی دعوت میں داخل ہونے والے مستجیب کا وہ پہلا "ظاہر" جو امام الزماں سے نہیں لیا گیا تھا۔ اس سے الگ کر دیا جاتا ہے۔ اور اس کی ظاہری شریعت کی اصلاح کی جاتی ہے

پھر اس کے دودھ پینے کا زمانہ آتا ہے جو دو سال تک جاری رہتا ہے۔ یعنی اسے تاویل کے چند تمان اصول بتائے جاتے ہیں جن میں اسرار کی کچھ تصریح ہوتی ہے۔ اس درجے میں کتاب الرضاع فی الباطن کی تعلیم دی جاتی ہے۔

پھر اس کی تربیت شروع ہوتی ہے۔ یعنی آہستہ آہستہ اسے باطن سے واقف کرایا جاتا ہے۔ اس حد میں اساس التاویل اور اس کے بعد تاویل الدعائم پڑھائی جاتی ہے۔ اسی وجہ سے اس کا نام کتاب التربیت المومنین بالتوفیق علی حدود الدین [۵] رکھا گیا ہے۔ اس میں متعدد مجلسیں ہیں جو مجالس الحکمت کہی جاتی ہیں [۶]

پھر بلوغ کی حد شروع ہوتی ہے۔ اس میں پوشیدہ اسرار بتائے جاتے ہیں۔ تعلیم کے دوران میں بعض مستجیبین بیچ کے درجوں میں سے نکل جاتے ہیں۔

حواشی و مصادر

[۴] یعنی سوراخ: ناک، کان، آنکھ کے دو دو، منہ کا ایک، کل سات۔

[۵] قرآن مجید میں وارد ہے:

سبع سنبلات خضر و اخر یابسات

[۶] سورہ فاتحہ۔

[illegible] "ہمارا اسماعیلی مذہب" ص ۵۹۹ -

[illegible] "تاویل الدعائم" - ج ۱ : ص ۷۵ -

[illegible] "ہمارا اسماعیلی مذہب" ص ۲۲۵ -

اسماعیلی فرقہ

ہر جماعت جب بڑھتی اور پھیلتی ہے تو اس کے فکر و نظر کے مسائل میں ان کی تاویل و تفہیم میں اور طرز و اسلوب میں بھی وسعت پیدا ہوتی ہے۔ اور بالآخر یہی وسعت نئے مکاتب فکر یا دوسرے الفاظ میں نئے فرقوں کو عالم وجود میں لاتی ہے۔

ایک جماعت شروع میں جتنی زیادہ فکر و نظری اعتبار سے متحد منظم اور ہم آہنگ ہوتی ہے۔ رفتہ رفتہ اس کی یہ چیزیں مفقود ہوتی جاتی ہیں۔ اور اس میں نئے نئے لوگ پیدا ہوتے ہیں۔ جو ماضی سے حال کا رشتہ ضرور قائم رکھتے ہیں لیکن ماضی کی بہت سی چیزوں کو رد کر دیتے ہیں۔ اور حال کی کچھ نئی چیزیں اختیار کر لیتے ہیں۔ ہر شخص کو اپنے کچھ نہ کچھ ہم خیال مل ہی جاتے ہیں۔ یہی ہم خیال اپنی تنظیم کر کے ایک فرقہ بن جاتے ہیں۔

مذاہب و ادیان میں فرقوں کی کثرت دیکھ کر ایسا اندازہ ہوتا ہے جیسے یہ ایک طبعی اور قدرتی عمل ہے جو ہمیشہ سے جاری ہے اور ہمیشہ جاری رہے گا۔

اس طرح کی تبدیلیاں اور جماعت سازیاں اور جماعت در جماعت کی تشکیل و تخلیق کا سلسلہ دوسری جماعتوں اور انجمنوں میں بھی جاری رہتا ہے جو مختلف اغراض و مقاصد کو لے کر میدان عمل میں اترتی ہیں۔

لیکن عام جماعتوں اور دینی جماعتوں کی کثرت احزاب میں ایک فرق ہے۔

عام جماعتوں میں جو گروہ بندیاں ہوتی ہیں۔ وہ زیادہ تر اغراض و مصالح یعنی دنیوی کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ لیکن دینی جماعتوں کی گروہ بندیاں یا فرقہ آرائیاں یا جماعت سازیاں یا نئی جماعت کی تشکیل و تخلیق تمام تر فکری و نظری اختلاف کا نتیجہ ہوتی ہے۔ یہ فکری و نظ اختلافات خواہ کیسے ہی ہوں۔ اور ان کی نوعیت کیسی ہی کیوں نہ ہو۔ مگر اس سے انکار نہ جا سکتا کہ یہ اغراض اور مصالح کے کچھ زیادہ تابع نہیں ہوتے۔

اسماعیلی فرقہ، خود شیعہ فرقہ کا ایک ٹوٹا ہوا گروہ ہے۔ بعد میں اس فرقے اندر بھی نئے نئے فرقے پیدا ہوتے گئے اور تکفیر و تفسیق کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا اور شور سے شروع ہوا کہ کبھی کبھی نوبت کشت و خون اور قتل و غارت تک آ گئی۔

لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اسماعیلی ہر طرح کے باہمی اختلافات اور و نظری تصادم کے باوجود ایک چیز پر نہایت سختی کے ساتھ قائم رہے۔ یعنی انہوں نے جماعت کے اصولی اور بنیادی مسائل کے بارے میں اکثر و بیشتر باہمی اتفاق قائم رکھا۔ اختلا جتنے بھی رہے وہ زیادہ تر فروعی یا اجتہادی مسائل میں رہے۔

اسماعیلی فرقوں کی تاریخ بجائے خود ایک مفصل موضوع ہے۔ ہم اس مفصل موضو کو اختصار سے بیان کرنے کی کوشش کریں گے۔ اور چند مشہور اور اہم فرقو ذکر پر اکتفا کریں گے۔

قرامطہ

○

ایک غالی اور انتہاپسند فرقہ

یہ فرقہ بھی اسماعیلیوں کی ایک شاخ ہے۔ لیکن اپنے عقائد میں اس درجہ غالی اور انتہاپسند، نیز اپنے اعمال میں اس درجہ بے دھڑک اور بیباک تھا کہ خلافت فاطمیہ کو نہ صرف اس کے اقوال و اعمال سے اظہار برأت کرنا پڑا۔ بلکہ اس کے خلاف جنگ بھی کرنا پڑی تھی۔

بعض لوگ اسماعیلیوں اور قرامطہ کو خلط ملط کر دیتے ہیں۔ اور دونوں کو ایک ہی سمجھتے ہیں، حالانکہ امر واقعہ یہ نہیں ہے۔ اسماعیلیوں میں اور قرامطہ میں بڑے سنگین اور ناقابلِ مفاہمت فکری اختلافات ہیں۔ ان اختلافات کو مصالحت اور مفاہمت سے بدلنے کی کوشش کی گئی۔ مگر کامیابی نہیں ہو سکی۔ اس لیے کہ اختلاف اگر بنیادی اور اساسی ہو تو وہ صلح پر ختم نہیں ہو سکتا۔ اس کا فیصلہ تلوار ہی کرتی ہے۔ اسماعیلیوں اور قرامطہ کا اختلاف بھی ایسا ہی تھا۔ اس کا فیصلہ مصالحت اور مفاہمت سے نہیں ہو سکا۔ تلوار کو بیچ میں آنا پڑا۔ ان خونریزیوں کی داستان طویل بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ لیکن ان سے ایک حقیقت ابھر کر سامنے آجاتی ہے کہ اسماعیلیوں نے ہرگز قرامطہ کی کسی ایسی بات کی تائید نہیں کی جو اصول

اسلام سے متصادم ہو۔ بلکہ قرامطہ کے اور اسماعیلیوں کے مابین جو جنگ ہوئی وہ بھی اس اصولی اور اساسی و بنیادی کش مکش کا مظہر تھی۔

دسویں صدی ہجری کے آغاز میں قرامطہ ایک طاقت بن کر سامنے آتے ہیں خلیج فارس کے مغربی ساحل پر انہوں نے اپنی ایک مستقل اور آزاد حکومت قائم کر لی تھی ۹۰۰ھ میں یہ شام پر حملہ آور ہوتے اور حمص پر قبضہ کر لیا۔ اور بعلبک کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی[3]

اس فرقے کا بانی ایک شخص حمدان قرمط تھا۔ شروع میں حمدان اور اس کے اتباع فکر و عقائد کے اعتبار سے اسماعیلیوں سے قریب تر تھے اور انہیں اپنا مقتدا مانتے تھے۔ رفتہ رفتہ دونوں میں بعد پیدا ہوتا گیا۔

یہ ایک خفیہ جماعت تھی۔ اس کے عقائد اشتراکیت کے حامل تھے۔ چنانچہ مؤرخین اسے اسلام میں سب سے پہلا "کمیونسٹ" فرقہ قرار دیتے ہیں [4] اس کے عقائد میں شیعیت اور اسماعیلیت کا امتزاج تھا۔ حتیٰ نے اسے نسبی اعتبار سے اسماعیلی۔ (1) فاطمی قرار دیا ہے۔

یہ جماعت خفیہ تھی۔ اس میں ہر شخص شریک نہیں ہو سکتا تھا۔ امتحان اور آزمائش کے مختلف مدارج اور مراحل سے گزرنے کے بعد ہی اس کی رکنیت کا اعزاز حاصل ہوتا تھا

فلپ حتیٰ نے اس فرقے کے حالات کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

۸۹۰ء میں حمدان کوفہ کے نزدیک اپنے مستقر میں تھا۔ نو سال بعد اس کے پیروؤں نے خلیج فارس کے مغربی ساحل پر ایک مستقل سلطنت قائم کر لی تھی۔ ان دو مرکزوں سے انہوں نے ہر طرف تباہی پھیلائی۔ امویوں کے زمانے میں شامی مسلمان عام سنی مسلک کے پیرو رہے۔ لیکن عباسی حکومت وہاں مسلط ہوئی تو علویوں کے نظریات کے لیے راستہ ہموار ہو گیا اب اہل شام قرمطیوں کے عقائد قبول کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ وہ انتہا پسندانہ شیعہ عقائد اور عباسیوں کے خلاف سیاسی افکار قبول کر لینے پر آمادہ تھے شام کے خلاف قرمطیوں

نے ابن زکرویہ کی سرکردگی میں پیش قدمی کی۔ انہوں نے طولونی فوج کو شکست
دینے کے بعد دمشق کا محاصرہ کر لیا۔ حمص مسخر ہو گیا۔ حماۃ اور معرۃ النعمان کے باشندوں
کی خاصی بڑی تعداد ماری گئی۔ بعلبک کی تقریباً پوری آبادی موت کے گھاٹ اتار دی گئی۔ سلمیہ
بھی ان کے قبضے میں آگیا۔ شام کی بہت سی مسجدوں کے منبروں سے جمعہ کے خطبے میں زکرویہ کو
مہدی موعود قرار دیا گیا۔

جو لوگ پہلے کہتے رہے تھے کہ بنو امیہ کے سوا ہم کسی کی حکومت نہیں مانتے تھے
ب بظاہر مایوس ہو گئے اور انہوں نے آلِ نبی کی حکومت قبول کر لی تھی

اسماعیلی جہاں اور جس سرزمین پر بھی گئے۔ وہاں انہوں نے اپنے کچھ آثار و نقوش
ضرور چھوڑے۔ یہ بات ان پر بھی صادق آتی ہے اور ان کے فرقوں پر بھی۔
فکری اعتبار سے ان کی باتیں کتنی ہی گمراہ کن اور موجب فساد عقاید ہوں لیکن اس
سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حاکم اور فرمانروا کی حیثیت سے جہاں بھی ان کے قدم پہنچے۔ انہوں
نے وہاں کے حالات کو سدھارنے، انتظام کو درست رکھنے، عوام کو آسائشیں پہنچانے
اور نظم و انتظام کو محکم اور استوار کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ اور جو کچھ زیادہ
سے زیادہ ان سے ممکن تھا وہ کیا۔

فلپ حتی کا بیان ہے:۔
"گیارھویں صدی کے متعلق ایک ایرانی ناصر خسرو کے قلم سے مفصل بیانات ملتے
ہیں۔ یہ ایک اسماعیلی داعی تھا۔ جو سفر حج کے سلسلے میں لبنان بھی گیا۔ اور
اسے دوسری اسلامی سرزمینوں پر ترجیح دی۔ وہ ۱۰۴۷ء کے اواخر سرما میں
طرابلس پہنچا تھا۔ یہاں کے باغات اور کھیت بہترین تازگی و شادابی کا مرقع
ہو گئے ہیں۔ ناصر خسرو گنے، میٹھے اور کھٹے سنگتروں، کیلے اور کھجوروں کی بہار
سے بہت متاثر ہوا۔ اس وقت شہر کی آبادی بیس ہزار تھی۔ مکانات چار چار اور
پانچ پانچ منزلیں تھیں۔ ہر قسم کا گوشت، پھل اور کھانے پینے کی چیزیں ایران

کی طرح ملتی تھیں۔ البتہ ان کی کثرت سو گئی تھی۔ وہ لکھتا ہے۔ مکان اتنے صاف ہیں کہ انہیں شاہی محل سمجھنا چاہیے۔ بازار میں ایک جگہ پانی کا انتظام ہے جہاں پانچ ٹونٹیاں لگی ہوئی ہیں۔ درویشوں اور عبادت گزاروں کے لیے خاص زاویے ہیں۔ فاطمی فوج شہر کی حفاظت کر رہی ہے اور فصیلوں پر منجنیقیں نصب ہیں۔ یہاں کی بندرگاہیں یونان، فرنگ، ہسپانیہ اور المغرب کے جہاز آتے ہیں۔ اور فاطمی جہاز یہاں سے چل کر یونان سسلی اور المغرب پہنچتے ہیں [۹] یہاں کاغذ سازی کا جو کارخانہ ہے اس کے کاغذ کو سمرقند کے کاغذ پر فوقیت حاصل ہے۔ مسلمانوں نے ۷۵۱ء میں بمقام سمرقند چینی قیدیوں سے کاغذ بنانا سیکھا تھا۔ ہارون الرشید کے زمانے میں بغداد کے اندر کاغذ سازی کا پہلا کارخانہ قائم ہوا۔ طرابلس کے لیے ترقی و خوش حالی کا بہترین دور خاندان بنی عماد کے بانی کے ماتحت آنے والا تھا۔

جبیل بھی فصیل سے محصور تھا۔ اور یہ فصیل بڑی مستحکم تھی۔ یہاں کھجور اور دوسرے پھلوں کی کثرت دیکھی۔ یہاں ناصر خسرو کو ایک لڑکا ملا جس کے ہاتھ میں گلاب کے دو پھول تھے۔ ایک سرخ۔ دوسرا سفید۔ حالانکہ مارچ کی پانچویں تاریخ تھی [۱۰]

فاطمیوں کی ضد میں عباسی قرامطہ سے سازباز اور تعاون بھی کر گزرتے تھے۔ حتی کہتا ہے:۔

شام میں جوہر کو دوسرے حریفوں سے بھی مقابلہ پیش آیا۔ وہاں ترکی مسلح تھے جنہیں حسن بن احمد الاعصم کی سرکردگی میں عباسیوں کی طرف سے امداد مل رہی تھی کچھ مدت تک نظر آرہا تھا کہ اعصم کامیاب ہو جائے گا۔ اس نے دمشق پر قبضہ کیا۔ فاطمیوں کو مقام سے رجعت پر مجبور کر دیا بلکہ ان کے تعاقب میں قاہرہ پہنچ گیا۔ بیزنطینی اس امر کے منتظر تھے کہ کوئی سازگار موقع سامنے آئے تو اس سے فائدہ اٹھا کر وہ سرزمین دوبارہ حاصل کریں، جہاں کسی زمانے میں حکمران رہ چکے تھے۔ پھر ترک بھی نچلے بیٹھنے والے نہ تھے۔

ان کے ایک سالار افتگین نے دمشق پر قبضہ کر لیا۔ اور پورے ملک میں یورشوں کا تانتا باندھ دیا۔ ترکوں اور قرمطیوں نے طبعاً مشترکہ دشمن کے خلاف اتحاد کر لیا۔ ۹۷۷ء میں دوسرے فاطمی خلیفہ العزیز باللہ نے خود فوج کی قیادت کی اور متحدہ دشمن کو رملہ کے باہر تباہی خیز شکست دی ہے[۱۰] غرض العزیز نے شام کا ساحلی علاقہ اپنی سلطنت میں شامل کر لیا[۱۱] اور اس طرح تاریخ کا ایک باب ختم ہوا۔ دوسرا شروع ہوا۔

مصادر اور حواشی

[۱] مصر سے اسماعیلیوں کے متعلق جو گراں بہا اور معلومات آفریں کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ اور ہوتی رہتی ہیں۔ ان میں یہ ساری تفصیلات موجود ہیں۔

ابراہیم حسن کی کتاب "الفاطمیون فی مصر" سے بھی اس سلسلے میں کافی معلومات حاصل ہو سکتے ہیں

[۲] یاقوت: معجم البلدان۔ جلد سوم ص ۷۰۷۔

[۳] النجوم الزاہرہ فی ملوک مصر والقاہرہ۔ جلد دوم ص ۵۹۔

نیز ملاحظہ ہو۔

" المواعظ والاعتبار فی ذکر الخطط والآثار (مقریزی) جلد اول ص ۳۱۶-۳۱۷۔

[۴] " تاریخ لبنان " از فلپ حتی۔ ذکر قرامطہ ص ۲۷۲۔

[۵] تاریخ شام از فلپ حتی۔ ص ۴۵۳۔ ذکر قرامطہ۔

[۶] طبری ۳/۲ ص ۲۲۲۱ [۷] مقدسی ص ۲۹۷۔

[۸] تاریخ شام فلپ حتی۔ ص ۴۵۳۔ ذکر قرامطہ

[۹] سفر نامہ ناصر خسرو ص ۱۱۲۔

[۱۰] تاریخ لبنان۔ فلپ حتی ص ۲۴۲ [۱۱] فاطمی خلیفہ

[۱۲] ابن خلدون ج ۴ ص ۵۲

[۱۳] تاریخ شام فلپ حتی ص ۴۷۹

نصیریہ

یہ بھی شیعوں کا ایک غالی اور انتہا پسند فرقہ ہے جس کا تعلق اسماعیلیوں سے
کیا ہے۔

بعض دوسرے بہت سے فرقے برسرِ عام آنے کے بجائے درپردہ اور پراسرار طور
دور تحریک کے طور پر اپنا کام چلاتے ہیں۔ اور عام طور پر اپنے عقائد کا اخفا کرتے
نصیریہ فرقہ بھی اسی طرح کے فرقوں میں ہے۔ چنانچہ بالکل مستند طور پر اس کے بارے
معلومات بہت کم ملتے ہیں۔

فلپ حتی نے اس فرقہ کے بارے میں جو تحقیق کی ہے وہ یہ ہے:-

"اسماعیلیوں کی ایک اور شاخ، جو اب تک زندہ ہے "نصیریہ" ہیں۔ یہ نام
محمد ابن نصیر کوفی کے نام پر رکھا گیا۔ جو (نویں صدی کے اواخر میں) گیارھویں امام الحسن
کا حامی تھا (وفات [illegible]) ابن نصیر اور اس کے پیروؤں کے متعلق ابتدائی قابلِ
حمزہ اور درزیوں کے مناظروں کی تحریرات میں ملتے ہیں۔ اس فرقے کا آخری بانی
ان الشقی (وفات ۹۶۹ء) تھا۔ جو حمدانیان حلب کا اسمٰعیلی مولا تھا۔
اس فرقہ کے مذہب کے متعلق بہت کم معلومات ہیں۔ کیونکہ اسے خفیہ رکھنے پر

نصیریہ

اصرار کیا جاتا ہے۔ اس کے معمولات و مراسم میں باطنیت کا پہلو غالب ہے۔ اس کی مقدس
تحریرات دروزیوں کی تحریرات کے برابر بھی منظر عام پر نہیں آ سکیں۔ چونکہ یہ بہت بڑی مخالف
اکثریت میں ایک قلیل التعداد فرقہ تھا۔ اس لیے تحفظ کی غرض سے معرض خفا میں چلا گیا۔
اور اسی حالت میں رہا۔ مشرق قریب کے مذہبی معموں میں سے یہ ایک ایسا معما ہے جو محض
جزوی طریق پر حل ہو سکتا ہے۔

بایں ہمہ اتنا معلوم ہے کہ شیعوں کے دوسرے غالی فرقوں کی طرح نصیریہ بھی حضرت
علی کو الوہیت کا درجہ دیتے ہیں۔ صلیبی جنگوں کے وقائع میں انہیں نزاری کہتے ہیں۔ اس فرقے کی
حقیقی کیفیت یوں بیان کی جا سکتی ہے گویا ایک پرانے وثنی ملت گروہ پر شیعی افکار کا سخت
دباؤ پڑا ہے۔

دوسرے لفظوں میں یہ ایک پرانا وثنی گروہ ہے جس نے شیعی لباس اختیار کر لیا ہے۔
معلوم ہوتا ہے اس کے اکابر وثنیت[1] سے اسماعیلیت میں منتقل ہو گئے تھے۔ بعد میں انہوں
نے کچھ مسیحی نقط و خال بھی اپنا لیے۔ مثلاً وہ اس انداز میں جمع ہوتے ہیں۔ جیسے مسیحی
عشائے شام کے لیے جمع ہوا کرتے ہیں۔ بعض عیسائی تہوار بھی مناتے ہیں۔ عورتوں کو خاص
مجالس میں شامل ہونے کی اجازت نہیں۔ یہ طریقہ دروزیوں سے سراسر مختلف ہے۔ اجتماع
عبادات کے وقت اور الگ تھلگ مقامات پر ہوتے ہیں۔ ان کے خلاف یہ الزامات بھی
لگائے جاتے ہیں کہ وہ مجالس شبینہ میں رنگ رلیاں مناتے ہیں۔ اور لنگ پوجا بھی کرتے
ہیں۔ ایسے الزامات ان تمام گروہوں پر لگائے جاتے رہے ہیں جو مذہبی اعمال خفیہ طور پر
انجام دیتے ہیں۔ آج کل نصیریہ کی تعداد تین لاکھ کے قریب ہوگی۔

نصیریہ کے سب زراعت پیشہ ہیں۔ انہوں نے شمالی اور وسطی شام کا
کوہستانی علاقہ گھیر رکھا ہے اور ترکی سلیشیا تک پھیلے ہوئے ہیں۔

مصادر اور حواشی

[1] یعنی بت پرست

[1] شہرستانی ص ۱۴۳ -

[2] کتاب الاعتبار ص ۱۵۹ -

[3] فلپ حتی کی تاریخ شام ص ۴۷۴

دروز

خلیفہ الحاکم باللہ کے عہد میں یہ فرقہ پردۂ نمود پہ ابھرا۔ اور نمایاں ہوا۔ یہ فرقہ اپنے مخصوص عقائد، روایات، تعلیمات، مسائل اور اصول رکھتا ہے۔ اس کے بارے میں حتی نے جو معلومات ہم وطنی کے جذبے سے جمع کیے ہیں، یہ ہیں:

معذیت ——— یہ نام ایک ایرانی باطنی داعی سے لیا گیا جس کا نام محمد بن اسماعیل الدرزی (درزی یعنی کپڑے سینے والا) تھا۔

الدرزی کو اپنے نئے عقیدے کے لیے مصر میں چنداں گرم جوشی نظر نہ آئی۔ تو وہ وادی تیم میں منتقل ہوگیا، جو کوہ شیخ کے دامن میں (لبنان) واقع ہے۔ وہاں آزادی پسند پہاڑی لوگ رہتے تھے۔ وہ پہلے ہی انتہا پسندانہ شیعی افکار سے متاثر تھے۔ انہوں نے الدرزی کی باتیں توجہ سے سنیں۔ یہاں الدرزی ایک لڑائی میں مارا گیا (۱۰۱۹ء)۔ تعاون کے اصول نے درزیوں کو اب تک ایک فرقے کے بجائے ایک دینی برادری بنا رکھا ہے۔ اگرچہ یہ فرقہ دو بڑے حصوں میں بٹا ہوا ہے یعنی "عقال اور جہال" مقدس کتابیں صرف چند عقال ہی کی نگاہوں سے گزر سکتی ہیں۔ یہ سب کی سب مخطوطات کی حالت میں ہیں۔ اجتماعات الگ جگہوں پر ہوتے ہیں جو دیہات سے باہر پہاڑیوں پر بنی ہوئی ہیں۔ اور عموماً جمعرات کی

شام کو رہتے ہیں۔

دروزیوں نے جنوبی شام میں مستقل قدم گاہ حاصل کرنے کی کوشش کی تو انہیں ایک علیحدہ فرقے نصیریہ سے لڑائیاں پیش آگئیں۔ آخر نصیریہ کو شمالی شام کی جانب منتقل ہونا پڑا پھر دروزیوں کو دوسرے ہمسایوں یعنی شیعوں اور سنیوں سے کشمکش کی نوبت آگئی۔ ان کا ابتدائی وطن جنوبی لبنان میں تھا پھر وہ ضلع شوف میں منتقل ہوگئے جو بیروت کے مشرق میں ہے کہ آج کل حوران میں ان کی تعداد چھیاسی ہزار اور لبنان میں اناسی ہزار ہے۔ ان کی پوری سرگذشت عزم حریت سے ممتاز ہے اور شام کے قومی معاملات میں ان کا اثر تعداد سے کہیں زیادہ رہا ہے۔

اپنی ایک کتاب میں حتیؒ نے اس فرقہ کے متعلق جو مواد پیش کیا ہے۔ اس سے ذرا زیادہ واضح تصویر اس فرقہ کی نظر کے سامنے آجاتی ہے۔

کتا ہے:

الدروز نام ایک داعی سے ماخوذ ہے۔ جو ایرانی الاصل تھا۔ محمد بن اسماعیل اس کا نام تھا۔ اور درزی کا پیشہ اس نے اختیار کر رکھا تھا۔ قاہرہ پہنچ کر وہ چھٹے فاطمی خلیفہ الحاکم کا معتمد علیہ بن گیا۔ دروزی اسے ماننے میں متامل ہیں۔ کیونکر آگے چل کر یہ اپنی آزاد مشرب تعلیمات کے باعث احترام زائل کر بیٹھا تھا۔ دروزیوں کا ایک نام الموحدین ہے یعنی ایک خدا پر ایمان رکھنے والے الدروزی پہلا شخص تھا جس نے خلیفہ الحاکم کے لیے عبادت گذارانہ احترام کی دعوت جاری کی۔ غالی شیعوں کے نزدیک پہلے سے یہ عقیدہ چلا آتا تھا کہ خدا انسان کا روپ دھار لیتا ہے۔ یہ لوگ حضرت علیؓ اور ان کے اخلاف کے خاص حامی تھے۔ دراصل یہ عقیدہ، تقیدا انسانی اور قادر مطلق کے درمیانی اختلاف کو ختم کرنے کی ایک تدبیر تھی تاکہ دونوں کے درمیان براہ راست ربط ضبط پیدا ہو سکے۔ کہا جاتا ہے کہ خدائے واحد نے زیادہ دس مرتبہ انسانیت

کا روپ دھارا۔ آخری مرتبہ وہ الحاکم کی شکل میں ظاہر ہوا۔ دروزیوں کا یہ بنیادی عقیدہ اسماعیلی تعلیمات کے سلسلے کی ایک کڑی تھا جو امام اسماعیل کے پیرو تھے سات امام اسماعیل کو حضرت علی رض کا ساتواں جانشین مانا جاتا تھا۔ اسی وجہ سے ان کا نام سبعیہ یعنی ہفت امامی پڑ گیا تھا۔

مصر میں اس عقیدے کے لیے پیرو نہ مل سکے۔ الدروزی نے حاکم کے خدا ہونے کا اعلان کیا تو عام لوگ اس درجہ جوش و غضب میں آگئے کہ داعی بصد مشکل جان بچا کر بھاگ گیا۔ وہ کوہ حرمون (جبل الشیخ) کے دامن میں وادی تیم کے اندر پہنچا تو اس کی دعوت مقبول ہوئی۔ دو سال کے بعد وہ ایک لڑائی میں مارا گیا۔ (۱۰۱۹ء) ایک ایرانی الاصل داعی حمزہ اللباد (سمور فروش) الحمزہ نے الدروزی کی دعوت کی خدمت کی شہ پر ہی دراصل اس تحریک کا دل و دماغ تھا۔ اس نے دروزیت کے بنیادی عقائد تیار کیے۔ اس کے الٰہیات میں باطنیت کا رنگ غالب تھا۔ یعنی وہ تمام صداقتوں کے ظاہری الفاظ سے خاص باطنی معنی نکالتا تھا۔ ظاہری الفاظ محض ایک پردہ ہیں جو حقیقت کو ناشناساؤں کی آنکھوں سے چھپانے کے لیے قائم کر دیا گیا ہے۔ حمزہ حاکم کی وفات سے کچھ مدت پیشتر قاہرہ میں جوش و غضب سے بھرے ہوئے لوگوں کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔

نئے مذہب کی اشاعت کے لیے حمزہ کے ایک شاگرد نے اس کی مسند سنبھال لی۔ یہ [illegible] سنی تھا۔ اس کا نام بہاؤالدین تھا (وفات ۱۰۴۲ء کے بعد) کچھ مدت تک بہاؤالدین روپوش رہا۔ دروزیوں کی چار مقدس کتابیں اس سے منسوب ہیں۔ اور دینی مضمون میں ان کا سب سے بڑا مانا جاتا ہے۔ اس کے آخری شارحین میں عبداللہ التنوخی تھا (وفات ۱۴۸۰ء) یہ السید کہلاتا ہے اور اس کی قبر عابر (لبنان) میں ہے۔ وہاں ہر سال ہزاروں دروزی تحفے اور نذریں لے کر جاتے ہیں۔ تنوخ ایک مسیحی عربی قبیلہ تھا۔

بہاؤالدین نے زندگی کے آخری دور میں نئی پالیسی جاری کی۔ اس نے کہا کہ الحاکم کی غیبت میں اس کے مذہب کی کوئی چیز نہ ظاہر کی جائے اور نہ اس پر عمل ہو۔ ان کی مقدس کتابیں مخطوطوں کی شکل میں موجود تھیں۔ عام دروزیوں کو بھی انہیں پڑھنے کی اجازت نہ تھی۔ صرف

صرف چند دانشور ان کتابوں کو دیکھ سکتے تھے۔ دانشوروں میں سے بھی صرف ان بلند مرتبہ لوگوں کو روشنی مل سکتی تھی جو راز رہنے کے حوالے قابل اعتماد تھے اور معلومات کے انتہائی اخفا کے اہل تھے جو شخص اس درجے میں داخل ہونا چاہے اس سے کڑے امتحان لیے جاتے ہیں اور مدت تک امیدواری کرنی پڑتی ہے۔ پھر مذہب میں داخلے کی رسم ادا ہوتی ہے اس کے بعد لازم ہے کہ وہ شخص سخت اخلاقی ضوابط کا پابند ہو جائے۔ اس کی ہر حرکت میں عزو وقار نمایاں ہو۔ ہمہ قسم کے ناجائز فوائد سے احتراز کرے، اپنی زبان سب وشتم سے آلودہ نہ ہونے دے۔ شراب اور تمباکو نہ پیئے۔ ان کے اعلیٰ درجے کے متقی آدمیوں کو اجاوید کہا جاتا ہے۔ وہ کسی سرکاری افسر کے ہاں بھی کھانے پینے میں شریک نہیں ہوتے محض اس خیال سے کہ مبادا اس کا مال ناجائز ذرائع[1] سے حاصل ہوا ہو۔ جو عورتیں استغفاق پیدا کر لیتی ہیں انہیں مذہبی مجالس میں شامل کیا جاتا ہے۔ دروزی ایک ہی بیوی رکھتے ہیں۔ مذہبی مجالس میں جو جمعرات کی شام کو الگ تھلگ عمارتوں (خلوت) میں غیر نمایاں طریق پر منعقد کی جاتی ہیں۔ اس غرض سے عموماً پہاڑوں کی بلند چوٹیاں چنی جاتی ہیں جو دیہات سے قریب ہوں۔ خلوت گاہوں[2] میں قدیم ترین اور محترم ترین وہ ہے جو حاصبیہ کے قریب ہے۔ یہاں جتنے مخطوطات تھے وہ ۱۸۳۳ء میں مصری فوج کے ہاتھ لگے۔ جو ابراہیم پاشا کی ماتحتی میں پہنچی تھی۔ ان مخطوطات سے پہلی مرتبہ علمی دنیا کو دروزی تعلیمات کی جھلک نظر آئی۔ دروزیوں کے متعلق پہلا تحقیقی کام سب سے پہلے ایک فرانسیسی دی ساسی نے انجام دیا جو اصل ماخذ پر مبنی تھا۔ یورپی ادبیات میں دروزیوں کا ذکر سب سے پہلے ایک ہسپانوی یہودی نے کیا ہے۔ جس کا نام بنجامین ہے۔

مصادر و حواشی

[1] ۹۹۴ء تا ۱۰۲۱ء۔

[2] طبری ج ۱، ص ۲۴۸۹۔

[3] بروی ج ۲ حصہ دوم ص ۶۰

[34] تاریخ شام - فلپ حتی، ص ۴۷۴

[35] تاریخ لبنان . . ص ۲۵۹

[36] یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ خود حاکم اس تحریک کا مربی نہیں تھا۔ ورنہ اس جیسے باسطوت شخص کے پایۂ تخت میں اس کے اتنے بڑے عقیدت مند کی یہ گت نہیں بن سکتی تھی

[37] رفع الاصر عن قضاۃ مصر (ابن حجر عسقلانیؒ) ص ۴۱۲

[38] تاریخ لبنان: (فلپ حتی) ص ۲۶۰۔

نزاریہ

اسماعیلیوں کا ایک اور فرقہ نزاریہ ہے جس کے سربراہ اور حاضر امام آغا خان ہیں، یہ فرقہ حسن بن صباح اور اس کے فدائیوں کی فدا کارانہ اور بیباکانہ مساعی کے باعث بہت جلد طاقت ور بن گیا۔ اور نہ صرف سارے عالم اسلام میں بلکہ غیر مسلم ممالک میں بھی اس کی ہیبت قائم ہو گئی۔ فدائیوں کی نوک خنجر نے بڑے بڑے لوگ و سلاطین اور وزراء اور امراء کی زندگیوں کا آن کی آن میں خاتمہ کر دیا۔

ڈاکٹر زاہد علی اس فرقے کے سلسلہ میں تحریر فرماتے ہیں:۔

حسن بن صباح ایک معمولی ایرانی شخص تھا جو شہر طوس میں رہا کرتا تھا۔ وہ اپنا سلسلۂ نسب قدیم عربی نژاد نامور صباح حمیری سے ملاتا تھا۔ اپنے مذہب کے متعلق وہ خود کہتا ہے کہ

"میں اپنے بزرگوں کی طرح اثنا عشری مذہب کا پابند تھا لیکن اتفاق سے اسماعیلیوں کے بڑے ایرانی داعی ناصر خسرو کے زیر اثر آ گیا۔ ناصر خسرو نے اس سے مستنصر کی بیعت لی۔ چند دنوں بعد اس کی ملاقات ایک اور اسماعیلی داعی سے ہوئی۔ جس نے اسے مصر جانے کا مشورہ دیا۔

۴۷۱ھ میں وہ مصر پہنچا اور اپنی لیاقت اور ہوشیاری سے اسماعیلی دعوت میں بڑی شہرت پائی۔ بلاد عجم میں تبلیغ دعوت کی خواہش دیکھ کر مستنصر نے اجازت دی۔ خود حسن بن صباح کا بیان ہے کہ ایک دفعہ میں نے مستنصر سے پوچھا کہ آپ کے بعد میرا امام کون ہے۔ مستنصر نے جواب دیا "میرا بیٹا نزار ہے"۔ اس زمانے میں مستنصر کے دو بیٹے نزار اور جد امتہ آپس میں امامت کے مدعی تھے۔ اس بیان کی تصدیق مؤرخ اور کسی نے بھی کی ہے کہ ہر بیٹے کے ساتھ ایک جماعت ہو گئی۔ چنانچہ نزار کے ساتھ حسن بن صباح اور اس کے ہم خیال ہو گئے

ان دنوں مصر کا وزیر بدر الجمالی چاہتا تھا کہ سب سے چھوٹے بھائی مستعلی کو امامت ملے گئے دربار کے سربرآوردہ عہدہ دار بھی اس کی تائید میں تھے۔ اس سبب سے بدر الجمالی اور حسن بن صباح کے درمیان جو نزار کا حامی تھا مخالفت ہو گئی۔ بدر الجمالی نے حسن بن صباح کو مستنصر کی ملاقات سے بالکل روک دیا۔ اور زبردستی اسے ایک قافلے کے ساتھ شام کی طرف روانہ کر دیا۔ سمندر میں باوجود طوفان برپا ہونے کے حسن بن صباح صحیح و سالم شام پہنچ گیا۔ وہاں سے اصفہان روانہ ہوا جہاں نزار کی امامت کی تبلیغ کرتا رہا۔ اس کے تابعین کا دائرہ روز بروز وسیع ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ اس نے مشہور قلعہ "الموت" پر قبضہ کر لیا۔ اور اپنے ماننے والوں کو ایسی تعلیم دی کہ وہ سب اس کے ادنیٰ اشارے پر اپنی جان فدا کرتے تھے۔ اسی وجہ سے انہیں "فدائی" کہتے ہیں۔ ان لوگوں نے دوسرے اسلامی ممالک میں بھی ایسی دھاک بٹھا دی کہ تمام حکمران ان کے نام سے کانپتے تھے۔ مصر میں نزاریہ فرقے کو نزار کی شکست کے بعد قوت حاصل ہوئی۔ اس فرقے کے افراد نے خلیفہ آمر کو قتل کیا۔

وزیر اعظم افضل نے مستعلی کی حکومت کو مستحکم بنانے کے لیے مصر کے چند امراء کی بھی تائید حاصل کر لی۔ ان میں ابن مصال بھی شریک تھا۔ لیکن اس نے خفیہ طور پر نزار کو افضل کی کارروائی سے مطلع کر دیا بلکہ اس کے ساتھ اسکندریہ روانہ ہو گیا۔ جہاں بدر الجمالی کا غلام افتگین ناصر الدولہ والی تھا۔ اس والی کو نزار اور ابن مصال نے وراثت کی ترغیب دے کر ملا لیا۔

اس کی مدد سے تمام اہل اسکندریہ نزار کا کلمہ پڑھنے لگے اور اس سے بیعت کر لی ۔ نزار نے "المصطفیٰ لدین اللہ" کا لقب اختیار کر کے اسکندریہ پر قبضہ کر لیا۔ اس کے مقابلے کے لیے افضل نے ۴۸۸ھ میں ایک لشکر لے کر اسکندریہ کا محاصرہ کر لیا۔ فریقین میں متعدد معرکے ہوئے ۔ ابتدا میں نزاریوں کو کامیابی ہوئی ۔ اور افضل کا لشکر بہت دور تک پسپا ہو گیا۔ بڑھتے بڑھتے یہ لوگ قاہرہ کے قریب تک پہنچ گئے اور قاہرہ کے شمال میں جتنے شہر تھے انہیں برباد کر دیا ۔ افضل نے دوبارہ جنگ کی تیاری کی۔ اور اسکندریہ کے محاصرے کے لیے روانہ ہوا۔ اس دفعہ اس نے نزار کے اکثر ساتھیوں کو اس سے بدل دیا۔ ابن مصال بھی جو نزار کا بہت بڑا حامی اور مددگار تھا، ایک پریشان خواب کی وجہ سے نزار کا ساتھ چھوڑ کر بحری راستے سے مغرب کی طرف بھاگ گیا۔ اب نزار کا ایک قوی بازو ٹوٹ گیا۔ محاصرے کی تاب نہ لا کر اس نے اور افتگین نے بالآخر ہتھیار ڈال دیے۔ اور اماں کے طالب ہوئے ۔ افضل نے اماں دے دی اور اسکندریہ میں داخل ہو کر دونوں کو گرفتار کر لیا اور قاہرہ بھیج دیا گیا۔ جہاں یہ دونوں قتل کر دیئے گئے ۔

اس فرقے کے بارے میں فلپ حتی کی تحقیق یہ ہے :-

"جس گروہ کو حشیشی کہتے ہیں وہ اسماعیلی فرقے کی ایک نئی تنظیم پر مبنی ہے جس کی ابتدا حسن بن صباح نے کی - ۱۰۹۰ء میں اس نے کوہستان البرز کے اندر بمقام "الموت" ایک قلعہ تعمیر تھا۔ وہ اس کا صدر مقام تھا۔ یہ نام حشیش (بھنگ) سے ماخوذ ہے ۔ کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ وقتاً فوقتاً بھنگ پیا کرتے تھے ۔ یہ ایک خفیہ تنظیم تھی جس کا ایک رئیس کبیر تھا۔ جسے داعی الدعاۃ کہتے تھے۔ داعی الدعاۃ کے ماتحت وہ لوگ تھے جنہیں داعی کبیر قرار دینا چاہیے ۔ پھر عام داعی تھے ۔ سب سے نیچے فدائیوں کی جماعت تھی جو رئیس کبیر کے حکم پر کام کرنے کے لیے تیار ہو جاتے تھے ۔ خواہ اس میں جان سے بھی ہاتھ دھونے پڑیں۔ فدائیوں نے مسیحیوں اور مسلمانوں کے خلاف خنجر کا استعمال یکساں طور پر کیا۔ یہاں تک کہ قتل کو ایک فن بنا دیا۔

جس زمانے میں صلیبی شمال کی طرف سے شام میں داخل ہو رہے تھے حشیشین سمت شمال مشرق سے آرہے تھے۔ سلجوقیوں کا امیر رضوان (وفات ۱۱۱۳ء) سب سے پہلے ان کا حلقہ بگوش بنا۔ اور انہوں نے بانیاس کو اپنا پہلا مستحکم قلعہ بنایا۔ ۱۱۴۰ء تک یہ شمالی شام کے پہاڑوں میں متعدد قلعے حاصل کر چکے تھے۔ اس سلسلے میں ان کا طرز عمل وہی تھا جو ان کے ایرانی ہمسروں کا تھا ۱۱۳۲ء میں قدموس کا قلعہ حاصل کر لیا گیا۔ ولیم صوری کے نزدیک ان کی تعداد ساٹھ ہزار تھی۔ اہل یورپ شام کے رئیس کبیر کو شیخ الجبل کہتے تھے۔ اس کا مرکز مصیاف تھا۔ ۱۱۶۲ء میں تیس سال تک راشد الدین سنان شداس منصب پر فائز رہا یہی شخص تھا جس کے آدمیوں نے دو مرتبہ سلطان صلاح الدین پر قاتلانہ حملے کیے تھے۔ راشد الدین کو دمشق کے ایک وزیر نے اس کام کے لیے رشوت دی تھی جو نور الدین زنگی کا وفادار تھا۔ صلاح الدین نے مصیاف پر حملہ کیا۔ لیکن اسے فتح نہ کر سکا۔ کہا جاتا ہے کہ خود صلاح الدین نے شاہ یروشلم کو قتل کرانے کے لیے حشیشیوں سے کام لیا۔ اور وہ ۱۱۹۲ء میں ایک ایسے گروہ کے ہاتھوں مارا گیا جس نے مسیحیوں کا لباس پہن رکھا تھا۔ ایک اور ممتاز فرنگی کاؤنٹ ریمان ثانی والی طرابلس تھا۔ جو حشیشیوں کے ہاتھوں سے قتل ہوا (۱۱۵۲ء) فرنگیوں کے ایک امیر نے سنان کے جانشین سے اس کے پہاڑی قلعے میں ملاقات کی تھی۔ قلعے کے بلند گنبدوں کی حفاظت سفید پوش حشیشی کر رہے تھے۔ رئیس کی طرف سے اشارہ ہوا تو دو سنتری برجوں سے نیچے چٹانوں پر کود پڑے اور ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ اس کہانی سے واضح ہوتا ہے کہ فدائی صرف مذہبی جوش کی بدولت غیر مشروط اطاعت اور جان نثاری کے لیے تیار رہتے تھے یہ نہ تھا کہ کسی نشہ آور بوٹی سے انہیں مدہوش کر دیا جاتا تھا۔

سینٹ لوئی عکہ میں تھا کہ اس کے پاس حشیشیوں کا وفد پہنچا جو اپنے ساتھ تحائف بھی لایا مثلاً بلور و عنبر کے جانور، ایک انگشتری اور ایک کرتا۔ کرتا بھیجنے کا مطلب یہ تھا کہ لوئی حشیشین سے اتنا ہی قریب ہے جتنا خود اس کا جسم۔ لوئی نے بھی اسی طرح تحائف بھیجے تھے۔ وہ جنگ جو جو عربی بولتے تھے، ترجمانوں کی خدمت انجام دیتے

رہے۔ لوئی ابھی فرانس سے روانہ نہیں ہوا تھا کہ حشیشیوں نے اس پر بھی قاتلانہ حملہ کیا۔ اس سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ ان کا دائرۂ عمل مغربی یورپ تک پھیلا ہوا ہے۔ مشرقی جانب ان کی تاخت منگولیا تک جاری تھی۔ وہاں انہوں نے ایک خانِ اعظم کو قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔ بیبرس نے ان کی شامی پناہ گاہ برباد کر ڈالی جہاں بیٹھ کر وہ سازشیں کرتے تھے اور جہاں قتل کے منصوبے باندھے جاتے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ شامی حشیشیوں کی قوت ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔

معادر و حواشی

لہ ابن خلدون ج ۱ ص ۶۲۔

ٹہ جیرون الاخبار ج ۷ ص ۲۴۵۔

ٹہ تاریخ فاطمیین مصر ص ۲۸۸۔

ٹہ ولیم صوری ج ۲ ص ۱۹۱۔

ٹہ ابوالفداء ج ۳ ص ۱۸۹۔

ٹہ ؍ ج ۲ ص ۶۰۔

ٹہ ابن الاثیر ج ۱۲ ص ۵۱۔

ٹہ تاریخ شام۔ فلپ حتی ص ۶۹۱۔

حرفِ آخر

خلفاء اور ائمہ فاطمیین کا نسب

فاطمی خلافت جب قائم ہوئی تو ہر چہار طرف سے ہجوم اعداء میں گھری ہوئی تھی۔ دو بڑی مضبوط اور محکم و مستحکم حکومتیں ——— بغداد کی عباسی حکومت اور اندلس کی اموی حکومت ——— اس کی سخت ترین مخالف تھیں۔

اس مخالفت کے سلسلے میں فاطمیوں کو زیادہ سے زیادہ ہدف طعن و تشنیع بنایا گیا اور جب کوئی حربہ کارگر نہ ہوا تو یہ محضر تیار کیا گیا کہ یہ لوگ از روئے نسب فاطمی نہیں ہیں محض حصول اقتدار کے لیے انہوں نے اپنے آپ کو فاطمیت سے منسوب کیا ہے

لیکن جس طرح دوسرے ایرادات و اعتراضات جو وزنی تو تھے، لیکن حقیقت سے دور تھے۔ بالآخر کارگر ثابت نہ ہو سکے، اسی طرح نسب کا معاملہ بھی کارگر نہ ہوا۔

حد یہ ہے کہ ابن خلدون تک جو امویوں کی مملکت کا ایک فرد، ان کی رعایا، اور ان کا حد سے زیادہ مداح اور قصیدہ خواں ہے۔ اس داستان کو باطل قرار دیتا ہے۔ اسی طرح مقریزی اور دوسرے معتبر و مستند مورخین نے بھی اس الزام کی دلائل اور براہین کے ساتھ تردید کی ہے۔

اس مسئلے کے دوسرے پہلوؤں پر ہم حسب موقع گفتگو کریں گے۔ اس جگہ اتی صراحت

سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں جو اسماعیلی جماعت کے ایک مخالف مصنف ڈاکٹر زاہد علی صاحب
تاریخ فاطمیین مصر نے پیش کیے ہیں۔ کیونکہ وہ بھی اس افسانے کو تسلیم کرنے سے منکر ہیں،
"فاطمیین کا میمون القداح کی طرف انتساب کس مقصد کے ماتحت ہے؟ یہ
الگ بحث ہے۔ اب رہی یہ بات کہ یہ ائمہ حضرت فاطمہؓ کی نسل سے ہیں یا
نہیں اس کے متعلق مؤرخین میں اختلاف ہے۔ ابن خلدون اور مقریزی اس رائے
پر متفق ہیں کہ یہ فاطمی النسل ہیں ان مؤرخین نے بہ الفاظ واضح صراحت کے ساتھ
تسلیم کیا ہے کہ جس قدر روایتیں خلفائے عبیدیین کے نسب کو باطل کرنے کے لیے
گھڑی گئی ہیں۔ وہ سب موضوع ہیں۔ کیونکہ یہ روایتیں خلفائے بنی عباس کی طرف
وارد کی ہیں۔ اور بنی عباس اور بنی فاطمہ میں سخت مخالفت تھی۔ بنی فاطمہ نے بنی
عباس کے اکثر ممالک مثلاً مغرب، مصر اور شام پر قبضہ کر لیا تھا۔ یہاں تک کہ امیر
بساسیری خود بنی عباس کے دارالخلافہ بغداد میں ایک سال تک بنی فاطمہ کے نام سے
خطبہ پڑھتا رہا۔ یمن اور حجاز میں ان کی دعوت شائع ہو چکی تھی۔ اندلس میں جو بنی امیہ
تھے وہ بنی فاطمہ سے گھبراتے تھے۔ اور ہمیشہ ان کی بیخ کنی کے درپے رہتے تھے یہ اجلال
و اکرام اس شخص کو کس طرح حاصل ہو سکتا تھا۔ جس کا نسب فاطمی نہ ہو؟ کیونکہ بنی فاطمہ
کی اس زمانے میں قلت نہیں تھی۔ اور لوگوں میں ان کی قدر و منزلت بہت بڑھی ہوئی
تھی۔ قرمطی کے واقعے پر ذرا غور کیجیے۔ جس نے اپنے نسب کے متعلق جھوٹا دعوے
کیا تھا۔ آخر اس کا بھانڈا پھوٹ گیا۔ اور اس کی دعوت نابود ہو گئی۔ اور اس کو اپنے
جھوٹے دعوے کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ اگر فاطمیین کا دعویٰ بھی جھوٹا ہوتا تو ان کا بھی یہی انجام
ہوتا۔ حالانکہ ان کی حکومت تقریباً ۲۷۰ سال قائم رہی۔ ان کے زوال کے بعد بھی ان
کے داعی ظاہر ہوتے رہے اور ان کی اولاد کی طرف دعوت دیتے رہے۔ اگر ان کے
اتباع کو ان کے نسب میں ذرا بھی شک ہوتا تو وہ اس قدر تکلیفیں کیوں اٹھاتے؟ اور
اپنے آپ کو ہلاکتوں اور خطروں میں کیوں ڈالتے ——؟

تعجب ہے کہ ابوبکر باقلانی صدر متکلمین کی بھی یہی رائے تھی۔ اگر یہ رائے اس وجہ

سے قائم ہوئی کہ خلفائے فاطمیین ملحد تھے اور صحابہ کو نہیں مانتے تھے تو یہ ضروری نہیں کہ بنی فاطمہ میں شامل ہونے سے وہ الحاد سے بری ہو جائیں۔ خاندانی معاملات کو مذہب میں کوئی دخل نہیں ہو سکتا۔ زمانۂ ستر میں یہ لوگ اپنے مخالفین کے خوف سے پوشیدہ رہتے تھے۔ عوام کو ان کے وجود کا بہت کم علم تھا۔ لہٰذا جب یہ ظاہر ہوئے اور یکے بعد دیگرے ملکوں پر قبضہ کرتے گئے تو بنی عباس کے طرف داروں کو ان کے نسب پر طعن کرنے کا موقع ملا۔ ان لوگوں نے اپنے خلفاء کو خوش کرنے کا یہ طریقہ اختیار کیا ۴۰۲ھ میں خلیفہ قادر باللہ عباسی نے جو محضر بنی فاطمہ کے نسب کے متعلق تیار کرایا۔ اس پر جن جن لوگوں نے دستخط کئے ہیں ان سب کی شہادت صرف سماع پر موقوف تھی۔ انہوں نے کبھی تحقیق نہیں کی۔ مورخین نے بھی جیسی طرح سنا۔ اسی طرح لکھ دیا۔ سب سے بڑی دلیل بنی فاطمہ کے نسب کی صحت کی خلیفہ معتضد باللہ کے خطوط ہیں۔ ان میں ایک خط تو خلیفہ نے ابن مداد کے نام لکھا تھا جو سجلماسہ کا والی تھا۔ دوسرا خط ابن الاغلب کو لکھا گیا تھا جو قیروان کا والی تھا۔ یہ دونوں خط عبداللہ المہدی کو گرفتار کرنے کے لیے روانہ کیے گئے تھے۔ معتضد باللہ بہ نسبت دوسرے لوگوں کے خاندان اہل بیت سے زیادہ واقف تھا۔ اگر اس کو مہدی کے نسب میں ذرا بھی شک ہوتا تو ان کے گرفتار کرنے میں اتنی کوشش کیوں کرتا ہے۔[۳]

اسماعیلیوں کے عقائد، افکار، سلسلۂ دعوت اور دوسرے متعلقہ مباحث پر گفت گو کر کے اب ہم اس حصے کو ختم کرتے ہیں

اس کے بعد دوسرا حصہ شروع ہوتا ہے جس میں فاطمی خلفاء کے حالات و سوانح اختصار کے ساتھ پیش کیے جائیں گے۔

مصادر و حواشی

[۱] ملاحظہ ہو:

مقدمۂ ابن خلدون، ص ۲۱ تا ۲۲، تنبیہ مقریزی، ج ۲ ص ۱۵۹

علاوہ ازیں ابن خلکان، ابو الفدا اور سیوطی وغیرہ نے اس مسئلے پر بحث کی ہے۔

۲؎ مقدمۂ ابن خلدون ص ۲۱۔

ابن الاثیر، ج ۸ ص ۹۰۔

۳؎ تاریخ فاطمین مصر، ص ۵۰۔

○

حصہ دوم

فاطمی خاندان کے فرماں روا

آغاز و انجام

سیرت و کردار، اخلاق و معاشرت، احوال و سوانح

دور حکومت

از ـــــــــــ ۳۶۲ھ

تا ـــــــــــ ۵۶۷ھ
۱۱۷۱ء

حرفِ اوّل

گزشتہ صفحات یعنی کتاب کے پہلے حصے میں اختصار لیکن جامعیت کے ساتھ یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ فاطمی خاندان میں اسماعیلی مسلک کے بنیادی اصول کیا ہیں؟ اس کا نظامِ بیعت کیا ہے؟ اس کے مذہبی اصطلاحات کیا ہیں؟ اور ان اصطلاحات کی وسعتِ مفہوم کہاں تک ہے؟ اس فرقے کے ذیلی فرقے کون کون سے ہیں۔ اور ان میں باہم اختلافِ فکر و نظر کی نوعیت کیا ہے؟ عامۃ المسلمین کے اعتقادات سے اس فرقے کے اعتقادات کہاں تک ہم آہنگ ہیں اور کہاں متصادم؟ اس کی دعوت کی بنیاد کن چیزوں پر ہے؟ اور دعوت کے تدریجی مراحل کیا کیا ہیں؟

ان مباحث کا مطالعہ کر لینے کے بعد اسماعیلی مسلک کا ایک واضح تصور نظر کے سامنے آجاتا ہے۔

اب اس دوسرے حصے میں ایجاز و اختصار کے ساتھ لیکن اس طرح کہ تشنگی نہ محسوس ہو میں نے اس خاندان کے خلفاء اور ائمہ کی داستان بیان کی ہے۔

یہ بیک وقت امام بھی تھے اور تاجدار بھی، داعی بھی تھے اور سالارِ عساکر بھی۔ مطلق العنان بادشاہ بھی تھے۔ اور خدا کا قانون نافذ کرنے کے علمبردار بھی۔ یہ ایک ہی وقت میں دنیا کے بادشاہ بھی تھے اور دین کے امام بھی۔

ان دوگانہ حیثیتوں کو انہوں نے کس طرح نباہا؟

ان دوگانہ حیثیتوں کا اثر ان کی شخصی زندگی پر کہاں تک نمایاں رہا؟
دین و دنیا کو ساتھ لے کر چلنے میں یہ کس حد تک کامیاب رہے؟
ان کی شخصی زندگی کیا تھی؟ خانگی زندگی کیا تھی؟ درباری زندگی کیا تھی؟ اجتماعی زندگی کیا تھی؟
ان کا قول ان کے عمل سے اور ان کا عمل ان کے قول سے کہاں تک اور کس حد تک ہم آہنگ تھا؟

یہ بڑے اہم سوالات ہیں اور ان کا جواب ناگزیر ہے۔
ان سوالات کا جواب اگر نظر انداز کر دیا جاتے تو سلسلۂ تاریخ کی ایک پوری کڑی غائب ہو جاتی اور مباحث میں ایسا خلا محسوس ہوگا۔ جو کسی طرح پر نہیں بھر سکے گا۔

میں نے اس حصے میں عبیداللہ المہدی سے لے کر آخری فاطمی فرمانروا عاضد باللہ تک کے سوانح بیان کیے ہیں۔ اس موقع پر یہ بات میں واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ امامت کا سلسلہ مستنصر باللہ پر ختم ہو گیا۔ ان کے بعد عاضد تک جو چند اصحاب مسندِ حکومت پر متمکن ہوئے بہ امام نہ تھے۔ بلکہ امام مستور کے داعی اور ریجنٹ کی حیثیت رکھتے۔ کوئی اسماعیلی بھی انہیں امام تسلیم نہیں کرتا۔ اگرچہ حکومت حاصل کرنے کے کچھ مدت کے بعد۔ انہوں نے اپنی اصل حیثیت ختم کر دی تھی۔ اور اپنے آپ کو امام سمجھنے لگے تھے۔ اس کی تصدیق ان سکوں سے بھی ہوتی ہے جو اب تک مصر میں اور بعض دوسرے مقامات پر موجود ہیں۔ ابتدائی عہد کے سکوں پر۔ امامت کا دعویٰ نہیں تھا۔ بلکہ اصل حیثیت کا اعتراف تھا ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ موقف بدلتا گیا۔ اور بالآخر معاملہ ادعائے امامت پر ختم ہوا۔

لیکن بہرحال خاندان ایک ہی ہے، نسل ایک ہے خون ایک ہی ہے۔ لہٰذا ہم نے سلسلۂ بیان کو مکمل کرنے کے لیے ضروری سمجھا کہ مہدی سے لے کر عاضد تک کے تمام فرمانرواؤں کے حالات بیان کر دیے ہیں۔ کیونکہ امامت گو مستعلی پر ختم ہو گئی ہو۔ لیکن حکومت عاضد ہی پر ختم ہوئی۔

○

۱

عبیداللہ المہدی

۲۶۰ھ میں پیدا ہوا[۱] ۲۹۷ھ میں ایک فاتح اور فرماں روا کی حیثیت سے منظر عام پر نمودار ہوا۔ اور ۱۴ ربیع الاول ۳۲۲ھ کو اس دنیا سے رخصت ہوگیا[۲]

دنیا کے عظیم وجلیل فرمانرواؤں اور کشور کشاؤں کی صف میں مہدی متعدد اعتبارات سے نمایاں اور ممتاز خصوصیات کا حامل ہے۔ اگر اس نے یمن میں حکومت قائم کی ہوتی تو یہ کوئی سب بڑا کارنامہ نہ ہوتا، اس لیے کہ وہاں فاطمی تحریک جڑ پکڑ چکی تھی۔ وہ شام سے اٹھا۔ چھپتا چھپاتا مصر پہنچا۔ یہاں گرفتار ہوا[۳] لیکن بچ گیا۔ پھر مغرب پہنچا اور یہاں دشمن کے ہاتھ میں پڑ گیا۔ اور عین اس وقت جب کہ اس کی زندگی خطرے میں تھی۔ ابوعبداللہ الشیعی نے جو مہدی کا داعی تھا۔ اور پہلے سے مغرب میں پہنچ چکا تھا۔ اسے موت کے ہاتھوں سے چھین لیا۔ یہ جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑی سے قبائے شہریاری زیب تن کر کے اور تاج خسروی زیب سر کر کے باہر نکلا۔ اور بہت جلد سارے مغرب اقصیٰ کو زیر نگیں بنا لیا[۴] اس کا دائرہ حکومت بحر محیط تک وسیع ہوگیا[۵]

مہدی کی سب سے بڑی خصوصیت اور سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ اس نے ایک ایسے خطے میں حکومت قائم کی۔ جہاں بظاہر احوال وہ ہر طرح کے وسائل سے محروم تھا۔ امیوں نے عباسی انقلاب کے بعد اندلس میں جب حکومت قائم کی۔ تو یہ علاقہ بہت پہلے سے امویوں کے زیر نگیں تھا

یہاں انہیں اپنی حکومت قائم کرنے میں کوئی دشواری نہیں پیش آئی۔ لیکن مغرب میں فاطمیوں کا حکومت قائم کرلینا بہت بڑا کارنامہ تھا۔ یہاں دوست کم تھے۔ دشمن زیادہ۔ مخالفت بہت زیادہ تھی۔ اور تائید و نصرت کا سامان تقریباً ناپید۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ یہاں خوارج بہت مضبوط و مستحکم حالت میں تھے۔ حکومت ان کے پاس تھی۔ فوج ان کے پاس تھی۔ دولت ان کے پاس تھی۔ ان حالات میں ابو عبداللہ الشیعی کا سلسلۂ دعوت قائم کرنا اور کامیاب ہونا عبید اللہ المہدی کا پہنچنا اور مسند شاہی پر متمکن ہوجانا ایک حیرت انگیز واقعہ ہے اور یہ حیرت اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ امویوں اور عباسیوں کے برعکس مہدی نے ان لوگوں پر اور اس علاقے میں حکومت کی جو عقیدۃً اس سے بالکل ہم آہنگ نہ تھے۔

مہدی صرف تاجدار اور فرماں روا ہی نہیں تھا۔ ایک مخصوص تحریک کا داعی اور امام بھی تھا اپنی ان دوگانہ حیثیتوں کو اس نے خوبی اور خوش اسلوبی کے ساتھ نباہا۔

مورخوں نے اسے تسلیم کیا ہے کہ وہ بہادر، شجاع، جری اور دلیر شخص تھا۔ ہجوم اعداء سے سراسیمہ ہونا اس کی سرشت کے خلاف تھا۔ بڑی سے بڑی قوت سے ٹکرا جانا اس کی فطرت تھی۔ وہ حد درجہ رحیم تھا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ خطا کاروں، باغیوں، سرکشوں اور سازش کرنے والوں کو کڑی سے کڑی سزا بھی دیتا تھا۔ اس نے داعی ابو عبداللہ شیعی اور اس کے بھائی ابو العباس کو جب ان کی سازش اور سرکشی ثابت ہوگئی۔ سزائے موت دینے میں ان کے زبردست اور ناقابل فراموش خدمات کے باوجود ایک لمحہ تامل نہیں کیا۔ وہ ذاتی دشمنوں کو تو معاف کرسکتا تھا۔ لیکن جن دشمنوں سے ریاست کو خطرہ ہو انہیں بالکل معاف نہیں کرسکتا تھا

مہدی کو اپنی دعوت کے پھیلانے سے بڑی دلچسپی تھی۔ جب تک وہ مسند شہریاری پر نہیں پہنچا تھا۔ یہ کام خفیہ طور پر کرتا رہا۔ اور جب وہ ایک بڑی مملکت کا سربراہ بن گیا۔ تب بھی اس کام سے غافل نہیں ہوا۔ اس کے داعی بھی دعوت و تبلیغ میں مصروف و مشغول رہے۔ اور وہ خود بھی پورے جوش و خروش سے یہ فریضہ انجام دیتا رہا۔ لیکن اس سلسلے میں ابتدائی دور کی بے اعتدالیوں سے قطع نظر اس نے کبھی جبر و زور سے کام نہیں لیا۔ ہمیشہ موعظہ حسنہ کو پیش نظر رکھا۔ رعایا کے ساتھ اس کا برتاؤ عدل و انصاف اور رواداری کا تھا ورنہ ممکن نہ تھا.

کہ اتنے بڑے علاقے پر اور اتنے زیادہ لوگوں پر حکومت کر سکتا۔ اس کی سیرت اور کردار انگشت نمائی نہیں کی جا سکتی۔ وہ عالی ظرف حکمران، رحم دل آقا اور شریف مسلمان تھا۔

تعمیرات سے بھی مہدی کو گہرا شغف تھا۔ اس نے عظیم الشان نئے شہر مہدیہ[37] اور مہدیہ[38] بسائے۔ آخرالذکر شہر کو تو اس نے مستقر بنا لیا۔ مساجد کی تعمیر بھی کی۔ مدرسے بھی قائم کیے اور نظم مملکت کو بھی استوار کیا[39]۔

مغرب میں دولت فاطمیہ کا قیام عباسی خلافت کے لیے ایک بہت بڑا چیلنج تھا۔ چنانچہ عباسی خلیفہ[40] نے ایک محضر تیار کرایا۔ اور یہ دعویٰ کیا کہ مہدی خاندانِ رسالت سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ لیکن اس دعوے کو قبول عام کبھی بھی نہیں حاصل ہو سکا۔ فاطمی ائمہ اور خلفاء کے خلاف سب سے کمزور اور بودی دلیل یہی تھی۔ اکابر مورخین نے اس دعوے کو بے بنیاد قرار دیا ہے[41]۔ ابن خلدون نے بھی جو امویوں سے خاص تعلق رکھتا ہے اس دعوے کو تسلیم نہیں کیا ہے۔ عہدِ جدید کے مستشرقین بھی فاطمیوں کی صحت نسب کے قائل ہیں[42]۔

بعض قبائل نے[43] مختلف صوبوں کے گورنروں نے، خوارج نے مہدی کے خلاف متعدد مرتبہ بغاوت کی۔ لیکن مہدی کی فراست اور حسنِ تدبیر اور جنگی مہارت کے باعث یہ بغاوتیں ناکام ہوئیں اور پورے مغرب پر اس کا تسلط قائم ہوگیا۔

مہدی کو بڑی آرزو تھی کہ مصر فتح کرے۔ چنانچہ وہاں وسیع پیمانے پر دعوت کا خفیہ سلسلہ شروع ہوگیا۔ یہ دعوت اندر ہی اندر جڑ پکڑتی رہی۔ حتی کہ حکومت مصر کے حکام و عمال تک اسے قبول اور تسلیم کرنے لگے۔ جن سے نامہ و پیام کا سلسلہ باقاعدگی کے ساتھ جاری تھا[44]۔ چنانچہ ۳۰۱ ہجری میں مہدی نے ایک بحری بیڑہ فوج گراں کے ساتھ مصر فتح کرنے بھیجا[45] لیکن اس جنگ میں مہدی کو کامیابی نہ ہو سکی۔ ۳۰۷ ہجری میں اس نے اپنے بیٹے قائم کو مصر پر حملہ کرنے بھیجا لیکن اس مرتبہ بھی کامیابی نہیں ہوئی۔

کامرانی مہدی کے قدم چوم رہی تھی۔ کامیابی اس کے جلو میں چلتی تھی۔ وہ جس طرف کا رخ کرتا تھا۔ فاتح اور غانم بن کر واپس آتا تھا۔ ۳۰۰ ہجری میں مہدی کا قبضہ شہر فاس پر ہوگیا جہاں اب تک ادریسیوں کی حکومت تھی۔ ۳۱۵ ہجری میں اس نے خارجیوں سے[46] ٹکر لی اور

ان کا زور ختم کر دیا۔ بلکہ انہیں کچل کر رکھ دیا۔

خانہ کعبہ سے حجرِ اسود، قرامطہ نے مہدی کے زمانے میں اکھاڑا تھا۔ (۳۱۷ھ) اولیری نے اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :۔

"امیر بغداد نے ۵۰ ہزار دینار حجرِ اسود کی واپسی کے لیے پیش کیے۔ لیکن یہ پیش کش قرامطہ نے مسترد کر دی۔ ابن اثیر اور ابن خلکان کے مطابق مہدی نے قیروان سے قرمطی سردار کو سخت خط لکھا۔ جس میں تحریر کیا۔ "تم نے اہل مکہ، زائرین اور دوسرے لوگوں سے جو کچھ چھینا ہے اگر وہ واپس نہ کیا اور حجر کو اس کی اصل جگہ پر نصب نہ کیا تو ہم دنیا اور آخرت میں تم پر پھٹکار بھیجیں گے۔"

یہ عتاب نامہ مالی پیش کش سے زیادہ موثر ثابت ہوا۔ اور قرامطہ نے حجر اسود واپس کر دیا۔ یہ ذی قعدہ یا ذی الحجہ ۳۳۹ھ کا واقعہ ہے۔ لیکن ابن خلکان کہتا ہے کہ مہدی کا ۳۲۲ھ میں انتقال ہو گیا تھا۔ لہٰذا مہدی کا خط اور قرامطہ کا جواب جعلی ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ فرض کر لیا جائے۔ مہدی کا خط ملتے ہی حجر اسود واپس کر دیا گیا[19]

میسکڈانلڈ کی توجیہہ زیادہ قرینِ صواب ہے۔ وہ مہدی کے خط کو صحیح تسلیم کرتا ہے اور کہتا ہے اس خط سے مہدی کا مقصد قرامطہ کے اس فعل سے تبریٰ کا اظہار تھا۔ خط اسی نے لکھا۔ لیکن اس کی تعمیل چند سال بعد ہوئی[20]

اس خط سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسماعیلی اور قرامطہ شروع میں ایک تھے۔ بعد میں الگ الگ ہوئے[21]

۱۵ ربیع الاول ۳۲۲ھ کو مہدیہ میں مہدی کا انتقال ہوا اور اس کا بیٹا قائم اس کا جانشین بنا[22]

سیوطی نے حسن المحاضرہ میں مہدی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :۔

"مہدی کی عدل گستری، انصاف پسندی، خصائل حمیدہ اور اوصاف ستودہ سے ساری رعیت ایسی گرویدہ ہو گئی تھی کہ اس پر دل و جان قربان

کرنے کی ہمہ وقت تیار رہتی تھی ۲۳؎

مصادر اور حواشی

۱؎ A short History of the Fatemid Khalifate by, De Lacy O, Leary. P. 86

۲؎ نور مبین حبل اللہ المتین (علی محمد جانی محمد چھارا) مطبوعہ بمبئی ص ۱۷۷

۳؎ المعز الفاطمی (ابراہیم جلال) مطبوعہ مصر، ص ۱۹

۴؎ تاریخ اسلام (امیر علی) ص ۴۹۲

۵؎ تاریخ فاطمیین مصر ص ۱۲

۶؎ اتعاظ الحنفاء، ص ۴۴

لیکن اسماعیلی حضرات کے ایک بہت بڑے طبقے کا بیان ہے کہ مہدی نے صرف ابو العباس کے قتل کا حکم دیا تھا۔ ابو عبداللہ شیعی کی ہلاکت کا فرمان اس کے واجب القتل ہونے کے باوجود صادر نہیں کیا۔ اسے خیر خواہی کے جوش میں جبر بن تماشت نے قتل کر دیا تھا۔ (دائرۃ المعارف البستانی ج ۲، ص ۱۵۹)

۷؎ ابن خلدون، ج ۴، ص ۳۷۔

۸؎ معجم البلدان ج ۴، ص ۱۲۱۔

۹؎ ابن اثیر، ج ۸ ص ۳۵۔

۱۰؎ تاریخ اسلام (سید امیر علی) ص ۵۹۴

۱۱؎ خلیفہ المکتفی باللہ عباسی

۱۲؎ المعز الفاطمی (ابراہیم جلال) مطبوعہ مصر ص ۱۸

۱۳؎ The Muslim World, october, 1959. P. 308

۱۴؎ عیون الاخبار، ج ۵ ص ۶۶۔

۱۵؎ عیون الاخبار، ج ۵، ص ۱۸۸

۱۶ المعز الفاطمی (ابراہیم جلال) مطبوعہ مصر ص ۱۹

۱۷ A short History of the Fatimid Khalifate. P. 79

یہ بیڑا دو سو جنگی جہازوں پر مشتمل تھا۔ (ابن خلدون ج ۵ ص ۳۸)

۱۸ عیون الاخبار، ج ۵ ص ۱۴۲۔

۱۹ A short History of the Fatimid Khalifate (O, Leary, P. 86

۲۰ Macdonald.

"Muslim Theology" P. 46, 47

۲۱ A short History of the Fatimid Khalifate (O, Leary) P. 87

۲۲ مہدی کا انتقال تقریباً ۶۶ سال کی عمر میں ہوا۔

(افتتاح الدعوۃ ۲۶۶)

۲۳ نور مبین حبل اللہ المتین (علی محمد جان محمد چنارا) مطبوعہ بمبئی ص ۷۷ (بحوالہ حسن المحاضرہ)

۲

القائم بامر اللہ[1]

القائم اپنے باپ کا صحیح جانشین تھا۔ باپ کی زندگی میں یہ اس کا دستِ راست اور معتمد علیہ تھا۔ میدانِ جنگ میں اس نے اپنے تہوّر اور شجاعت کے جھنڈے گاڑ دیئے تھے۔ باپ کی زندگی میں دو مرتبہ اس نے مصر پر زبردست حملہ کیا[2] مقامی اور داخلی بغاوتوں اور شورشوں کو دبانے اور کچلنے میں بھی اس نے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ تاریخ میں ایک جنگ جو سوسہ کی حیثیت سے وہ امتیاز خاص رکھتا ہے[3] باپ کے انتقال کے بعد ساری ذمہ داریاں اس پر آپڑیں۔ اور کوئی شبہ نہیں کہ اس نے ان گراں بار ذمہ داریوں کو عزیمت و استقامت اور ہمت و جرأت کے ساتھ انجام دیا۔ اس کی سعادت مندی اور شرافت نفس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ تختِ حکومت پر بیٹھنے کے لیے بیٹے باپ کے مرنے کی دعائیں مانگا کرتے ہیں اور اگر وہ نہیں مرتے تو انہیں مار ڈالنے کی سعی و کوشش میں بھی دریغ نہیں کرتے۔ لیکن قائم زندگی بھر باپ کے غم میں سوگوار رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ اسے اپنے باپ سے والہانہ محبت تھی[4] لیکن یہ محبت فرائض کے انجام دینے میں حائل نہیں ہوئی۔ اس نے ملک کے نظم و نسق کو بہتر اور مستحکم کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ وہ دلیر اور مرد میدان تھا[5] اس نے کبھی ہار نہیں مانی۔ بڑے سے بڑے دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔

قائم کے زمانے کا سب سے اہم واقعہ ابویزید خارجی کی شورش اور بغاوت ہے۔ یہ ابویزید خارجی عام مسلمانوں کو کافر سمجھتا تھا[۵۷] اس نے بہت بڑی قوت مجتمع کر لی تھی اور سطے کر لیا تھا کہ ہر قیمت پر اپنی حکومت قائم کرکے دم سے گا۔ یہ عیاش شہ ظالم، سفاک اور نہایت شقی القلب واقع ہوا تھا[۵۸] جو مسلمان مسجدوں میں پناہ گزین ہو جاتے تھے، انہیں بھی اور ان کے بچوں اور عورتوں کو خارجی معاف نہیں کرتے تھے۔ بچوں کو بے دردی کے ساتھ ماؤں کے سامنے ہلاک کر دیتے تھے۔ اور عورتوں کی آبروریزی، شوہروں، بھائیوں، اور باپوں کے سامنے کرنے میں ذرا بھی جھجک محسوس نہیں کرتے تھے[۵۹]

ابویزید نے قائم کی حکومت ختم کرنے کے لیے ایک زبردست حملہ کیا۔ قائم کے لیے یہ حملہ حد درجہ تباہ کن اور مہلک تھا۔ اگر وہ اپنے اوسان بجا نہ رکھتا۔ اگر اس میں غیر معمولی ہمت و جرأت نہ ہوتی۔ اگر وہ موت سے بے پروا اور زندگی سے مستغنی نہ ہوتا تو حکومت بھی جاتی اور وہ خود بھی ہلاک ہوتا۔ لیکن اس نے ہمت ہارنا سیکھا ہی نہیں تھا۔ اس زبردست یورش کا اس شان کے ساتھ اس نے مقابلہ کیا کہ ابویزید کے دانت کھٹے ہو گئے۔ اور وہ جو مہدیہ کا محاصرہ کرکے یہ سمجھ رہا تھا کہ بہت جلد فاتحانہ شان سے شہر میں داخل ہوگا، ذلت اور ناکامی کے ساتھ پسپا ہونے پر مجبور ہو گیا۔

قائم بڑا اولوالعزم شخص تھا۔ اس نے اپنے بحری بیڑے کو بہت زیادہ طاقت ور بنا لیا تھا۔ مورخین کا بیان ہے کہ اگر ابویزید خارجی سے اسے معرکہ آرا نہ ہونا پڑتا تو سارے اٹلی کو فتح کر لیتا[۶۰] پھر اس نے اٹلی کے کئی شہر فتح کر لیے اور اطالیہ کے مشہور ساحلی شہر جنیوا پر قبضہ کر لیا[۶۱] فرنگی جہازوں کو اس نے بار بار شکست دی اور ان کا زور توڑ دیا۔ اطالیہ کے بحری بیڑے بنوفاطمہ کے ساحلی شہروں پر پے بہ پے حملے کیا کرتے تھے۔ قائم نے ان بیڑوں کو ایسی شکستیں دیں کہ سمندر ان کا مرقد بن گیا[۶۲]

قائم اپنی جماعت کا امام تھا۔ اسے تبلیغ سے غیر معمولی دلچسپی تھی۔ اس کی آرزو تھی کہ اس کا مذہب بڑھے اور پھیلے۔ لیکن اس نے جبر و جور سے کبھی کام نہیں لیا۔ مخالفین بھی اسے تسلیم کرتے ہیں کہ وہ نرم خو اور رواداری تھا۔ اس کے زمانے میں فاطمی مذہب کی تبلیغ ایران میں وسیع

پیمانے پر ہوئی اور یہ جدوجہد بہت کامیاب رہی۔ مشہور شاعر رودکی نے بھی اسماعیلی مذہب قبول کر لیا تھا[۱۲] مشہور فلسفی بو علی سینا بھی اسی مذہب کا پیرو تھا[۱۳]

قائم نے ۱۴ سال کی عمر میں تخت خلافت پر جلوس کیا۔ ۱۲ سال سات مہینے حکومت کی۔ ۵۵ سال کی عمر میں ۱۳ شوال ۳۳۴ھ کو اس دنیا سے رخصت سفر باندھا اور عالم بقا کی طرف روانہ ہو گیا۔ مرنے سے پہلے اپنے بیٹے ابو طاہر منصور کے لیے نص کر دی تھی چنانچہ بغیر کسی اختلاف یا کشمکش کے باپ کے بعد وہ مسند امامت پر شان و تجمل کے ساتھ رونق افروز ہو گیا۔

مصادر اور حواشی

۱ از ۳۲۲ھ (۹۳۴ء) تا ۳۳۴ھ (۹۴۶ء)

۲ A short History of the Fatimid Khalifate P. 90

۳ A ibid P. 90

۴ ابن خلدون ج ۴ ص ۴۰

۵ A short History of the Fatimid Khalifate P. 89

۶ ابن اثیر ج ۸ ص ۱۵۰ نیز ملاحظہ ہو اتعاظ الحنفاء ص ۱۰۹

۷ عیون الاخبار ج ۵

۸ 〃 ج ۵

۹ ابن اثیر ج ۸ ص ۱۵۱

۱۰ 〃 ج ۸ ص ۱۵۴

۱۱ نور مبین حبل المتین (علی محمد جان محمد چنارا) ص ۱۸۰۔

۱۲ 〃 〃 〃 ص ۱۷۹۔

۱۳؎ نور مبین حبل المتین (علی محمد جان محمد چنارا) ص ۱۸۱۔

۱۴؎ 〃 〃 〃 ص ۱۸۴۔

۱۵؎ اسماعیلیوں کا دعویٰ یہی ہے بعض اکابر مؤرخین بھی اس دعوے کی تائید کرتے ہیں۔

۳

المنصور باللہ

نام اسماعیل، لقب منصور، مدت خلافت از ۳۳۴ھ تا ۳۴۱ھ (۹۴۵ء ۹۵۲ء) [۱]

فاطمی خلفاء میں منصور اپنی عزیمت و استقامت، ہمت و جرأت اور دلیری و شجاعت کے اعتبار سے مرتبۂ خاص پر فائز تھا۔

ابویزید خارجی جیسے زبردست دشمن جان کا خاتمہ اس کے عہد میں ہوا۔ اس نے بڑی بہادری کے ساتھ دشمن کا بذاتِ خود مقابلہ کیا [۲] اس فیصلہ کن جنگ میں دشمن کے ہزاروں آدمی کام آئے [۳] اگر اس نے ابویزید کی بغاوت فرو نہ کر ڈالی ہوتی تو فاطمی خلافت ختم ہو گئی ہوتی [۴]

صاحب دول الاسلام نے منصور کے تذکرے میں لکھا ہے :۔

نام اسماعیل ۔ لقب منصور

اس نے ابویزید کے لشکر کو شکست فاش دی۔ اور نہب و احراق کا سلسلہ جاری کیا۔

۳۳۴ھ میں منصور قیروان آیا۔ یہاں ابویزید کے اہل و عیال کی جو زندگی سے مایوس اور

مدد ربہ سراسیمہ تھے۔ امن دیا۔ اس کی بیویوں اور اولاد کے وظائف مقرر کیے۔

ابو یزید نے التجا کر کے اپنی بیویوں اور اولاد کو طلب کیا۔ منصور نے یہ استدعا قبول کر لی۔ اور جنگ نہ کرنے کا وعدہ کیا۔ منصور نے اس کے متعلقین اس کے پاس بھیج دیئے۔ جن کے پہنچنے کے بعد عہد بالائے طاق رکھا۔ اور پھر جنگ شروع کر دی۔ اب منصور نے بھی رحم و رعایت کو نظر انداز کر کے جنگ کی۔ وہ ادھر سے ادھر فرار اختیار کرنے لگا۔ پھر ۳۳۶ھ میں اس کے ایک ساتھی نے اس کی بداعتدالیوں اور خباثتوں سے مشتعل ہو کر اس کا سر کاٹا۔[2] اور منصور کی خدمت میں لا کر پیش کیا۔ منصور نے سجدۂ شکر ادا کیا۔

۳۳۹ھ میں منصور نے خلیل بن اسحاق کو صقلیہ (سسلی) کی گورنری سے معزول کیا۔ اور اس کی جگہ علی بن ابی الحسین کلبی کو مامور کیا۔

۳۴۱ھ میں منصور کا انتقال ہوا۔ تقریباً آٹھ سال حکومت کی

بہت بڑا خطیب تھا۔ برجستہ فصیح و بلیغ خطبہ دینے میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔ ابو یزید خارجی کے ساتھ اس نے جو کچھ کیا وہ اس کے تدبر اور تعقل کی بہت بڑی دلیل ہے

منصور کے اوصاف میں سب سے بڑا وصف یہ تھا کہ سختی کے موقع پر سختی اگر کرتا تھا۔ تو داد و دہش کے موقع پر تھیلیوں کا منہ بھی کھول دیتا تھا۔[3] تقریر بڑی دلنشیں ہوتی۔ پہلے سے تیار کیے بغیر ولولہ انگیز تقریر کرنے میں ید طولیٰ رکھتا تھا۔[4] اس کے عہد میں جتنی بھی بغاوتیں اور شورشیں ہوئیں۔ بڑی خوبی سے اس نے ان کا خاتمہ کر دیا۔ یہ خود مذہبی شخص تھا۔ لیکن اس کی حکومت بغداد کے برعکس خالص "سیکولر" تھی۔

مصادر اور حواشی

[1] تاریخ دول الاسلام۔ تالیف رزق اللہ مطبوعہ مصر۔ ۱۹۰۷ء

[2] ابن اثیر ج ۸ ص ۱۷۱

[3] ابن خلدون ج ۴ ص ۴۳

[4] اتعاظ الحنفاء ص ۵۸۔

ثہ تاریخ دول الاسلام ۔ تالیف رزق اللہ مطبوعہ مصر ۱۹۰۷ء
ص ۳۲۶ ، ۳۲۷ ۔

لہ Lane Poole . P. 98.

شہ ابن خلکان ج ۱ ص ۷۷

ءہ A short History of the Fatimid Khalifate P. 92

۴

المعز لدین اللہ

فاطمی خلفا میں سے المعز۔ بڑا منچلا۔ دلیر اور مرد میدان واقع ہوا تھا۔ یہی شخص ہے جو فاطمی خلافت کو مغرب اقصیٰ سے منتقل کر کے مصر لایا [1]۔ یہی ہے جس نے قاہرہ کا عظیم و جلیل شہر تعمیر کیا [2]۔ یہی ہے جس نے جامع ازہر قائم کر کے سارے عالم اسلام کے لیے علوم و فنون کے دروازے کھول دیئے [3]۔ یہی ہے جس کے آزاد کردہ غلام جوہر الصقلی نے جو مسلم خاندان کا ایک فرد تھا۔ نہ صرف مصر فتح کیا۔ بلکہ فاطمی خلافت کا پرچم لہراتا ہوا سارے عرب پر چھا گیا۔

معز دوستوں کا دوست، دشمنوں کا دشمن تھا۔ اپنے عزیزوں کو کاروبار مملکت سے دور رکھتا تھا [4]۔

معز کے عہد میں بغاوتیں ہوتیں۔ شورشیں ہوئیں۔ ہنگامے ہوئے۔ لیکن ان سے نہ وہ ہراساں ہوا۔ نہ خائف۔ اس نے نہایت پامردی اور استقلال سے ان تخریبی سرگرمیوں کا مقابلہ کیا۔ اور غالب رہا۔

سسلی (صقلیہ) پر بنو فاطمہ کا قبضہ مہدی کے عہد میں ہو گیا تھا۔ لیکن اس کے بعض حصے ابتک رومیوں کے قبضے میں تھے۔ ۳۵۱ ہجری میں ایک مضبوط و مستحکم قلعہ جس پر فاطمی

فوجوں نے فتح کیا۔ اور اس کا نام معزیہ رکھا۔ اور کئی جنگیں بھی اس علاقے میں ہوئیں۔ ان میں فاطمی فوجوں کا پلا بھاری رہا۔ اسی طرح مغرب اقصیٰ کا سارا علاقہ بھی سبتہ کے سوا فاطمی حکومت کے زیرنگین ہو گیا [۹]

۱۷ ربیع الاول ۳۶۳ھ کو معز کا انتقال معسکر بلبیس میں ہوا [۱۰]

۳۴۱ھ میں تخت نشین ہوا۔ ۳۶۵ھ میں وفات پائی [۱۱]

معز کے عہد کی بہت بڑی سیاسی اصلاح عدالت بالا کا قیام ہے جس میں بڑے بڑے عہدے داروں، منصب داروں۔ وزیروں اور امراء و اعیان کے خلاف شکایتیں پیش ہوتی تھیں۔ اس عدالت کا رکن رکین جوہر بھی تھا۔ اس عدالت کا فیصلہ توثیق کے لیے خلیفہ (معز) کے پاس بھیجا جاتا تھا۔ اس کی منظوری کے بعد نافذ کر دیا جاتا تھا [۱۲]

۳۶۲ھ سے معز خود مصر میں آکر رہنے لگا۔ کیونکہ قاہرہ (یا معزیہ) کی تعمیر مکمل ہو چکی تھی معز اگرچہ اپنے مذہب کا داعی اور اپنی تحریک کا مبلغ اور اپنی جماعت کا امام مطلق تھا لیکن اس نے تبلیغ کے سلسلے میں کبھی جبر و جور سے کام نہیں لیا۔ حد درجہ روادار، متحمل اور بردبار شخص تھا [۱۳] ساتھ ہی ساتھ حد درجہ خدا ترس، عابد و زاہد اور شب زندہ دار بھی تھا [۱۴] غلاموں تک کے ساتھ اس کا برتاؤ اپنایت کا بہلو لیے ہوئے تھا [۱۵] مساوات عامہ اس کی سرشت تھی۔ اونچ پنچ کا وہ ذرا بھی قائل نہیں تھا [۱۶] ملک کے حالات سے باخبر رہتا تھا وقائع نویسوں۔ اور خبر رساں لوگوں سے واقعات کی تفصیلات سنا کرتا تھا۔ جوہر کو بھی یہ اعزاز حاصل تھا کہ اس سے الگ مجلس میں بیٹھ کر ملک کے داخلی اور خارجی وقائع اور حوادث سنتا اور ان پر بحث و گفت گو کیا کرتا تھا [۱۷]

معز کئی زبانوں کا ماہر تھا۔ عربی تو اس کی مادری زبان تھی۔ بربری، سوڈانی، اطالوی اور صقلی زبان بھی اچھی طرح جانتا تھا۔ اصحاب علم سے اسے خاص شغف تھا۔ گراں قیمت پر کتابیں خریدتا تھا۔ اہل علم کی قدر دانی اور حوصلہ افزائی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتا معز کے عہد میں نیا بندوبست جاری ہوا۔ محاصل کا نظام بدلا۔ اس کی بڑی کوشش کی جاتی تھی کہ ٹیکس دہندگان کو کسی طرح کی جائز شکایت نہ پیدا ہو۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے دور میں

آمدنی بہت بڑھ گئی۔ فسطاط کی چنگی سے روزانہ آمدنی ۵۰ ہزار سے سوا لاکھ دینار تک پہنچ گئی[14][15]

مصادر اور حواشی

[1] تاریخ جواہر الصقلی، قائد المعز لدین اللہ الفاطمی (علی ابراہیم حسن) مطبوعہ مصر ص ۱۰۴

[2] اتعاظ الحنفاء، ص ۶۶

[3] جرجی زیدان: تاریخ مصر الحدیث مطبوعہ مصر ص ۲۱۱۔

[4] المعز لدین اللہ۔ مطبوعہ مصر ص ۶۷

[5] ابن خلکان ج ۲، ص ۱۰۲

[6] تاریخ دول الاسلام حصہ اول از رزق اللہ مطبوعہ مصر ص ۳۳۳

[7] A short History of the Fatimid Khalifate (O'Leary) P. 105

[8] ابن اثیر ج ۸ ص ۲۶۳۔

[9] مقریزی، ج ۲، ص ۱۶۶۔

[10] عیون الاخبار، ج ۶، ص ۱۸۸۔

[11] اتعاظ الحنفاء ص ۹۸۔

[12] المعز الفاطمی، مطبوعہ مصر، ص ۱۱۴۔

[13] مقریزی، ج ۲، ص ۱۶۷۔

[14] A short History of the Fatimid Khalifate P. 114.

ﮯ۱۵

المعز لدین اللہ کی سیرت، کردار، شخصیت۔ اندلیز جہاں بانی نظام حکومت اور شاہانہ تمکنت سے متعلق ابراہیم جلال نے ایک مختصر لیکن نہایت جامع اور مستند کتاب

"سیرت المعز لدین اللہ"

کے نام سے لکھی ہے جو مصر سے شائع ہوئی ہے۔ اور اہل علم کے حلقے میں بہت زیادہ پسند کی گئی ہے۔ یہ کتاب اس قابل ہے کہ اس کا ترجمہ اردو زبان میں شائع کیا جائے تعجب ہے کہ اسماعیلی حضرات نے اب تک اس کار اہم کی طرف توجہ نہیں کی۔

⑤
العزیز باللہ

نام نزار، لقب عزیز باللہ

معز کا خطبہ حرمین میں بھی پڑھا جاتا تھا مگر اس کا بند ہوگیا، لیکن اس کی شوکت و سطوت کے سامنے یہ شورشیں بے اثر رہیں، اور خطبہ پھر جاری آگیا۔

شورشیں ہوئیں دب گئیں۔

۳۸۶ھ میں اس کا انتقال ہوا، مدت خلافت ۲۱ سال ڈیڑھ ماہ، یہ غیر مسلموں کے ساتھ حد درجہ رواداری کا برتاؤ کرتا تھا، عیسائیوں اور یہودیوں کو اس نے مناصب جلیلہ پر فائز کیا تھا، اس کی رواداری سے فائدہ اٹھا کر یہودی اور مسیحی، مسلمانوں پہ زیادتی کرنے لگے تھے، ہیں

عزیز باللہ، رحم وکرم، جود و سخا، اور بذل و عطا میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا، ماہ رمضان میں اس نے مساجد میں افطاری کا بندوبست کیا، اس کی حکومت کا تختہ الٹنے کی کئی بار کوششیں کی گئیں، لیکن یہ اپنے تدبر اور فراست سے غالب آگیا۔

غیر مسلموں کے ساتھ، عزیز کا برتاؤ خاص طور پہ بہت زیادہ روادارانہ تھا، اس نے یہودیوں اور عیسائیوں کو وزارت اور امارت کے مناصب پہ فائز کیا،

عزیز کی ایک اور خصوصیت ہے جسے نہ صرف کسی طرح نظرانداز نہیں کیا جا سکتا، بلکہ جو غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ اس نقطۂ نظر کا قائل تھا کہ اسلام میں مرتد کی سزا قتل نہیں ہے، جب تک وہ مفسد ثابت نہ ہو جائے، حکومت اس سے کوئی تعرض نہیں کرے گی۔

یہ نقطۂ نظر قرآن، اور سنت نبوی سے پورے طور پر ہم آہنگ ہے، قرآن نے "لکم دینکم ولی دین" کہہ کر گویا یہ اعلان کر دیا ہے کہ مذہب ذاتی رجحان کا معاملہ ہے اور "لا اکراہ فی الدین" کہہ کر یہ اعلان کر دیا ہے کہ اسلام کا نہ قبول کرنا، یا قبول کر کے اسے ترک کر دینا، کسی سزا کا مستوجب نہیں قرار دیتا، لیکن فقہاء کرام کی ایک بہت بڑی جماعت جس پر تقریباً تمام فرقوں کا اتفاق ہے اس طرف گئی ہے کہ مرتد کی سزا قتل ہے۔ ؎

بہرحال عزیز اس مسئلہ کا قائل نہیں تھا۔ اس کے عہد میں ایک شخص نے عیسائی مذہب قبول کر لیا، اس کے خلاف شورش ہوئی، اور سزائے موت دینے کا مطالبہ کیا گیا لیکن عزیز نے اس مطالبہ کو نہیں مانا، اور اس شخص کو سزا نہیں دی۔ ؎

اس واقعہ سے دو امور پر روشنی پڑتی ہے۔

ایک تو یہ کہ عزیز ملکۂ اجتہاد بھی رکھتا تھا، اس کے اجتہاد سے اتفاق یا اختلاف یہ ایک الگ اور جداگانہ چیز ہے۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کا اجتہاد ایک وزن رکھتا تھا۔

دوسری بات یہ کہ اس واقعہ سے وہ روایات باطل ثابت ہو جاتی ہیں جن کی رو سے عزیز پر اور دوسرے فاطمی خلفاء پر یہ الزام لگایا گیا ہے کہ اپنے عقیدے کی ترویج و تبلیغ میں جبر و جور سے کام لیتے تھے۔ اگر یہ جبر و جور کے خوگر اور قائل ہوتے غیر مسلموں کو ان کے عہد میں اتنی آزادیاں اور سہولتیں نہیں حاصل ہو سکتی تھیں۔ خاص طور پر مرتد کو

عزیز کے عہد کو بجا طور پر عہد زریں کہا جاتا ہے۔ اس لئے کہ اس کے زمانے میں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہُن برس رہا ہے۔ غربت اور فاقہ کشی ختم ہو گئی تھی مرفہ الحالی اور فارغ البالی کا طرف دور دورہ تھا۔ ؎

عزیز کو عمارات کا بھی بہت شوق تھا، اس نے کئی شاندار اور یادگار عمارتیں تعمیر

کرائیں۔ جن میں جامع الازہر خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔[۱] اسے تفریحات اور ادب وانشا سے بھی غیر معمولی دلچسپی تھی۔[۲]

عزیز کے چند خصوصیات:-

① پورا نام ابوالمنصور نزار العزیز باللہ تھا۔ ۲۰ سال کی عمر میں خلیفہ بنا۔

② اس کی مہر پر " ینصر العزیز الجبار بنصر الامام النزار" کا نقش کندہ تھا۔

③ بقول لین پول عزیز کے سکے مصر (فسطاط) میں ۳۶۵ھ سے ۳۸۶ھ تک فلسطین (رملہ) میں ۳۶۸ھ سے ۳۸۲ھ تک، مہدیہ میں ۳۷۰ھ سے ۳۸۴ھ تک افریقہ اور منصوریہ میں ۳۶۷ھ سے ۳۸۶ھ تک، صقلیہ میں ۳۶۶ھ سے ۳۷۷ھ تک طرابلس میں ۳۷۴ھ سے ۳۸۰ھ تک اور مکہ معظمہ میں ۳۶۶ھ میں ڈھالے گئے۔

مصر کے دار الضرب میں ہر سال سکے ڈھالے جاتے تھے، دوسرے شہروں کے دار الضرب میں حسب ضرورت۔

④ جتنے سکے اہلِ یورپ کے ہاتھ آئے ہیں سب طلائی ہیں مگر نقرئی بھی ڈھالے جاتے تھے۔

سخی، کریم النفس، شجاع، دانشمند، بردبار، صابر، خوش اخلاق، کثیر العفو، عفو کو انتقام پر ترجیح دینا، مغلوب دشمن پر رحم کرنا، محتاج کو جود و کرم سے تونگر بنا دیتا۔

⑤ عالم، فاضل، جلیل القدر ادیب اور شاعر تھا۔

⑥ ایرانی صنعت کے نئی قسم کے زریں عمامے طلائی مرصع کمر، اور دوسری بہت سی چیزیں قصرِ حکومت میں داخل کیں۔

⑦ ایک بار صرف ایک بڑے ایرانی ریشمی ساخت کے پردے کے لئے ایک لاکھ اسی ہزار روپیہ خرچ کیا گیا۔

⑧ اس کے زمانہ میں جامع الازہر کو غیر معمولی ترقی ہوئی، شروع میں صرف ۳۵ طلبا تھے، الازہر کے نام میں ایک خاص رمز ہے، اسماعیلی ائمہ نے بنو فاطمہ ہونے کے باعث ایسا نام تجویز کیا جو ان کے حسب نسب پر دلالت کرے، حضرت فاطمہ کا لقب الزہرا مشہور و روشن ہے ہی۔

کے نام پر عزت و احترام کے لحاظ سے اسے اذہر کے نام سے موسوم کیا، الزہرا صیغہ مؤنث ہے، صیغہ مذکر اذہر ہے بہت جلد یہ ایک بہت بڑی دانش گاہ بن گیا۔ اس دارالعلوم میں ۱۷۱۲ پروفیسر درس دیتے تھے، طلباء کی تعداد ۹۷۵۸ تھی۔

اب نہ نظامیہ بغداد ہے، نہ اصفہان، نہ قرطبہ، نہ غرناطہ کے دارالعلوم، لیکن الازہر بدستور موجود ہے، شاید یہ حسن نیت کا پھل ہے ۸ه

معادرہ حواشی

۱ه $\frac{\text{۳۶۵}}{\text{۹۷۵}}$ — $\frac{\text{۳۸۶}}{\text{۹۹۶}}$

۲ه تاریخ دول الاسلام۔ حصہ اول، رزق اللہ مطبوعہ مصر، ۱۹۰۷ء ص ۱۱۵

۳ه قتل مرتد کا مسئلہ فقہ اسلام کا بہت اہم اور معرکہ آرا مسئلہ ہے اس پر ہر دور میں بحث و گفتگو ہوتی رہی ہے، اور اب تک یہ سلسلہ جاری ہے۔

۴ه Lane Poole p. ۱۹۹

۵ه ابن خلکان ج ۲، ص ۱۵۲

۶ه ابن خلکان ج ۲، ص ۱۵۲

۷ه A short History of the Fatimid Khalifate P. 115

۸ه توزیمین، جبل المتین، (علی محمد جان محمد چنارا) طبع بمبئی، ص ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶؛

○

(۶)

الحاکم بامر اللہ

نام منصور، ابو علی، لقب حاکم بامر اللہ،

مسند حکومت پر متمکن ہونے کے تھوڑی ہی مدت کے بعد اس پر جنونی کیفیت طاری ہوگئی۔ اس کا برتاؤ یہودیوں اور عیسائیوں کے ساتھ روادارانہ نہیں بلکہ معاندانہ تھا، اس نے انہیں ایک خاص لباس پہننے پر مجبور کر دیا تھا، گھوڑے کی سواری بھی ان کے لئے ممنوع کر دی؛ یہ حکم بھی نافذ کیا کہ یہودی اور عیسائی کسی مسلمان سے خدمت نہیں لے سکتے، نہ کسی مسلمان غلام یا لونڈی کو خرید سکتے ہیں، اس نے کنیسۂ قمامہ منہدم کر دیا تھا، لیکن بعد میں اس کی از سر نو تعمیر کرا دی، اس کا ایک حکم یہ بھی تھا کہ لوگ دن میں دوکانیں بند رکھیں صرف رات کو کھولیں، عورتوں کو گھر سے نکلنے کی ممانعت کر دی تھی۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس نے الوہیت کا دعویٰ کیا تھا، اور اپنے بندگان خاص کے نام درج رجسٹر کرائے تھے۔ صرف قاہرہ کے بندگان خاص کی تعداد ۱۶ ہزار سے تجاوز تھی۔

۴۱۱ھ میں ایک روایت کے مطابق اس کی بہن ست الملک نے اسے قتل کرا دیا لیکن اصحاب حاکم اب تک اس کی زندگی کے قائل ہیں کہتے ہیں وہ چشم مردم سے نہاں ہوگیا ہے۔ آخر زمانے میں ظہور ہوگا۔ جبل لبنان اور بلاد شام کے دروزی اسی کے پیرو ہیں۔ ؎

حاکم پر اس کے والد عزیز نے عہد طفولیت ہی میں یعنی جب اس کی عمر صرف آٹھ سال کی تھی نص کر کے ولی عہد نامزد کر دیا تھا ۔ؔ

حاکم کے عہد میں بھی شورشیں اور بغاوتیں ہوئیں لیکن دبا دی گئیں۔ ۳۸۹ھ میں اس کے لشکر نے رومیوں کے بہت بڑے لشکر کو شکست فاش دے کر مسلمانوں کی سطوت و شوکت کا سکہ بٹھا دیا ۔ؔ

حاکم طبعاً سخت مزاج آدمی تھا، دینی حمیت اور ملی غیرت اس میں بہت زیادہ تھی اس لئے اس نے عیسائیوں اور یہودیوں کو مسلمان خادم رکھنے اور مسلمان باندی خریدنے سے منع کر دیا۔ چونکہ انتہا پسند تھا اس لئے اپنی پالیسی کے نافذ کرنے میں سخت رویہ بھی بعض دفعہ اختیار کیا اس نے شراب کی نہایت سختی کے ساتھ فرمان نافذ کر کے ممانعت کر دی تھی۔ انگور کی خریداری تک بند کر دی، اور انگور کی بیلوں کو قطع کر دیا، شہد کے ہزاروں مٹکے دریائے نیل میں بہا دیئے تاکہ اس سے بھی شراب نہ کشید کی جا سکے، ؔ

لہو و لعب، عریانی، بے حیائی اور فحاشی کا حاکم دشمن تھا، جو ممنوع ہو گیا۔ بازیاں خلاف دستور قرار پائیں، حماموں میں برہنہ داخل ہونے کی سخت تعزیر رکھی، عورتوں کے لئے ممانعت تھی کہ آرائش جمال کر کے گھر سے باہر قدم نہ نکالیں، اس حکم کی بڑی سختی سے تعمیل کرائی جاتی تھی اور ان کو ویسے باہر جانے کا حکم بھی نہیں تھا، ؔ

اہل السنت کے ساتھ بھی اس کا برتاؤ اپنے پیش رو خلفاء کے برعکس سخت تھا لیکن بعد میں یہ سختی نرمی سے بدل گئی، (۴۰۰ھ)

حاکم کے زمانے میں ابو رکوہ کی بغاوت بڑی سخت تھی، لیکن بالآخر کچل دی گئی۔ عباسی خلیفہ قادر باللہ نے ایک محضر بنو فاطمہ کے ابطال نسب سے متعلق تیار کرایا، اور اسے خوب اشاعت دی، لیکن ابن خلدون نے جو ہرگز بنو فاطمہ کا طرفدار نہیں تھا سخت الفاظ میں اس کی تردید کی ہے ؔ

مزاج کا تیکھا پن بعض وقت احکام قتل پر منتج ہوتا تھا، چنانچہ حاکم نے اپنے بہت سے وزیروں، امیروں، سرداروں، لاسیوں، خادموں، قاضیوں، اور داعیوں کو کسی بات

برہم یا خفا ہوکر قتل کرا دیا، [59]

حاکم کو علمی اور تحقیقی کاموں سے بھی شغف تھا، چنانچہ اس نے ایک بیت الحکمۃ قائم کی تھا، جس میں ہر علم وفن کے لوگ موجود تھے۔ اور انہیں گراں قدر مشاہرہ ملتا تھا، ساتھ ہی ایک کتب خانہ بھی تھا۔ کئی شاندار مسجدیں بھی تعمیر کیں، اور بھی بہت سے رفاہی کارنامے انجام دیے۔ [60]

حاکم متضاد اوصاف وخصائص کا حامل تھا، ایک طرف مزاج کی سختی، اور قہر وجبر کا یہ عالم، دوسری طرف، انتہائی سادہ زندگی بسر کرتا، سادہ لباس پہنتا، اپنے سامنے کسی کو سربسجود ہونے کی سخت ممانعت کرتا۔

ہاتھ تک چومنے کی اجازت نہ دیتا، عدل پسندی کی یہ کیفیت تھی کہ ایک ملزم کی طرح اپنے قاضی کے سامنے حاضر ہوا۔ اور اپنے خلاف فیصلہ سن کر اس کی تعمیل بہ خندہ پیشانی کی [61]

حاکم کے بارے میں یہ خیال عام ہے کہ وہ خدائی کا دعویٰ کرکے کافر بن بیٹھا تھا، یا اس نے نمازیں ساقط کر دیں تھیں۔ اس نے جملہ اسلامی فرقوں کے لئے آزادی کامل کا اعلان کر دیا تھا اور اس پر عامل بھی تھا [62] امتناع شراب بعد قمار بازی کے خلاف اقدامات، اور لہو ولعب سے متعلق احکام مؤید اس بات کا ثبوت ہیں کہ وہ پکا مسلمان تھا [63] موسیقی کو بھی گوارا نہیں کر سکتا تھا، [64] نجوم کا زبردست ماہر تھا۔ [65] اہل کتاب کے ساتھ رواداری پر مائل ہوتا تو انہیں نوازنے میں ضرورت سے زیادہ عالی ظرفی اور دریادلی کا مظاہرہ کرتا [66]

۲۷ شوال ۴۱۱ھ کو حاکم غائب (یا قتل) ہوا، ۱۰ ذی الحجہ کو اس کا بیٹا ظاہر، جس پر اس نے نص کر دی تھی۔ تخت پر بیٹھا، سب نے بطیب خاطر اس کی بیعت کر لی [67]

یہ جو مشہور ہے کہ حاکم کے قتل میں اس کی بہن ست الملک کا ہاتھ تھا۔ بعض اکابر مؤرخین اس کی تردید کرتے ہیں، اور ست الملک کو بے قصور قرار دیتے ہیں [68]

حاکم کے چند خصوصیات:۔

۱ برجوان بے انتہا با اقتدار وزیر تھا اور حاکم پر چھایا ہوا تھا، اس کا ارادہ بقول اولیری حاکم کو شاہی محل میں قید کرنے کا تھا، چنانچہ جوہر کے بیٹے حسین کی صلاح کے مطابق حاکم۔

اسے قتل کروایا، اور زمام حکومت ہاتھ میں لی، بلوہ ہوا حاکم باہر آیا۔ اس نے کہا۔

(۱) برجوان نے میرے خلاف سازش کی تھی، اس لئے قتل کیا گیا۔

یہ سنتے ہی بلوائی ٹھنڈے پڑ گئے، بلوہ فرو ہوگیا۔

(۲) برجوان کے عہدے پر ایک عیسائی فہد بن ابراہیم کو مقرر کیا۔

(۳) حسین ابن جوہر کو قائد القواد بنایا،

(۴) عام عیسائیوں اور یہودیوں سے حد درجہ رواداری کا برتاؤ کیا۔

(۵) ۳۸۳ھ میں جامع راشدہ کی تاسیس کی،

(۶) شہر کی جملہ مساجد کے انتظامات و استحکامات کے لئے سالانہ وظائف اور بیش بہا تحائف دیئے۔

(۷) تعمیرات کا انتہائی شوق تھا۔

(۸) ۳۹۵ھ میں بیت الحکمت قائم کیا، جو دار العلم کے نام سے بھی مشہور تھا، طلبہ کے لئے نصاب تعلیم و تربیت اعلیٰ پیمانے کا تیار کیا گیا لائق و فاضل معلمین کا بندوبست کیا گیا، جو لوگ اس عہدے کے لئے منتخب ہوئے ان کو پہلے حضرت امام کی خدمت میں حاضر ہونا پڑتا، اگر ان کے سامنے فقہ حدیث فلسفہ، جغرافیہ، ہندسہ، اور نجوم کی گفتگو میں کامیاب ہو جاتے تو معلم کے عہدے پر مامور ہوتے نیز طلبہ کے لئے کاغذ، سیاہی، قلم، اور جملہ ضروریات کا بندوبست مفت کیا جاتا،

(۹) بنو فاطمہ کے عہد میں قاضی القضاۃ کے بعد داعی الدعاۃ کا عہدہ تھا دونوں ایک ہی طرح کی سفید پوشاک میں ملبوس رہا کرتے تھے،

(۱۰) امام عزیز نے باب الفتوح کے قریب ایک مسجد کی تعمیر ۳۸۰ھ میں شروع کی تھی کہ وفات پاگیا حاکم نے ۴۰۳ھ میں اسے تکمیل تک پہنچایا مصارف چالیس ہزار اشرفی یہ مسجد، جامع حاکم کے نام سے مشہور ہے، اور شکستہ حالت میں اب بھی مصر کے زائرین اسے دیکھ سکتے ہیں،

(۱۱) مارگولیتھ نے حاکم کو جامع الضد کا بانی ثانی لکھا ہے حاکم نے تین مسجدیں اور ایک کتب خانہ

تعمیر کرایا ، یہ کتب خانہ قصر اشرف میں واقع تھا جس کا وقف نامہ آج تک محفوظ ہے ۔ ازہر کا وقف نامہ بھی محفوظ ہے ۔

(١٢) ایک دار المباحثہ بھی تعمیر کرایا تھا جس میں فقہ کے چاروں ماہرین تحقیقات و تنقیحات میں مصروف رہتے ۔

(١٣) فلاح عوام سے دلچسپی ، حد درجہ بارعب شب بیداری کی عادت تھی ، دربار بھی رات کو لگا کرتا تھا ۔

(١٤) بازار میں بیوپاریوں کے آلات و اوزان حاکم خود جانچا کرتا تھا ۔

(١٥) گانے بجانے والوں اور نجومیوں کو جلاوطن کر دیا ،

(١٦) عیسائیوں پر سختی کے باوجود قابلیت و اہلیت کے لحاظ سے بڑے مناصب بھی دئے جاتے تھے مثلاً وزیر عابدون ، اور وزیر ازعا الشانی ،

(١٧) ٣٩٦ھ میں اسپین کی اموی حکومت کی شہزادہ ابورکوہ کا فتنہ اٹھا یہ فاطمیوں کے خلاف لوگوں کو بھڑکاتا تھا ۔ کئی جنگیں ہوئیں ، آخر ہارا ، بعد میں نوبیا سے گرفتار کر کے لایا گیا ۔ اور قتل کیا گیا ۔

(١٨) بقول ابن خلکان ، حاکم نے تبرے کی ممانعت کا فرمان صادر کیا ۔ صحابہ کے ساتھ رضی اللہ عنہم لکھنے کی تاکید کی ۔ حضرت علی کے لئے علیہ السلام ۔[4]

(١٩) حاکم نجوم کا زبردست ماہر تھا ، [5]

مصادر و حواشی

[1] ٣٨٦ھ / ٩٩٦ء - ٤١١ھ / ١٠٢٠ء

[2] تاریخ دول الاسلام حصہ اول ، رزق اللہ مطبوعہ مصر ١٩٠٧ء ص ٣٢٨

[3] عیون الاخبار ، ج ٦ ص ٢٠٢ ، نیز ملاحظہ ہو ، ابن اثیر ج ٩ ، ص ٥٠ اور ابن خلکان ج ٢ ص ١٥٣

[4] ابن اثیر ج ٩ ، ص ٥٩

[5] ابن خلکان ، ج ١ ، ص ١٦٦

۶ مقریزی، ج ۳، ص ۳۳

۷ مقریزی ج ۲، ص ۱۵۹

۸ مقدمہ ابن خلدون، ص ۲۳

۹ اتعاظ الحنفاء، ص ۱۴۴

۱۰ مقریزی، ج ۱، ص ۳۳۴

۱۱ A short History of the Fatimed Khalifate, P. 165

۱۲ ابن خلدون، ج ۱، ص ۶۰

۱۳ Lane Poole, P 126

۱۴ A short History of the Fatimid Khalifate P. 162

۱۵ زہر المعانی (عن المتین، (ص محمد جان محمد چانڈیا) طبع بمبئی، ص ۱۹۷

۱۶ A short History of the Fatimid Khalifate P. 132

۱۷ ابن خلکان، ج ۱، ص ۳۶۷

۱۸ O, Leary, P. 185

۱۹ زہر المعانی بمبئی، ص ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۵

○

(۷)

الظاہر لاعزاز دین اللہ

نام ابوالحسن علی بن منصور، لقب، الظاہر لاعزاز دین اللہ صرف ۷ سال کی عمر میں مسند امامت پر پہنچا۔ اس کی پھوپھی شہزادی ست الملک نے اس کی تربیت کی،

اس کی سیرت جمیل اور سیاست حسین تھی۔ رعایا کے لیے عادل و منصف، البتہ ذرا آرام طلب تھا۔ تقریباً ۱۶ سال حکومت کی، ۴۱۱ھ

اس کے عہد میں مصر خوفناک قحط سے دوچار ہوا جو ۴۱۶ھ سے ۴۱۸ھ تک جاری رہا۔ ۴۱۶ھ سے ۴۲۰ھ تک کے وقفہ میں، شام کے وہ مقبوضات جو بنو فاطمہ کے ہاتھ سے نکل گئے تھے۔ پھر زیر نگیں ہو گئے ۴۱۸ھ میں بازنطینی یعنی رومی حکومت سے بنو فاطمہ کی مصالحت ہوئی۔ لیکن شرائط سے اندازہ ہوتا ہے کہ اعزاز تدبر اور تعقل، اور غیرت ملی کے جذبے سے بھرپور تھا، شرائط صلح جو طے پائے یہ تھے!

۱ رومی ممالک کی تمام مسجدوں میں فاطمی خلیفہ کے نام کا خطبہ پڑھا جائے گا۔!

۲ قسطنطنیہ کی جس مسجد کو رومیوں نے ڈھا دیا تھا اس کی از سر نو تعمیر وہ خود کریں گے۔

۳۔ بیت المقدس کا کنیسہ تمام عیسائی از سر نو تعمیر کر سکتے ہیں۔

۴ نو مسلم عیسائیوں پر اپنا آبائی دین اختیار کرنے کے سلسلے میں کوئی پابندی نہیں۔

۴۲۷ھ میں بہ عالم نوجوانی جب کہ قافلۂ عمر نے صرف ۳۲ منزلیں طے کی تھیں، اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔

ظاہر بہت معاملہ فہم اور بردبار شخص تھا۔ جو لوگ حضرت علی کی عقیدت میں غلو کرکے انہیں مرتبۂ الوہیت پر فائز کر دیتے تھے ان کے خلاف اس نے سخت الفاظ میں اظہار خیال کیا۔ اور ان سے برأت کا اظہار کیا۔ [۳] یہ نیک خو اور منصف مزاج شخص تھا۔ [۴]

ظاہر کے بعد اس کا بیٹا مستنصر تخت نشین خلافت ہوا۔ [۵]

ظاہر کے چند خصوصیات :-

۱ اس کے سکے، مہدیہ، منصورہ، مصر، مقلیہ فلسطین (رملہ) دار الضرب میں ڈھالے جاتے تھے

۲ امام حاکم کے ہاتھ جب اسپین کا خلیفہ ہاشم گرفتار ہوا تو اسپین کے اموی خلفا فاطمی خلفا کو خراج دینے لگے ظاہر کے تخت نشین ہونے کے بعد یہ سلسلہ بند ہوگیا، لیکن اس نے لشکر کشی کی دھمکی دی، تو خراج اور خطبۂ فاطمی پھر جاری ہوگیا۔

۳ اسلام کے مشہور فلسفی شیخ الرئیس حکیم ابو علی سینا کی پیدائش ۳۷۰ھ میں بخارا کے شہر سینفا میں ہوئی۔ وفات رمضان ۴۲۸ھ میں بمقام ہمدان، یہ بخارا کے بادشاہ منصور بن عبد الملک سامانی کے وزیر اعظم کے درجۂ عالیہ پر فائز تھے اس بادشاہ کے خاندان میں عظیم الشان اسماعیلی عالم پیدا ہوئے۔

مورخ ابن خلکان رقم طراز ہے کہ حکیم بو علی سینا اسماعیلی تھے۔ [۲]

مصادر اور حواشی

۱ $\frac{۴۱۱ھ}{۱۰۲۰ء}$ - $\frac{۴۲۷ھ}{۱۰۳۵ء}$

۲ تاریخ دول الاسلام - حصہ اول - رزق اللہ مطبوعہ مصر، ۱۹۰۷ء، ص ۳۳۹

۳ مقریزی، ج ۲، ص ۱۲۹

۴ مقریزی، ج ۲، ص ۱۲۹

۵ ابن اثیر ج ۹، ص ۱۸۶، نیز ملاحظہ ہو سیوطی، ج ۲ ص ۱۴

۵۶ عیون الاخبار، ج ۶، ص ۳۳۵

۵۷ نور مبین، حبل المتین، (جان محمد چنارا) طبع بمبئی، ص ۳۱۱، ۳۱۲،
ابن تیمیہ نے بھی بو علی سینا کو اسماعیلی مانا ہے۔

(۸)

المستنصر باللہ

ابو تمیم محمد، لقب المستنصر باللہ، طبیعت پر عدل وانصاف، رفق وکرم، اور ضبط، تنظم کا مادہ غالب تھا۔

۴۳۴ھ میں ایک شخص حاکم بامر اللہ بن کر مصر میں نمودار ہوا، جو صوری اعتبار سے حاکم سے مشابہت بھی رکھتا تھا؛ چنانچہ جو لوگ رجعت حاکم کے قائل تھے ان کی بڑی جماعت اس کی معتقد ہوگئی، نوبت ہنگامہ آرائی تک پہنچی بالآخر یہ شخص اپنے بہت سے ساتھیوں سمیت ہلاک ہوا،

۴۴۰ھ میں افریقہ کے گورنر معز بادلیس نے مستنصر فاطمی کا خطبہ ترک کرادیا اور عباسی خلیفہ قائم بامر اللہ کا خطبہ جاری کر دیا، جس کے نتیجہ میں نوبت جنگ اور خون ریزی تک پہونچی،

۴۵۰ھ میں، بساسیری نے بغداد پر قبضہ کر کے وہاں مستنصر کا خطبہ جاری کر دیا

۱۸ ذی الحجہ ۴۸۷ھ کو مستنصر کی وفات ہوئی، اس نے تقریباً، ساٹھ سال حکومت کی اور ۶۷ سال کی عمر پائی۔ [۱]

مستنصر باللہ کی شخصیت، کردار، اور صفات واوصاف نیز خصائص وممیزات کا اجمالی تذکرہ۔

① ۴۴۴ھ کے سکوں پر خلیفہ کے نام کے علاوہ وسطی دائرے میں "وعلی افضل الوصیین وزیر خیر المرسلین" نقش ہے۔

② روضۃ الصفا کے مصنف لکھتے ہیں کہ پہلے پہل آپ بارہ سال کی عمر میں لشکر کے ہمراہ برآمد ہوئے، آپ کا فرق مبارک جواہرات کے مرصع تاج سے مزین تھا، یہ تاج ایسا بیش تھا کہ کوئی جوہری اس کی قیمت کا اندازہ نہ کر سکتا تھا۔

③ ۴۴۲ھ میں حمات اور انامیا (اپامیا) کے درمیان فاطمیوں اور یونانیوں میں جنگ ہوئی جس میں یونانیوں کو سخت شکست ہوئی، اور وہ ایسے مرعوب ہوئے کہ زمانہ دراز تک انہوں نے مسلمانوں کو ستانے اور اذیت دینے کا نام نہ لیا، اس فتح عظیم کے بعد بے شمار مال غنیمت دستیاب ہوا۔

④ ۴۶۰ھ سے ۴۶۷ھ تک سخت قحط، بلوے فساد، تجارت ختم طاعون، خزانہ خالی، مستنصر کی ماں کا انتظام اور تسلط۔ اور حکومت، بقول لین پول تیسری مرتبہ ایک خاتون کی نگرانی میں حکومت کام کرتی ہے، پہلی امام عزیز کی عیسائی ماں، دوسری حاکم کی ہمشیر شہزادی ست الملک تیسری مستنصر کی سوڈانی ماں۔

⑤ حسن بن صباح اسی عہد کا آدمی تھا، یہ ۴۳۲ھ میں پیدا ہوا پہلے اثنا عشری تھا، پھر فاطمی ہوگیا۔

⑥ امارت کے استحقاق پر اختلاف ایک فریق نزار کا طرف دار تھا۔ دوسرا چھوٹے بھائی مستعلی کا، بقول ناصر خسرو، مستنصر نے نزار کے لئے وصیت کی، لیکن وزیر اعظم بدر جمالی نے مستعلی کی حمایت کی حسن بن صباح نزار کے ساتھ تھا۔

⑦ نزار نے ہندوستان میں دعوت وتبلیغ کے لئے ۴۶۷ھ میں سید نور الدین شاہ کو بھیجا جو فاطمی سید تھے۔ وہ نور ستگور یا سید ساداتِ کے نام سے معروف تھے۔ نساری گجرات میں ان کا شاندار مزار ہے۔

(۸) حرہ ۔ جس کا نام سیدہ ۔ لقب ملکہ تھا (عمر ۹۲ سال پائی) نے مستعلی کا ساتھ دیا فرقۂ بواہر کے آخری امام طیب کے عہد تک زندہ رہیں۔ ہندوستان میں فرقۂ بوہرہ کا وجود یمنی دعاۃ کا ثمرہ ہے مستعلی کے دو داعی عبداللہ اور احمد ہندوستان کے مقام کھمبایت میں آکر مقیم ہو گئے تھے نورالدین پاٹن میں ٹھہرے، دھارانگر کے راجہ سورچند نے اپنی لڑکی ان سے بیاہ دی، ان کی وفات ۴۸۷ھ میں ہوئی اس سال مستنصر کا انتقال ہوا نورالدین نے ہزاروں آدمیوں کو اسماعیلی بنایا۔

(۹) شاعر عمر خیام ناصر خسرو کے ہاتھ پر بیعت کرکے اسماعیلی بنا، اس نے مستنصر کی مدح میں قصیدہ لکھے سب کا خلاصہ یہ ہے کہ میرے دل کے محبوب حضرت امام مستنصر باللہ کا دیدار میرے دل کو پاک وصاف کرتا ہے اسے کسی وسیلہ کی ضرورت نہیں میں فقط حضرت امام مستنصر باللہ کی نگاہ لطف وکرم کا امیدوار ہوں؛ میرا ذریعہ میرا سلسلہ حضرت امام مستنصر باللہ کی ذات ستودہ صفات ہے؛

(۱۰) عمر خیام نے خواجہ حجۃ الحق کا خطاب بھی پایا تھا۔ وفات ۵۱۷ عمر ۱۰۹ سال

(۱۱) عبدالملک عطاش، مستنصر کا داعی کبیر تھا۔

(۱۲) حسن بن صباح کا رگزار خاص؛

(۱۳) مستنصر کا کتب خانہ بہت بڑا تھا جس میں ایک لاکھ کتابیں صرف ادب کی تھیں

(۱۴) شجرہ ،

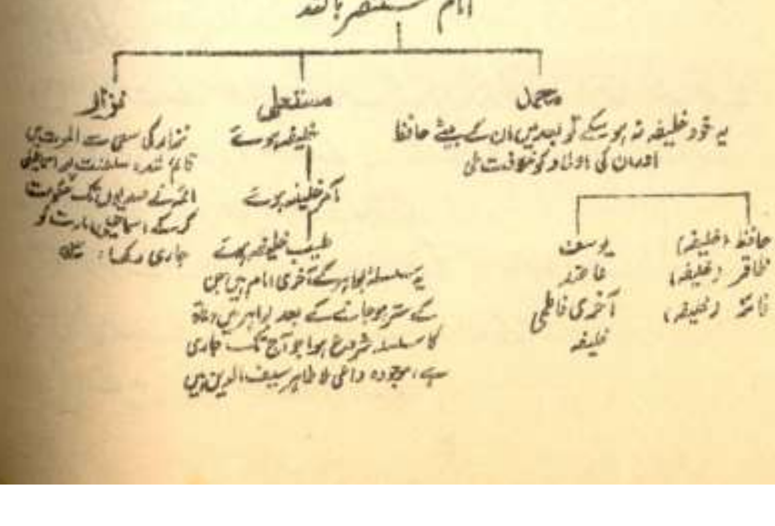

مستنصر نے تقریباً ساٹھ سال تک حکومت کی، یہ طویل ترین دورِ حکومت ہے، اور یہ زمانہ، خانہ جنگیوں، رقابتوں، عداوتوں، ہنگاموں، اور شورشوں کے لئے وقف رہا گو مستنصر کا وقار اور دبدبہ قائم تھا، لیکن اندر ہی اندر حالات زیادہ سے زیادہ ابتر ہوتے جارہے تھے۔

بربروں اور ترکوں کی آویزش نے ملک کو فتنہ و فساد کی آماجگاہ بنا دیا تھا، پھر جو قبیلوں کی یورشیں اور خارجی مشکلات و مسائل مستنصر کے لئے ان سب سے عہدہ برآ ہونا بہت مشکل تھا۔

۴۶۶ھ میں بدرالجمالی وزیرِ اعظم کی حیثیت سے نمایاں ہوا، اور اس نے بگڑتے ہوئے حالات کو بڑی خوبی سے سدھارا تھا، نہ صرف داخلی امن قائم کرنے میں کامیابی حاصل کی بلکہ خارجی طور پر گرتی ہوئی ساکھ بحال کر دی، اس نے ترکوں کا زور توڑا، اور مصر کے باہر بغاوت کے جو شعلے حکومت کو کمزور دیکھ کر بھڑکنے لگے تھے، انہیں قوت اور حسنِ تدبیر سے ٹھنڈا کر دیا نیز اس نے زراعت، فلاحت، اور کاروبار کو بھی چمکایا۔ اور بڑھایا، اس کے دور میں مصر کے خراج میں دس لاکھ دینار کا اضافہ ہوگیا۔ اگر وہ مصر کی ڈولتی ہوئی ناؤ کا ناخدا نہ بنتا تو شاید یہ حکومت ہی ختم ہو جاتی شہ یہی وجہ ہے کہ اسماعیلیوں کے ہاں اسے بڑا مقام حاصل ہے۔ ت‍ہ

طبعاً مستنصر بے انتہا خوبیوں کا آدمی تھا، رحم دل، عفو دنیک سرشت، خدا ترس، رواوار، اس نے کبھی کسی کے عقائد میں مداخلت نہیں کی، شہ بے انتہا دریادل تھا، کبھی کسی کا وظیفہ نہیں بند کیا، کسی کو مالی نقصان نہیں پہنچایا، خدا کے راستے میں جی کھول کر خرچ کرتا تھا، اور خوش ہوتا تھا، داد و دہش اس کی فطرتِ ثانیہ بن چکی تھی، شہ

حکیم ناصر خسرو نے مستنصر کی زیارت کی تھی۔ اور بڑے جوش و خروش، اور والہانہ عقیدت کے ساتھ اپنے تاثرات قلمبند کئے ہیں، جن کی ضروری تفصیل اپنے موقع پر کسی دوسرے مقام پر

آئے گی۔

مصادر و حواشی

۱؎ ۴۲۷ھ/۱۰۳۵ء — ۴۸۷ھ/۱۰۹۴ء

۲؎ تاریخ دول الاسلام، حصہ اول (رزق اللہ) مطبوعہ مصر، ص ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳،

۳؎ نور مبین، حبل المتین: (چنانا) طبع بمبئی، ص ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۳، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۵، ۳۴۶،

۴؎ ابن خلدون، ج ۴، ص ۶۴

۵؎ Lane Poole. p. 161

۶؎ تاریخ مصر الحدیث، (جرجی زیدان) ج ۱، ص ۲۴۳

۷؎ عیون الاخبار، ج ۷، ص ۳۳۶

۸؎ مقریزی ج ۲، ص ۲۳۸

⑨

المستعلی باللہ

مستنصر نے اپنا ولی عہد بڑے بیٹے نزار کو بنایا تھا، ؎ لیکن بعد میں اس نے اپنا یہ ارادہ بدل دیا۔ ؎ اور ارادے کی اس تبدیلی کی تکمیل نئے وزیر اعظم یشا ہین شاہ ملقب بہ افضل نے جو بدر حمالی کا بیٹا تھا اس طرح کی کہ نزار سے خلع بیعت کر کے، مستنصر کے چھوٹے بیٹے، احمد ابو القاسم کے ہاتھ پر بیعت کر لی، جس نے مستعلی باللہ کا لقب اختیار کیا،

یہ رنگ دیکھ کر نزار نے راہ فرار اختیار کی، اور اسکندریہ پہنچا۔ جہاں بدر جمالی کا مولیٰ ناصر الدولہ افتکین موجود تھا، اہل اسکندریہ نے نزار کی بیعت کر لی، اور مصطفیٰ کا لقب دیا اس نے لوگوں کے سامنے ایک خطبہ دیا، اور افضل پر لعنت کی، قاضی جلال الدولہ نے اس کی تائید کی، اسکندریہ کے قاضی نے بھی اس کی حمایت کی، افضل کو جب ان حالات کی اطلاع ملی تو اس نے اسکندریہ کا محاصرہ کر لیا، نوبت جنگ تک پہنچی، آخر نزار گرفتار ہو گیا، افتکین بھی قیدی بنا لیا گیا، اور اسے فوراً قتل کر دیا گیا، مستعلی نے نزار کو قید کر دیا، وہیں وہ اپنی موت مرا، نزار کے انتقال کے بعد مصر کے حالات معمول پر آ گئے،

۴۹۱ھ میں امیر الجیوش افضل ایک لشکر گراں لے کر سوریا کی طرف روانہ ہوا تاکہ

بیت المقدس کو ترک تسلط سے نجات دلائے، یہاں بھی نوبت جنگ تک پہنچی، افضل نے محاصرہ کرلیا، منجنیق سے ایک ایسا بھرپور وار کیا کہ قلعہ کی دیوار گر گئی، اور اس نے بزور قوت قبضہ کرلیا یہ لوگ مشرقی سوریا کی طرف بھاگ گئے۔

اسی اثنا میں صلیبی شام کی طرف لوٹ آئے، انہوں نے عساکر اسلام کو شکست دی اور ۴۹۲ھ میں بیت المقدس کا رخ کیا، اور کچھ مدت تک محاصرے کے بعد بزور شمشیر فتح کرلیا اور وہاں کے مسلمانوں کا قتل عام شروع کر دیا۔

یہ خبر جب مصر پہنچی، تو مستعلی اور باشندگان مصر پر عیسائیوں کی پیش قدمی نے دہشت طاری کر دی، سعد الدولہ کی زیر سیادت امیر الجیوش فضل کا لشکر جرار مقابلے کے لئے روانہ کیا، عسقلان کے قریب مسلمان اور عیسائی فوجوں میں گھمسان کا رن پڑا، قریب تھا کہ عیسائیوں کو شکست سے دوچار ہونا پڑتا کہ انہیں کمک پہنچ گئی، اور انہوں نے مصری لشکر کو شکست دے دی۔

سات سال دو مہینے حکومت کر کے مصر میں ۱۷ صفر ۴۹۵ھ کو بدھ کے دن مستعلی کا انتقال ہوگیا ۔

لیکن اسماعیلیوں کی ایک جماعت بہر حال نزار کے ساتھ تھی، چنانچہ اس کے قتل کے بعد بھی یہ جماعت سرگرم کار رہی۔ اس جماعت کا سب سے زیادہ سرگرم اور پرجوش رکن حسن بن صباح تھا،

مستعلی جب تخت خلافت پر متمکن ہوا تو اس کی عمر صرف چھ سال تھی۔ لہذا کاروبار ملک پورے طور پر، افضل کے قبضے میں آگیا، افضل نے ان مقامات کو جو دولت فاطمیہ کے قبضہ سے نکل گئے از سر نو حاصل کرنے کی سر توڑ اور کامیاب کوشش کی،

۴۸۹ھ میں، اہل صلیب نے زبردست یلغار کی، اور کئی شہر رہا، انطاکیہ وغیرہ مفتوح کر لئے، ۔

مستعلی کا انتقال عین عالم نوجوانی میں ہوا، وفات کے وقت اس کی عمر صرف ۲۷، ۲۸ سال کی تھی، یہ امر اب تک نزاعی ہے کہ موت طبعی تھی یا زہر خورانی یا قتل کا نتیجہ تھی بلکہ

جب تک وہ حکمران رہا عوام اس کے ساتھ رہے، اور اس سے عقیدت کا اظہار کرتے رہے۔ ۶

مصادر و حواشی

۱ ۴۸۷ھ/۱۰۹۴ء — ۴۹۵ھ/۱۱۰۱ء

۲ ابن اثیر، ج ۱۰، ص ۹۴

۳ ابن خلدون، ج ۴، ص ۲۶

۴ تاریخ دول الاسلام، حصہ اول، رزق اللہ، مطبوعہ مصر، ص ۴۴۳ تا ۴۴۴

۵ ابن اثیر ج ۱۰، ص ۱۱۷

۶ مقریزی، ج ۲، ص ۱۷۱

(۱۰)

الآمر باحکام اللہ

مستعلی نے اپنے بیٹے ابوعلی منصور ملقب بہ آمر باحکام اللہ کے لیے نص کردی تھی۔ یہ بھی بالکل نوعمر تھا۔ یعنی صرف سات سال کا تھا۔ کاروبار مملکت اور تدبیر امور کی ساری ذمہ داری افضل کے ہاتھ میں تھی جو اس کے باپ کا بھی اتالیق تھا۔

۴۹۷ھ میں، ۴۹۸ھ میں اور ۵۰۳ھ میں صلیبیوں نے زبردست حملے کیے۔ اور ۵۰۴ھ میں انہوں نے صیدا پر قبضہ کرلیا۔ اس طرح شام گویا مصر کے حلقہ سے باہر نکل گیا۔

۵۱۱ھ میں بالڈون نے جو عیسائیوں کا بادشاہ تھا۔ ایک بہت بڑا لشکر لے کر مصر پر چڑھائی کی اور تنیس کے مقابل پہنچ گیا۔ لیکن ایسا زخم لگا جو جان لیوا ثابت ہوا۔ اور وہ اپنے پایۂ تخت یروشلم واپس چلا گیا۔ اس طرح مصر ایک بہت بڑے خطرے سے نجات پاگیا۔

جیسے جیسے آمر سوجھ بوجھ حاصل کرتا گیا اس نے افضل کے پنجہ سے نکلنے کی کوشش کی۔ آخر ۵۱۲ھ میں اسے قتل کرادیا۔ اور اس کی جگہ ابوعبداللہ بن بطائحی کو وزیر نامزد کیا۔ لیکن یہ افضل سے بھی زیادہ سخت اور سفاک ثابت ہوا۔ اسے بھی آمر نے ۵۱۹ھ میں قتل کرادیا[1]۔ قاتل باطنی یعنی نزاری تھے[2]۔

آمر کو کاروبار مملکت سے اتنی زیادہ دلچسپی نہیں تھی جتنی لہو ولعب اور تفریحات سے تھی

مجموعی حیثیت سے آمر کا دورِ حکومت زیادتی اور تعزیر و عقوبت پر مبنی تھا۔ جس سے اہلِ مصر حد درجہ پریشان ہو گئے تھے۔ چنانچہ ایک روز چند آدمی گھات میں بیٹھے۔ جب وہ اپنے محل کو جا رہا تھا، قتل کر دیا۔

آمر نے تقریباً ۲۰ سال حکومت کی۔ ۳۴ سال کی عمر میں اس دنیا سے رخصت ہوا۔[1]

اولیری نے بھی آمر باحکام اللہ کے حالات و سوانح پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس نے تنگ آ کر اپنے وزیر افضل کو قتل کیا۔ ویسے افضل نے تعمیری سرگرمیوں پر اپنے دورِ اقتدار میں پوری توجہ مبذول رکھی۔ اس نے کئی نہریں کھدوائیں اور جبل مقطم کے پاس ایک شاندار رصدگاہ بنائی۔[2]

آمر کا دوسرا وزیر ابن بطائحی بھی علم و ادب کا مربی تھا۔ اس نے کئی مفید کارنامے سرانجام دیئے۔ لیکن وفا کا جوہر نہ تھا۔ ظالم اور سفاک بھی تھا۔ آمر اس کی دراز دستیاں برداشت نہ کر سکا۔ اور اسے بھی قتل کرا کے دم لیا۔[3]

شروع شروع میں آمر سے رعایا کو کسی طرح کی شکایت نہیں تھی۔ اس میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں جو ایک اچھے فرماں روا میں ہونی چاہئیں۔ لیکن افضل اور ابن بطائحی کے قتل کے بعد اس کی طینت اور سرشت میں بھی تبدیلی آ گئی۔ اور وہ خود بھی ظلم و زیادتی پر اتر آیا۔

آمر نے کئی عمارتیں بھی بنائیں۔ اسے جود و سخا سے غیر معمولی شغف تھا۔ جو دستِ سوال دراز کر کے سامنے آیا دامنِ مراد زر و جواہر سے بھر کر واپس گیا۔ اس کی داد و دہش نے مصر کے باشندوں کو شروع شروع میں اس کا گرویدہ کر لیا تھا۔[4]

مصادر و حواشی

[1] ۴۹۵ھ / ۱۱۰۱ء - ۵۲۴ھ / ۱۱۳۰ء

[2] مقریزی، ج ۳ ص ۷۷

[3] تاریخ دول الاسلام - حصہ اول، رزق اللہ - مطبوعہ مصر ۱۹۰۷ء ص ۴۴۴-۴۴۵-۴۴۶

ک مقریزی، ج ۴، ص ۳۲۱

ش ابن خلکان، ج ۲، ص ۱۲۸

ن مقریزی، ج ۴، ص ۷۸-

○

(11)

الحافظ لدین اللہ ؒ

آمر باحکام اللہ کا جب انتقال ہوا تو اس نے کوئی اولاد نرینہ نہیں چھوڑی تھی۔ جو اس کی وارث اور جانشین بن سکتی۔ البتہ اس کی ایک کنیز پیٹ سے تھی۔

چنانچہ حکومت کے ارباب حل وعقد نے تا وضع حمل، آمر کے ابن عم عبدالمجید بن محمد کو نگراں کار اور نائب امام تسلیم کر لیا۔ جس نے الحافظ لدین اللہ کا لقب اختیار کیا۔

پھر اس کے بعد کنیز کے بطن سے ایک لڑکا پیدا ہوا۔ لیکن حافظ اپنے آپ کو محکم اور اپنی حکومت کو مستحکم کر چکا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے بیٹے کو ولی عہد بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ اور بڑے بیٹے سلیمان کو نامزد کر دیا لیکن اس کا دو ہی مہینے میں انتقال ہو گیا۔ اب اس نے اپنے دوسرے بیٹے حسن کو ولی عہد بنایا۔ جس کے دل میں خلافت کی ہوس پیدا ہوئی۔ اس نے فوج کے ایک بڑے حصے کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ حافظ کو جب یہ معلوم ہوا تو اس نے زہر دلوا کر اس کا خاتمہ کرا دیا۔ یہ واقعہ ۵۲۹ھ کا ہے

۵۴۱ھ میں راجر نے جو صقلیہ (سسلی) پر قابض ہو چکا تھا۔ طرابلس الغرب پر حملہ کیا۔ ۵۴۳ھ میں اس نے مہدیہ پر بھی قبضہ بھی کر لیا۔ جہاں سے خلافت فاطمیہ کی نشوو ابتدا ہوئی تھی۔ پھر وہ اسکندریہ کی طرف بڑھا۔ اسی اثنا میں بعارضہ قولنج حافظ کا انتقال ہو گیا۔

وفات کے وقت اس کی عمر ۴۰ سال کی تھی - اس نے تقریباً بیس سال حکومت کی ۔
لیکن دوسرے مورخین یہ تسلیم کرتے ہیں کہ آمر کا بیٹا طیب اس کی زندگی میں پیدا ہوا تھا ۔ جس کے لیے اس نے نص بھی کر دی تھی۔ دورِ ستر طیب ہی سے شروع ہوتا ہے - یمن میں اسی کے لیے دعوت دی گئی - اسے مستور اس لیے ہونا پڑا کہ اس کی زندگی خطرے میں تھی [3]
مقریزی نے بھی اسے تسلیم کیا ہے کہ آمر کا ایک نوعمر لڑکا تھا - جسے حافظ نے فصد کھلوا کر ہلاک کر دیا [4]
حافظ کے جو سکے برآمد ہوئے ہیں - ان میں ابتدائی سکوں میں حافظ نے اپنے آپ کو نائب ہی لکھا ہے - اور مانا ہے [5] نیز حافظ نے جب آمر کے انتقال کے بعد حکومت کے نگران اور نائب امام کی حیثیت سے کام شروع کیا - تو اپنے خطبے میں اس نے اپنے آپ کو امام نہیں ظاہر کیا ہے [6]

مصادر و حواشی

[1] ۵۲۴ھ / ۱۱۳۰ء - ۵۴۴ھ / ۱۱۴۹ء

[2] تاریخ دول الاسلام، حصہ اول - رزق اللہ - مطبوعہ مصر ۱۹۰۷ء - ص ۳۴۴، ۳۴۸-

[3] عیون الاخبار، ج ۷، ص ۳۱۸-

[4] مقریزی، ج ۴، ص ۳۲۴-

[5] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "نقود الفاطمیین" مطبوعہ مصر-

[6] حافظ کے وقت سے ائمہ مستور ہو گئے - اور نائبوں کے ہاتھ میں حکومت آ گئی - عاضد باللہ آخری فاطمی خلیفہ تک یہی سلسلہ جاری رہتا ہے ۔

(۱۴)

الظافر لاعداء اللہ

حافظ کی وفات کے بعد اس کا بیٹا ابومنصور اسماعیل تخت نشین ہوا جس کی ولی عہدی پہلے بیعت لی جا چکی تھی۔ اس نے الظافر لاعداءاللہ کا لقب اختیار کیا اور ابن مصیال کو وزیر بنایا۔

عسقلان کے سوا شام میں اب فاطمیوں کا کوئی مقبوضہ باقی نہیں رہ گیا تھا۔ ۵۴۸ھ میں صلیبیوں نے اس شہر پر چڑھائی کر دی اور محاصرہ کر لیا۔ اہل شہر نے ظافر سے مدد اور کمک طلب کی۔ اس نے اپنے سالے بالک عباس کی قیادت میں ایک فوج صورتِ احوال سے نمٹنے کے لیے روانہ کر دی اور ابن السلار کو اس کے ساتھ کر دیا۔ لیکن راستے میں عباس نے اسے قتل کر دیا اور مصر واپس چلا۔ ظافر نے اسے وزیر بنا دیا۔ ۵۴۸ھ میں مدد اور کمک سے مایوس ہو کر اہل عسقلان نے اپنے آپ صلیبیوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔

ظافر حد درجہ لہو و لعب میں مصروف رہتا تھا۔ کنیزوں اور باندیوں کے جھرمٹ میں داد عیش دیتا اور نغمہ و موسیقی کی مجلسوں میں مصروف رہتا تھا۔ نصیر بن عباس اس کے خاص ندیموں میں تھا۔ ان دونوں کے باہمی تعلقات کے بارے میں بہت سے شرمناک واقعات مشہور ہیں۔ ظافر میں وہ عادتیں تھیں۔ جو ایک بادشاہ کے ہرگز شایانِ شان نہیں ہو سکتیں۔ عباس نے اپنے بیٹے نصیر کو آمادہ کیا کہ وہ ظافر کو قتل کر دے۔ تاکہ لوگوں میں جو بدنامی اس سے

شرمناک تعلقات کے بارے میں ہو رہی ہے۔ وہ محو ہو جائے۔ محرم ۵۴۹ھ[1] میں نصیر نے ظافر کو چپ چپاتے قتل کر دیا۔ جس کا کسی کو علم نہ ہو سکا۔

جب ظافر کا قتل ظاہر ہوا۔ تو عباس نے اس حادثے کی ذمہ داری سے خود کو اور اپنے بیٹے نصیر کو بچانے کے لیے ظافر کے بھائیوں کو جمع کیا۔ جن کا نام جبریل اور یوسف تھا۔ اور ان پر تہمت لگائی کہ تم دونوں نے ظافر کو ہماری آنکھوں کے سامنے قتل کیا ہے۔ لہذا خلیفۂ مقتول کا قصاص تمہارے سوا کسی دوسرے سے ہم نہیں لے سکتے[2]

ان دونوں بے گناہوں نے بڑی شدت سے انکار کیا۔ لیکن ان کی ایک نہ سنی گئی۔ اور آخر کار انہیں کشتۂ تیغِ ستم بنا دیا گیا۔

ظافر کے بعد عباس نے اس کے پانچ برس کے بیٹے عیسیٰ کے ہاتھ پر بیعت لے لی۔ اور خود نائب مناب بن بیٹھا۔ عسقلان ہاتھ سے جا ہی چکا تھا۔ اس کی تلافی کا مقدر نہ تھا[5]

مصادر اور حواشی

۱؎ ۵۴۴ھ / ۱۱۴۹ء - ۵۴۹ھ / ۱۱۵۴ء

۲؎ جب غداروں کے ہاتھ میں اقتدار کی باگ آتی ہے۔ تو وہ ملک، قوم، مذہب، ہر چیز کو اپنے مفاد پر قربان کر دینے کے عادی ہو جاتے ہیں۔

۳؎ تاریخ دول الاسلام حصہ اول۔ رزق اللہ۔ مطبوعہ مصر ۱۹۰۷ء، ص ۲۴۹، ۲۵۰

۴؎ مقریزی، ج ۴ ص ۸۰

۵؎ ابن الاثیر ج ۱۱ ص ۸۶۔

(۱۴)

الفائز باللہؒ

عباس نے ظافر کے قتل کی خبر افشا ہونے پر اس کے بیٹے عیسے کو جس کی عمر پانچ سال کی تھی۔ کندھے پر اٹھایا اور تخت پر بٹھا سب کی بیعت لے لی۔ اس کا لقب فائز باللہ قرار پایا

عباس اب سلطنت فاطمیہ کا مالک بن گیا تھا۔ اس کے ظلم و تعدی سے کوئی محفوظ نہ تھا۔ حتیٰ کہ قصر شاہی میں رہنے والی خواتین تک۔

آخر خواتین خانوادہ شاہی نے طلائع بن ازیک سے جو منیۂ خصیب کا گورنر تھا، فریاد کی۔ یہ نیک سرشت آدمی فوراً آمادہ کار ہوگیا۔ اور قاہرہ کی طرف فوج لے کر چل پڑا۔

عباس کو جب طلائع کی خبر معلوم ہوئی۔ تو جتنا مال و دولت سمیٹ سکتا تھا سمیٹ کر اور اپنے خاندان کو لے کر شام کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ اور راستے میں صلیبیوں سے مڈبھیڑ ہوگئی جنہوں نے اسے قتل کردیا۔ اور اس کا سارا مال و اسباب لوٹ لیا۔

ازیک قاہرہ پہنچا۔ اور منصب وزارت پر فائز ہوگیا۔ اور الملک الصالح کا لقب اختیار کیا۔ اور نوعمر خلیفہ کی دیانت اور وفاداری کے ساتھ نگہبانی اور خدمت بجالانے لگا۔

۵۵۵ھ میں فائز کا انتقال ہوگیا۔

اس خلیفہ کے زمانے میں مصر کی حالت بہت زیادہ ابتر ہوگئی۔ حدیہ ہے کہ صلیبیوں کو

کثیر رقمیں اس مقصد کے لیے پیش کی جانے لگیں کہ وہ بیت المقدس سے کوچ کر کے مصر پر حملہ آور نہ ہوں ؎۲

مصادر و حواشی

؎۱ ۵۴۹ھ / ۱۱۵۴ء - ۵۵۵ھ / ۱۱۶۰ء

؎۲ تاریخ دول الاسلام، حصہ اول۔ رزق اللہ مطبوعہ مصر ۱۹۰۷ء، ۳۵۰-۳۵۱۔

(۱۴)

العاضد لدین اللہ

فائز کا انتقال ہو گیا۔ لیکن اس نے کوئی اولاد نرینہ نہیں چھوڑی۔ چنانچہ الملک الصالح۔ (طلائع بن ازیک) نے اسی خاندان سے کسی فرد کو خلیفہ بنانا چاہا۔ لوگوں نے ایک مردِ بزرگ کا نام پیش کیا۔ جو سب سے زیادہ اس منصب کے لیے موزوں تھے۔ طلائع نے بیعت کا ارادہ کر لیا۔ لیکن اس کے بعض ندیموں نے سرگوشی کرتے ہوئے مشورہ دیا کہ بڈھوں کو چھوڑو۔ بچوں کو پکڑو۔ مصلحت اسی میں ہے۔ چنانچہ ملک صالح نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ اور اس خاندان کے ایک کم سن بچے ابو محمد عبداللہ بن یوسف بن حافظ کو جس کا لقب عاضد باللہ تھا خلیفہ بنا لیا۔ اور اپنی لڑکی سے اس کی شادی بھی کر دی۔ عاضد کی کم سنی کے باعث ملک صالح تمام امورِ مملکت پر حاوی ہو گیا۔ اور سیاہ و سفید کا مالک بن گیا۔ اعیانِ مملکت اس کے شر سے بچنے کے لیے ادھر ادھر منتشر ہو گئے۔

کچھ ہی عرصے بعد۔ یعنی رمضان ۵۵۶ھ میں ملک صالح قتل کر دیا گیا۔ یہ شخص مجموعی حیثیت سے بڑی خوبیوں کا جامع تھا۔ بہادر تھا، دلیر تھا۔ رحم دل تھا۔ صاحبِ احسان و کرم تھا۔ سخی اور فیاض تھا۔ تشیع میں سخت غلو پسند تھا۔ اس نے ایک کتاب تصنیف کی تھی۔ الاعتماد فی الرد علی اہل العناد جو امامت علی بن ابی طالبؓ پر متضمن تھی۔

ملک صالح کے بعد منصب وزارت اس کے بیٹے ارزیک کو ملا جس نے "الملک العادل"
کا لقب اختیار کیا۔

ملک صالح کے زمانے میں صعید کا گورنر شاور تھا۔ جسے ملک عادل نے برطرف کر کے
آکر معزول کردیا۔ وہ ۵۵۸ھ میں قاہرہ پر چڑھ دوڑا۔ ملک عادل میں مقابلے کی طاقت نہ
تھی۔ بھاگ کھڑا ہوا۔ شاور فاتحانہ شان سے قاہرہ میں داخل ہوا۔ خلیفہ عاضد نے اسے وزیر
بنالیا۔ اور "امیر الجیوش" کا لقب دیا۔ لیکن صاحب الباب ضرغام اس کا مخالف تھا۔
اس نے اسے قاہرہ چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ شاور مدد کی دریوزہ گری کرتا ہوا سلطان نورالدین
محمود زنگی کے پاس شام چلا گیا۔ اور ضرغام الملک المنصور کے لقب سے منصب وزارت
پر فائز ہوگیا۔

شاور نے نورالدین زنگی کو اکسایا۔ کہ وہ اسے اس کا حق (وزارت مصر) دلائے اس کے
بدلے میں وہ مصر کو اس کا تابع بنا دے گا۔ اور خود اس کا نائب بن کر وہاں حکومت کرے گا۔
نورالدین جنگِ صلیبی میں الجھا ہوا تھا۔ اس لیے متامل تھا لیکن شاور کے بار بار اکسانے سے راضی
ہوگیا۔ اور اپنے معتمد ترین سالار اسدالدین شیرکوہ کی سرکردگی میں شاور کے ساتھ ایک فوج مصر
بھیج دی۔ اسدالدین شیرکوہ کے ساتھ اس کا بھتیجا یوسف ابن نجم الدین بھی تھا جو ابھی نوجوان تھا
زنگی کا لشکر بغیر کسی مزاحمت کے بلبیس تک پہنچ گیا۔ اب ضرغام نے اپنے بھائی ناصر الدین
کی سربراہی میں ایک لشکر بھیجا۔ جو شکست کھا کر واپس آگیا۔ اور اسدالدین شیرکوہ فاتح و غانم کی
حیثیت سے قاہرہ میں داخل ہوا۔ ضرغام بھاگ گیا۔ اور قتل ہوا۔

شاور نے دوبارہ وزیر بن کر وہ پیمان بھلا دیا۔ جو نورالدین زنگی سے کیا تھا۔ اور اسدالدین
شیرکوہ سے مطالبہ کیا کہ وہ شام واپس چلا جائے۔ اسدالدین لڑنے پر تیار ہوگیا۔ شاور نے صلیبیوں
سے مدد طلب کی۔ جو شام پر استیلا۔ حاصل کر کے مصر پر قبضہ کرنے کا خواب دیکھ رہے
تھے۔ اور وہ حملہ کے لیے موقع کے منتظر تھے۔ اب انہیں نادر موقع مل گیا۔ انہوں نے شاور
کی استدعا قبول کرلی۔ اور بمقام بلبیس اسدالدین شیرکوہ کا محاصرہ کرلیا۔ جو تین مہینے جاری رہا۔
لیکن اسے شکست نہ دے سکے۔ اس اثنا میں زنگی کے حملہ کرتا ہوا نے صلیبیوں کو شام میں شکست

دی۔ یہ خبر سن کر صلیبی حواس باختہ ہو گئے اور شیرکوہ سے دب کر صلح کر لی۔ شیرکوہ کو اصل واقعہ کی خبر نہ تھی۔ وہ اہل مصر سے دل گرفتہ شام واپس گیا۔ اور یہ فیصلہ کر کے گیا کہ مصر پر مکمل قبضہ کرنے کے لیے پھر بہت جلد واپس آئے گا۔

۵۶۲ھ میں شیرکوہ نورالدین زنگی کی اجازت سے مصر پر حملہ آور ہوا۔ اور اسکندریہ تک فتح کرتا چلا گیا۔ یوسف صلاح الدین اس مہم میں بھی اس کے ساتھ تھا۔ لیکن شاور نے صلیبیوں کی مدد سے شیرکوہ کو شکست دی۔ شیرکوہ نے اسکندریہ اور مفتوحہ علاقے شاور کے حوالے کیے اور شام واپس چلا گیا۔

لیکن شاور کی شامت آ چکی تھی۔ شیرکوہ کے جانے سے اسے کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچا۔ رائے عامہ اس کے خلاف بھڑک چکی تھی۔ اس لیے کہ جن فرنگیوں کی مدد لے کر اس نے شیرکوہ سے نجات حاصل کی تھی وہ مصر پر للچائی ہوئی نظریں ڈال رہے تھے۔ چنانچہ یہ اندیشہ بجا ثابت ہوا۔ عیسائیوں کا لشکر جرار یلغار کرتا ہوا آگے بڑھا۔ اور تین دن کے محاصرے کے بعد بلبیس فتح کر لیا۔ اور وہاں کے مسلمانوں کو ذبح کر دیا۔ پھر یہ لشکر قاہرہ کی طرف بڑھا۔ شاور نے پھر نورالدین سے مدد مانگی۔ شیرکوہ پھر آیا۔ اس نے عیسائیوں کو مار بھگایا۔ اور ربیع الثانی ۵۶۴ھ قاہرہ پہنچ گیا۔ اس نے شاور کو قتل کر دیا۔ عاضد نے اسے منصب وزارت سونپ دیا۔ اور المنصور کے لقب سے ملقب کیا۔ لیکن دو ماہ پانچ دن کے بعد وہ قضائے مبرم کا شکار ہوا۔ عاضد نے صلاح الدین کو وزیر بنا لیا۔ اور "الملک الناصر" کا لقب عطا کیا۔

لیکن صلاح الدین کو امن سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا۔ جوہر "مؤتمن الدولہ" اور دوسرے عناصر اس کے مخالف تھے۔ نوبت جنگ تک پہنچی۔ مؤتمن الدولہ قتل ہوا۔ اس کے سپاہی مارے گئے اور صلاح الدین ذیقعدہ ۵۶۴ھ میں اپنے منصب پر جم گیا۔ اور سیاہ و سفید کا مالک بن گیا۔ محرم ۵۶۷ھ کے پہلے جمعہ میں صلاح الدین نے عاضد کا نام خطبۂ جمعہ سے نکال دیا۔ اور عباسی خلیفہ مستضی کا نام شامل کر دیا۔ جس وقت یہ کارروائی ہوئی۔ عاضد سخت بیمار تھا۔ اور ان حالات سے یکسر بے خبر۔ بالآخر اسی مہینے میں یوم عاشوراء کو اس کا انتقال ہو گیا۔ فوراً ہی صلاح الدین نے محل پر اور سارے زر و مال پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح فاطمی حکومت ۲۹۷ھ

میں قائم ہوئی۔ ۵۶۷ھ میں ختم ہوگئی۔

وَاللہ وارث الارض ومن علیہا و ھو خیر الوارثین ہ [۳]

وشتاو عالم اسلام کے منافی سرگرمیوں میں عاضد کا کوئی حصہ نہ تھا۔

جن لوگوں نے صلیبیوں کو مصر بلانے کی کاروائی کی تھی، ان میں عاضد شامل نہ تھا نہ اسے ان کی سازش کی اطلاع تھی۔ اس لیے وہ بچ گیا۔ ورنہ صلاح الدین اسے بھی قتل کر دیتا [۴]

صلاح الدین نے عاضد کے احسانات کا جواب کس طرح دیا ؟ اس کا جواب تاریخ کی زبان سے یہ ہے :۔

" عاضد کی آنکھیں بند ہوتے ہی صلاح الدین نے قصر فاطمی پر قبضہ کر کے اس کی نگرانی پر امیر بہاؤالدین قراقوش کو مقرر کیا۔ خلفاء کے جتنے رشتہ دار اس میں رہتے تھے ان سب کو قید کر لیا۔ مردوں کو عورتوں سے ملنے جلنے کی ممانعت کر دی تاکہ پھر کوئی فاطمی خلیفہ پیدا ہو کر خلافت کا دعویٰ نہ کر سکے۔ قصر کے جواہرات اور سب قیمتی چیزیں باہر نکال لی گئیں کتب خانہ فاطمیہ کی نایاب اور بیش قیمت کتابیں قاضی عبدالرحیم کے سپرد کی گئیں۔ ان میں سے بہت سی تو تعصب کے سبب تلف کر دی گئیں۔ یہاں تک کہ بعض کتابوں کی جلدوں سے جوتیاں بنائی گئیں اس وجہ سے کہ ان میں اسماعیلی عقیدے درج تھے [۵]

عاضد کے بعد اسماعیلیوں کا حشر کیا ہوا ؟ یہ بھی ایک دردناک کہانی ہے :۔

آخری نائب عاضد کے عہد میں جو کچھ اسماعیلی رہ گئے تھے۔ ان میں سے اکثر قتل کر دیئے گئے۔ انہی بدنصیبوں میں ایک شاعر فقیہ عمارہ یمنی بھی شامل ہے [۶]

صلاح الدین نے اپنے ایک سیکرٹری بہاؤالدین قراقوش کو قصر کی نگرانی پر مقرر کیا جس نے عاضد کے تمام رشتہ داروں کو قید کر کے مردوں کو عورتوں سے ملنے کی اس لیے ممانعت کر دی کہ نہ پھر کوئی فاطمی پیدا ہو سکے۔ اور نہ امامت کا دعویٰ کر سکے۔ قصر الیاسسنسان ہو گیا۔ گویا اس میں کوئی تھا ہی نہیں۔ انہیں اسباب سے مصر میں اسماعیلیوں کا نام و نشان تک نہ رہا [۷]

عاضد کے شکوہ و تجمل کا کیا عالم تھا ؟ لین پول بتاتا ہے :۔

نصرانی سفیروں کی باریابی بارگاہِ خلافت میں جہاں بڑے پائے کے مسلمانوں سے بھی صرف چند ہی داخل ہو سکتے تھے ایک بے مثل واقعہ ہے۔ لہٰذا اطرکیبی کو یہ فخر حاصل ہوا کہ اسے صلح کے شرائط پیش کر سکنے کی اجازت حاصل ہو گئی۔ تیلساریہ کا ہیو اور جیوفری فلپر دی ٹمپلر سفارت کے لیے منتخب کیے گئے۔ خود وزیر ان کو اپنے ساتھ مشرقی آداب ادا کرتے ہوئے محل میں لے گیا۔ پوشیدہ لمبے راستوں اور محفوظ دروازوں میں سے انہیں گذرنا پڑا۔ جہاں قوی ہیکل حبشی سپاہیوں نے ننگی تلواروں سے ان کو سلامی دی۔ پھر وہ اوپر سے کھلی ہوئی ایک وسیع عمارت میں پہنچے۔ جس کے اطراف سنگِ مرمر کے ستونوں پر لگی ہوئی کمانیں تھیں۔ اس کی اندرونی چھتیں رنگ برنگ کے سنہری نقش و نگار سے جگمگا رہی تھیں۔ راستے پربچی کاری کا فرش تھا۔ مسیحی امیروں کی نامانوس آنکھیں اس عجیب منظر کو دیکھ کر جو کبھی ان کی نظروں سے گذرا نہ تھا تعجب سے کھل گئیں۔ انہیں سنگِ مرمر کے فوارے مختلف بولیاں بولنے والے اور حیرت انگیز رنگ برنگ کے پرندے نظر آئے جو مغربی دنیا کے لیے بالکل اجنبی چیزیں تھیں ایک اور ہال میں پہلے سے بھی زیادہ نفیس اشیاء دکھائی دیں۔ متعدد اقسام کے جانوروں کی تصویریں جنہیں کسی ماہر نقاش کا قلم ہی اتار سکتا تھا یا شاعر کا تخیل ایجاد کر سکتا تھا۔ یا سونے والے کا خواب اختراع کر سکتا تھا۔ واقعی یہ ایسی چیزیں تھیں جو مشرق اور جنوب کے ممالک ہی پیدا کر سکتے ہیں۔ مغرب نے انہیں کبھی دیکھا ہے نہ سنا ہے۔ آخر میں بہت سے چکروں کے بعد سفیر تخت کے کمرے میں پہنچے۔ جہاں خادموں اور ان کے زرتار لباسوں سے ان کے مالک کی شان و شوکت ظاہر ہوتی تھی۔ تین دفعہ وزیر اپنی تلواریں میان سے نکالے ہوئے خاکساری سے زمین سے اوندھا گر پڑا۔ گویا وہ اپنے خدا سے التجا کرتا ہے۔ پھر فوراً ہی حرکت ہوئی سونے اور جواہرات کے مرصع وزنی پردے ہٹائے گئے۔ اور سونے کے تخت پر شاہی لباس میں خلیفہ بیٹھا ہوا دکھائی دیا شہ

صلاح الدین کا تعارف مشہور مؤرخ ہٹی نے ان الفاظ کرایا ہے:-

مصر جانے سے صلاح الدین کے نئے دور کا آغاز ہوا۔ اس کے پیش نظر تین مقصد تھے:۔ اوّل یہ کہ مصر میں شیعی حکومت کی جگہ سنی حکومت کی داغ بیل ڈالے۔ دوم۔ مصر و شام کو ایک حکومت سے متحد کر دے۔ سوم فرنگیوں کے خلاف جہاد کو آخری منزل پر پہنچائے۔

پہلا مقصد انتہائی آسانی سے حل ہو گیا۔ اس نے مصر پہنچ کر وزارت پر قبضہ کر لیا جو فاطمی خلافت کا سب سے بڑا منصب تھا۔ دوسرے مقصد کو پورا کرنے کے لیے انتظار میں بیٹھ گیا۔ ۱۱۷۱ء میں ۲۱ سالہ فاطمی خلیفہ عاضد پر نزع کی حالت طاری ہوئی۔ تو صلاح الدین نے حکم دے دیا کہ خطبہ جمعہ میں فاطمی خلیفہ کی جگہ عباسی خلیفہ المستضی کے نام کا خطبہ پڑھا جائے۔ یہ معاملہ پُرامن طریق پر سادگی سے انجام پایا تو کوئی زحمت پیش نہ آئی۔

تین سال بعد نورالدین محمود خناق میں مبتلا ہوا۔ اور صرف چھپن سال کی عمر میں دمشق میں فوت ہو گیا۔ صلاح الدین نے اس کے یازدہ سالہ بیٹے اسمٰعیل سے شام کا تخت چھین لیا۔ خلیفہ بغداد نے بلا توقف حکومت مصر و شام کی سند صلاح الدین کے حوالے کر دی۔ اس حکومت میں مصر و شام کے علاوہ سارا نیکا۔ نوبیا۔ حجاز، یمن اور دوآبہ دجلہ و فرات کا بالائی حصہ شامل تھا۔

محمود زنگی اور فاطمیوں کی سلطنت کے کھنڈر پر ایوبی سلطنت کی بنیاد رکھی گئی[6]

مصادر و حواشی

۱۔ ۵۵۵ھ / ۱۱۶۰ء - ۵۶۷ / ۱۱۷۱ء

۲۔ جو بعد میں سلطان صلاح الدین ایوبی کے نام سے مشہور ہوا۔

۳۔ تاریخ دول الاسلام حصہ اول۔ رزق اللہ۔ مطبوعہ مصر ۱۹۰۷۔ ص ۲۵۱ تا ۲۵۸۔

۴۔ ابن اثیر۔ ج ۱۱۔ ص ۱۵۵۔

۵۔ مقریزی ج ۲ ص ۲۵۴۔

۶۔ القلقشندی: صبح الاعشیٰ۔ ج ۳ ص ۵۹۴

۷ ابن اثیر ج ۱۱ ص ۱۶۵

۸ Stanley Lane Poole P. 160

۹ مصر جہاں شروع شروع میں وہ جانے پر بالکل تیار نہیں تھا۔ بلکہ سخت دل گرفتگی کے عالم میں گیا تھا۔ ملاحظہ ہو:-

ابوشامہ ج ۱ ص ۲۲۳، ۲۲۶

ابوالفداء ج ۳ ص ۴۷

۱۰ تاریخ لبنان (فلپ ہٹی) ص ۲۸۱

○

سلطان صلاح الدین ایوبی

○

آخری فاطمی خلیفہ عاضد کے صلاح الدین پر غیر معمولی احسانات تھے اور عاضد سے کہیں زیادہ نور الدین محمود زنگی کے بار احسان سے صلاح الدین کی گردن جھکی ہوئی تھی۔ نور الدین صلاح الدین کا آقا تھا، محسن تھا، مربی تھا۔ اسی کی نگاہِ التفات نے صلاح الدین کو اور اس کے خاندان کو فرش سے عرش پر پہنچایا۔ مسلمانوں کی لکھی ہوئی اور غیر مسلموں کی لکھی ہوئی تاریخیں اس حقیقت کی معترف ہیں۔

صلاح الدین نے ان دونوں کے ساتھ جو کچھ کیا، اخلاقی نقطۂ نظر سے اسے یقیناً جائز اور مستحسن نہیں قرار دیا جا سکتا۔ لیکن

عشق ازیں بسیار کردست و کند

جذبۂ اقتدار انسان کو اخلاقیات کے ان حدود کا پابند نہیں رہنے دیتا۔ صلاح الدین حمیت ملی اور غیرت مذہبی کا پیکر تھا۔ ہندوستان میں عالمگیر اورنگ زیب کا حال بھی یہی تھا۔ اورنگ زیب نے باپ کے سر سے تاج شہریاری اتارا اور خود زیب سر کر لیا۔ صلاح الدین نے عاضد اور زنگی کی مسند شہریاری پر قبضہ کر لیا۔

اخلاقی نقطۂ نظر سے اس طرز عمل کو نہ سراہا جائے لیکن سیاسی نقطۂ نگاہ سے اور ملی و ملکی مفاد و مصالح کے پیش نظر صلاح الدین اور اورنگ زیب کے لیے اس کے سوا کوئی اور چارۂ کار

بھی نہ تھا۔ ہندوستان کی حکومت اگر اورنگ زیب کے ہاتھ میں نہ آئی ہوتی تو نہ صرف خاندان مغلیہ ختم ہوجاتا، بلکہ ہندوستان کی حکمران قوم ——— مسلمان ——— بھی غلام بن گئی ہوتی۔ اسی طرح اگر سلطان صلاح الدین نے مصر (فاطمیہ) کی حکومت اور شام (نورالدین زنگی) کی حکومت کو اپنی تحویل میں نہ لے لیا ہوتا تو عیسائیوں نے نہ صرف مصر پر قبضہ کر لیا ہوتا، بلکہ شام اور فلسطین کو زیرنگیں کر لیا ہوتا۔ بلکہ حرمین شریفین کو بھی خطرہ لاحق ہوجاتا۔ وہ صلاح الدین اور صرف صلاح الدین تھا جس نے عیسائیوں کی متحدہ یلغار کا ڈٹ کر مقابلہ کیا، جس نے انگلستان، فرانس، جرمنی اور دوسرے یورپین ممالک کی بہترین اور برتر فوجوں کے چھکے چھڑا دیئے، جس کی شمشیر خارا شگاف نے نہ صرف اسلامی مملکت کی ایک انچ زمین بھی عیسائیوں کے قبضے میں نہیں جانے دی، بلکہ فلسطین کا دروازہ کئی صدیوں تک کے لیے ان پر بند کر دیا۔ جس طرح ہندوستان کے مسلمان اورنگ زیب عالمگیر کے احسانات سے سبکدوش نہیں ہو سکتے، اسی طرح صلاح الدین ایوبی کے احسان کا عالم اسلام اور ملت عرب خلوص قلب سے اعتراف کرنے پر مجبور ہیں۔ اس لیے کہ شاور نے مصر کو اتنا کمزور کر دیا تھا کہ عیسائی بڑی آسانی سے اس پر قابض ہو سکتے تھے۔ اسی طرح نورالدین زنگی کی وفات کے بعد اس کی مملکت اس تیزی سے روبہ زوال ہونے لگی تھی کہ اگر اسے نیا خون نہ پہنچتا تو شام اور فلسطین کا سارا علاقہ عیسائیوں کے تصرف میں آجاتا۔

مؤرخین کے ایک طبقے نے جس طرح اورنگ زیب پر نکتہ چینی کی ہے اس سے زیادہ تند اور تلخ الفاظ اور درشت لب و لہجے میں صلاح الدین پر اعتراضات کیے ہیں (لیکن یہ اعتراضات استدلال سے زیادہ جذبات پر مبنی ہیں) انہیں یہ بات کھٹکتی ہے کہ اورنگ زیب نے آداب پدر ملحوظ نہیں رکھے اور صلاح الدین نے احسان شناسی کا ثبوت نہیں دیا۔ اس جذبے سے ہمدردی تو ہو سکتی ہے لیکن اس کی تائید نہیں کی جا سکتی۔ عالمگیر اور صلاح الدین پر اعتراض کرنے والے اصحاب اس حقیقت کو جو روزِ روشن کی طرح واضح ہے، یکسر نظرانداز کر دیتے ہیں۔ ملتِ اسلامیہ کے مفادِ عمومی کا تقاضا یہی تھا۔ اگر اس موقع پر ملت کے مفادِ عمومی کو نظرانداز کر دیا جاتا تو نتائج اتنے

ہولناک ہوتے جن کا تصور بھی آج کرنا مشکل ہے۔ ہندو اور عیسائی استعمار کا حلقہ بہت زیادہ وسیع ہوجاتا۔ اور مسلمان اسیر دام ہو کر رہ جاتے۔

ساتھ ہی ساتھ یہ امر بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ اپنی تمام خوبیوں اور اچھائیوں کے باوجود صلاح الدین بہر حال ایک انسان تھا۔ اور انسان فرشتہ نہیں ہوتا۔ اقدام و عمل کے سلسلے میں انسان سے کچھ کوتاہیاں اور کمزوریاں بھی سرزد ہو سکتی ہیں۔ ایسے مواقع پر دیکھنے کی چیز صرف یہ ہوتی ہے کہ آیا سیئات پر حسنات غالب ہیں یا نہیں؟ اگر غالب ہیں تو پھر اچھائیوں ہی کا پلہ بھاری رہیگا

○

حصّۂ سوم

فاطمیوں کا عہدِ کشورکشائی

تقدیم

○

حصّہ اوّل میں فاطمیوں کے عقائد و افکار، نظامِ دعوت، اس کا تدریجی ارتقاء، تاویل و تفسیر، اور دوسرے متعلقہ مباحث و مسائل پر گفتگو کی جا چکی ہے۔ جس سے بہ آسانی یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ مسلمانوں کے اس فرقے نے کن اصولوں کو سامنے رکھ کر اپنے نظام کی تشکیل کی تھی، اور یہ نظام کہاں سے شروع ہوا اور کہاں تک پہنچا؟ اس نظام کے مضمرات اور ظواہر کیا تھے؟ اس کے اسرار و رموز کیا تھے؟ اس کے اعلانات و بیانات کیا تھے؟ اس کے اماموں نے، داعیوں نے، اور اصحابِ کتب و مسند نے، اپنی جماعت کے فروغ و بقا، اپنے نظام کے عروج و ترقی، اور اپنے سلسلے کے استحکام و دوام کے لیے کون کون سے وسائل اختیار کیے تھے؟

دوسرے حصے میں فاطمی خلفاء کے احوال و سوانح، اور سیرت و کردار پر ایک اجمالی نظر ڈالی گئی ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ یہ لوگ جب مسندِ ولایت سے تختِ سلطانی پر جلوہ گر ہوئے تو ان کے احوال و مقامات کیا تھے؟

اب یہ تیسرا اور آخری حصہ پیش کیا جاتا ہے۔ اس حصے میں جو نسبتاً طویل ہے فاطمی عہد خلافت کے ان خصوصیات پر روشنی ڈالی جائے گی جو اسے اپنے معاصرین سے ممتاز کرتے ہیں۔

یہ مدّت تقریباً پونے تین سو سال پر حاوی ہے۔
اس عرصے میں اس خاندان نے بڑے جاہ و جلال، اور شکوہ و تجمّل کے ساتھ حکومت کی۔ اگرچہ یہ ہر چہار طرف سے ان طاقتوں سے گھرا ہوا تھا جو اس کی مخالف تھیں اور اسے نیست و نابود کر دینے پر تلی ہوئی تھیں، پھر بھی اس نے طویل مدت تک اپنی ساکھ قائم رکھی۔

اس حصّے کو ہم نے چھ بڑے ابواب اور متعدد فصلوں میں تقسیم کیا ہے جو یہ ہیں:

۱۔ عہد فتوحات و کشور کشائی
۲۔ تہذیب و تمدّن
۳۔ علوم و فنون
۴۔ تعمیرات
۵۔ نظام حکمرانی
۶۔ فوجی نظام

آئندہ صفحات میں الگ الگ ان عنوانات پر گفتگو کی جائے گی۔

فاتح مصر جوہر صقلی: سیرت، شخصیت اور کردار

جوہر ایک غلام تھا۔ اس کو اپنی غلامی پر فخر تھا۔ یہ جسم اور بدن کی غلامی نہ تھی، دل اور روح کی غلامی تھی۔ پہلی غلامی کے بندھن ٹوٹ سکتے ہیں، دوسری غلامی کے بندھن اٹوٹ ہیں۔

اس باب میں ہم نے مصر کے مایۂ ناز انشا پرداز، مؤرخ اور اہل قلم الدکتور علی ابراہیم حسن کی محققانہ کتاب "تاریخ جوہر الصقلی: قائد المعز لدین اللہ الفاطمی" سے بہت مدد لی ہے۔

یہ کتاب مطبع حجازی قاہرہ سے ۱۹۳۳ء میں شائع ہوئی ہے۔

جوہر جزیرۂ صقلیہ (سسلی) میں پیدا ہوا[۱]، جو دولت رومی کا ایک حصہ تھا[۲]۔ وہ بہ اعتبار مولد کے رومی الاصل ہے[۳]۔ عرب، روم (شرقی و غربی) کے رہنے والوں کو رومی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

صقلیہ جوہر کا اصلی وطن تھا[۴]، جو دولت روم کے ماتحت تھا۔ پھر اسے اغالبہ نے فتح کر لیا[۵]۔ یہ واقعہ ۲۱۲ھ (۸۲۷ء) کا ہے۔ فتح کا سہرا اسد بن فرات[۶] قاضی قیروان کے سر رہا۔ یہ خلیفہ مامون الرشید کا زمانہ تھا۔

یاقوت کا بیان ہے[۸] کہ اسد نے اس جزیرے کو نو سو سواروں اور دس ہزار پیدل سپاہ کے لشکر سے فتح کیا۔

اس فتح کے بعد جزیرۂ صقلیہ کے اکثر باشندے مسلمان ہو گئے۔ انھوں نے یہاں بہت سی مسجدیں بنائیں اور دارالعلوم قائم کیے۔

۳۶۲ھ میں ابن حوقل نے اس جزیرے کی سیاحت کی۔ یہ وہ سال ہے جب المعز لدین اللہ فاطمی قاہرہ کو اپنا پایۂ تخت بنا کر وہاں پہنچ چکا تھا۔ ابن حوقل نے ایک کتاب "محاسن اہل صقلیہ" کے نام سے لکھی۔ اس میں صقلیہ کے شہروں خاص طور پر بلورم اور خالصہ کا ذکر کیا۔ وہ کہتا ہے یہاں مسلمانوں نے جو شاندار مسجدیں بنائی ہیں ان کی تعداد ۳۰۰ سے متجاوز ہے۔

ادریسی (متوفی ۵۶۰ھ / ۱۱۶۵ء) نے بھی جو اپنے وقت کا جہانیاں جہاں گشت گزرا ہے یہاں کی سیاحت کی اور یہاں کے عیسائی بادشاہ راجر کو ایک کرۂ ارض پیش کیا جو چاندی کا تھا جس پر دریاؤں اور میدانوں کے نشانات مرتسم تھے۔

جس طرح اہل صقلیہ کے مابین اسلام تیزی سے پھیلا اسی طرح عربی زبان کو بھی وہاں کی فضا خوب راس آئی۔ بہت جلد یہ زبان وہاں پھیل گئی۔ اور عام بول چال کی زبان بن گئی اور سرکاری زبان کا مرتبہ بھی اسے حاصل ہو گیا۔ اس جزیرے میں افلاطون اور ارسطو کے اہم مؤلفات کا ترجمہ بھی بہ زبان عربی کیا گیا۔ اس کا اثر اتنا دیرپا اور مستحکم ثابت ہوا کہ مسلمانوں کی حکومت ختم ہونے اور مسلمانوں کے جلا وطن ہونے اور پورے طور پر عیسائی غلبہ و تسلط قائم ہو جانے کے بعد بھی راجر نارمنڈی فرماں روائے صقلیہ کے عہد میں بھی اس کے نقوش و اثرات قائم رہے۔ اور نظم حکومت اور آئین ملکت میں مسلمانوں کے نقش قدم پر رہروی کی جاتی رہی۔

عربی زبان کے اثر و نفوذ کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ عیسائی غلبہ و تسلط کو کئی مدت گزر جانے کے بعد بھی نارمنڈی فرماں روا فصیح و بلیغ عربی روانی اور شستگی سے بولا کرتے تھے۔[۹]

یہ ایک طبعی امر تھا کہ اس فضا اور سوسائٹی سے جوہر متاثر ہوتا۔ اس نے ایک مسلمان کی حیثیت سے نشوونما کے مدارج طے کیے۔ عربی اور لاطینی زبان پر اسے یکساں عبور تھا۔ اس ثقافت کا بہت گہرا اثر جوہر پر حسن سیاست اور مہارت حرب کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اور یہ ثقافت فاطمی خلفاء میں بھی عام تھی۔ چنانچہ خود المعز کئی زبانوں کا ماہر تھا۔ عربی زبان کے علاوہ یونانی اور صقلی زبان پر بھی اسے عبور حاصل تھا۔ اسی طرح علوم و آداب، فہم و ذکاء اور حسن تدبیر میں بھی وہ اپنی مثال آپ تھا۔[10]

افسوس ہے کہ تاریخ جوہر کے خاندان، ماں باپ، اور بھائی بہن، اور اعزا و اقربا کے بارے میں کوئی قابلِ ذکر سرمایہ محفوظ نہ رکھ سکی۔ نہ یہ معلوم ہو سکا کہ وہ معز کے پاس کس طرح پہنچا؟

ہمارے پاس ایسے مصادر بھی نہیں ہیں کہ ہم جوہر کے سالِ ولادت کی تعیین کر سکیں۔ البتہ ابن زولاق[11] کی ایک روایت ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ الشریف ابوجعفر مسلم نے بعد از صلح ۳۵۸ھ میں بہ مقام فسطاط اس کی عمر دریافت کی تو اس نے کہا:

"میری عمر کم و بیش پچاس سال کی ہے۔"

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جوہر کی ولادت ۳۰۵ھ اور ۳۰۷ھ کے مابین ہوئی۔ لیکن یہ روایت مقریزی[12] کی روایت سے متعارض ہے کہ جوہر نے ۳۸۱ھ میں وفات پائی۔ بہ وقت وفات اس کی عمر اسی سال سے کچھ زیادہ تھی۔ اگر اس روایت کو صحیح مان لیا جائے تو جوہر کا سالِ ولادت ۲۹۸ھ اور ۳۰۰ کے مابین ٹھہرتا ہے۔ لیکن ہم پہلی روایت کو ترجیح دیتے ہیں کیونکہ اس کا راوی خود جوہر ہے۔

مؤرخین نے اس امر پر بھی روشنی نہیں ڈالی ہے کہ جوہر مسلمان پیدا ہوا یا اس نے خود اسلام قبول کیا ہو لیکن غالب گمان یہ ہے کہ وہ مسلمان پیدا ہوا۔

جزیرۂ صقلیہ میں اسلام ۲۱۲ھ میں پھیلا، اور یہ واقعہ جوہر کے بارگاہِ معز سے وابستہ ہونے سے بہت پہلے کا ہے۔ پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ جوہر کا باپ جس نام سے پکارا جاتا تھا وہ "عبداللہ" تھا، اور ظاہر ہے یہ اسلامی نام ہے۔ ہو سکتا ہے کہ صقلیہ میں اوائل اشاعت اسلام کے دور میں عبداللہ نے اسلام قبول کر لیا ہو۔ اور جوہر نے اپنے باپ کے دین پر آنکھیں کھولی ہوں۔ باقی رہے اس کے اجداد تو ان کے بارے میں تاریخ خاموش ہے۔

مؤرخین نے جوہر کے نسب کا ذکر اس طرح کیا ہے:

"ابوالحسین جوہر بن عبداللہ۔"

جوہر ایک آزاد کردہ غلام تھا، اور موالیوں کی تدوین انساب کی طرف مؤرخوں نے بہت کم توجہ کی ہے۔

جوہر کا نام حسین تھا، اور کنیت ابوعبداللہ۔ اپنے باپ کی زندگی میں وہ "قائد (سالار) ابن قائد" کے نام سے مشہور تھا۔[۳]

دولت فاطمیہ کے زیر سایہ بلادِ مغرب میں المعز کے موالیوں کے مابین جوہر نے نشو و نما کے مدارج طے کیے۔ مقریزی کا قول ہے کہ معز اپنے موالیوں میں جوہر کو بہت عزیز رکھتا تھا۔ اسی نے "ابوالحسین" کی کنیت اسے عطا کی تھی۔ رفتہ رفتہ جوہر نے اپنے آقا کا زیادہ سے زیادہ تقرب حاصل کر لیا۔[۴]

جوہر بلادِ مغرب میں عروج و فروغ کے مناصب طے کرتا رہا یہاں تک کہ معز نے اسے اپنا کاتب (سیکریٹری) بنا لیا۔ یہ ۳۴۱ھ (۹۲۳ء) کا واقعہ ہے۔ اس کے بعد سے اس کا لقب "جوہر الکاتب" پڑ گیا۔

معز نے جوہر کو مسند نشین خلافت ہونے سے پہلے ہی بہت اچھی طرح پرکھ لیا تھا۔ ورنہ ممکن نہ تھا کہ وہ اس سرعت سے اس بلندی پر فائز ہو سکتا۔ ۳۴۱ھ میں معز نے اسے اپنا سیکریٹری بنایا، اسی سال وہ مسند خلافت پر متمکن ہوا۔

کتابت کا منصب حکومت عالیہ کے مناصب میں بس وزارت کے بعد ہی تھا۔ خلفاء یہ منصب صرف اسی کو سونپتے تھے جس کی ذکاوت و ذہانت، وفاداری حسن سیاست اور سوجھ بوجھ شک و شبہ سے ماوراء ہو۔

جوہر خلیفۂ وقت کا معتمد خصوصی تھا۔ چنانچہ خلیفہ معز نے اسے ۳۴۷ھ میں منصب وزارت پر فائز کر دیا۔ جوہر کے قلم میں بڑا زور تھا۔ وہ بہت اچھا انشا پرداز تھا مصریوں کے لیے اس نے جو معاہدۂ صلح تحریر کیا وہ فصاحت و بلاغت کا شاہکار ہے۔

ابن خلکان کی روایت ہے کہ معز نے صفر ۳۴۷ھ میں بلاد مغرب کے باقی ماندہ شہروں کی فتح پر جوہر کو مامور کیا۔ اسے ایک بہت بڑے لشکر کا سالار بنایا۔ اس لشکر میں بڑی تعداد مغاربہ (اہل مغرب) کی تھی[۱۴]۔ انھی میں زیری بن مناد الصنہاجی بھی تھا، جس کے بیٹے بلکین کو معز نے مصر روانہ ہوتے وقت اس کا قائم مقام بنا دیا تھا۔

جوہر ایک سیل رواں کی طرح تاہرت[۱۵] پہنچا اور اس پر قابض ہو گیا۔ اس کے بعد وہ شہر فاس کی طرف بڑھا۔ یہاں کے لوگوں نے مزاحمت کی۔ اسے چھوڑ کر وہ سجلماسہ[۱۶] کی طرف بڑھا اور اسے فتح کر لیا۔ یہاں ایک شخص تھا جو "شاکر باللہ" کے نام سے یاد کیا جاتا تھا، اور لوگ اسے امیر المومنین کہتے تھے۔ اسے جب معلوم ہوا کہ جوہر قریب پہنچ گیا ہے تو بھاگ کھڑا ہوا۔ جوہر نے پیچھا کیا۔ گرفتار کر لیا اور قید کر دیا۔ پھر تو جوہر نے شہر پر شہر فتح کرنے شروع کر دیئے۔ یہاں تک کہ بحر اطلس کے ساحل تک پہنچ گیا[۱۷] اور معز پر یہ ثابت کرنے کے لیے کہ وہ فتح کرتا ہوا کہاں تک پہنچ چکا ہے سمندر سے مچھلیاں شکار کرائیں اور انھیں پانی کے ایک ٹب میں رکھ کر معز کے پاس بھیج دیا[illegible]۔

بلاد مغرب پر جب جوہر کا استیلاء مکمل ہو گیا تو وہ فاس فتح کرنے کے لیے پھر بڑھا۔ اپنے ارادے میں اس مرتبہ کامیاب ہوا اور بزور قوت شہر کو سرنگوں ہونے پر مجبور کر دیا۔ اس نے فاس اور سجلماسہ کے حکمرانوں کو ایک پنجرے میں بند کیا، اور

گراں بہا تحائف و ہدایا کے ساتھ خلیفہ معز کی خدمت میں جو بہ مقام مہدیہ مقیم تھا بھیج دیا۔

اس طرح ایک سال سے کم کی مدت میں پورے بلادِ مغرب پر جوہر نے قبضہ کر لیا اور تسلط حاصل کر لیا، اور یوں ان فتوحات کو درجۂ اتمام تک پہنچا دیا، جن کا آغاز ابو عبداللہ شیعی نے ۲۹۱ھ (۸۹۶ء) میں کیا تھا۔ ان مقامات کے لوگوں نے معز کی قوت و شوکت کے سامنے ہتھیار ڈال دیے اور اس کی طاعت اور ولا کا حلقہ اپنے گلے میں ڈال لیا۔ ان کامیابیوں اور کامرانیوں کا صلہ معز کی بارگاہ سے جوہر کو یہ ملا کہ وہ اس لشکر کا میر عسکر بنا دیا گیا جو فتح مصر کے لیے تیار کیا گیا تھا، اور "القائد" (سالار اعظم) کا لقب مرحمت ہوا۔

ابن خلکان نے ذکر کیا ہے کہ جوہر بلادِ مغرب میں تھا کہ ایسا شدید بیمار پڑا کہ موت سرہانے کھڑی نظر آنے لگی۔ معز کو بڑا صدمہ ہوا وہ بہ نفس نفیس اس کی عیادت کے لیے گیا۔ اور یہ شرف خاص خاص مقربان بارگاہ ہی کو حاصل ہوتا تھا۔ جب وہ اس کی عیادت کر کے واپس آیا تو کہنے لگا:

"جوہر مر نہیں سکتا، بہت جلد مصر اس کے ہاتھ پر فتح ہو گا۔"

معز کی یہ پیش گوئی درست ثابت ہوئی۔ جوہر تندرست ہو گیا، اور بہت جلد مصر پر حملہ کرنے کے لیے روانہ ہو گیا۔ معز خود اسے وداع کرنے کے لیے آیا۔[۱۰]

حواشی اور مآخذ

۱۔ جوہر الصقلی (مطبوعہ مصر) ص ۱۷

۲۔ جوہر الصقلی (مطبوعہ مصر) ص ۱۷

۳۔ مقریزی کا بیان ہے:

"جوہر ایک رومی غلام تھا جس کی پرورش المعز لدین اللہ نے کی تھی۔"

(الخطط ج ۱، ص ۳۷۷)

اسی طرح اسٹینلی لین پول نے بھی اسے "رومی غلام" کے نام سے یاد کیا ہے۔

(The Story of Cairo, p. 1177)

۴۔ صقلیہ: یہ جزائر بحر ابیض متوسط کا ایک جزیرہ ہے۔ اس کے اور افریقہ کے مابین ایک سو چالیس میل کا فاصلہ ہے۔ یہ بہت سرسبز و شاداب جزیرہ تھا جس میں کئی شہر، اور بہت سے قصبے اور دیہات آباد تھے۔ اس کے شہروں کی تعداد تقریباً ۲۳ تھی، اور ۳۲ مستحکم اور مضبوط قلعے تھے۔ یہاں ایک آتش فشاں پہاڑ بھی تھا جس کے عجائب اور آتش ریزی کا مشاہدہ کرنے عہد قدیم کے حکماء آیا کرتے تھے۔ یہاں سونے کی کان بھی تھی چنانچہ رومیوں نے اس کا نام "کوہ زر" (جبل الذہب) رکھ دیا تھا۔ اس کا پایہ تخت شہر بلرم تھا جو اس جزیرے کے شہروں میں سے بڑا تھا۔

(یاقوت: معجم البلدان، ج ۵، ص ۳۴۳-۳۴۶)

۵۔ دولت اغالبہ کا قیام ابراہیم بن الاغلب کی عالی حوصلگی کا نتیجہ تھا۔ ابراہیم اور اس کی اولاد نے ۱۸۴ھ (۸۰۰ء) سے لے کر ۲۹۶ھ (۹۰۹ء) تک یہاں حکومت اور فرماں روائی کی۔

Stanley Lane Poole: The Mohammadan Dynasties, p. 36

۶۔ آثار امام ابو یوسف (مترجم رئیس احمد جعفری)

۷۔ معجم البلدان، ج ۵، ص ۳۰۵

Encyclopaedia of Islam, S.V. -۸

Encyclopaedia Britannica, -۹

Encyclopaedia of Islam, Sicily S.V.

Stanley Lane-poole: The Story of Cairo, p. 116. -۱۰

۱۱۔ المقریزی: اتعاظ الحنفا، ص ۱۰۱

۱۲۔ المقریزی: الخطط، ج ۱، ص ۳۸۰

۱۳- المقریزی: الخطط ، ج ۲، ص ۱۴۲

۱۴- الخطط ، مقریزی، ج ۱، ص ۲۵۱

۱۵- ابن خلکان ، ج ۲، ص ۱۰۲

۱۶- تاہرت (اور تہرت) ۔ دو شہروں کا نام ہے جو آمنے سامنے واقع ہوئے تھے۔ ۲۹۶ھ میں ابوعبداللہ شیعی نے اس پر قبضہ کر لیا تھا۔ ان دونوں شہروں پر جو رستم قابض ہو گئے تھے۔ یہاں بے شمار حمام تھے۔ بازار کشادہ اور وسیع۔ میمون بن عبدالوہاب بن رستم بن بہرام ———— بہرام کا آزاد کردہ غلام تھا ———— اس وقت میمون تاہرت کا فرماں روا تھا۔ یہ فرقہ اباضیہ (ایک خارجی فرقہ) کا سردار اور امام تھا۔

۱۷- سجلماسہ: مغرب اقصیٰ کا ایک شہر۔ اس شہر میں دو نہریں شرقاً و غرباً بہتی تھیں یہ شہر قیروان سے ۲۴ فرسخ کے فاصلہ پر واقع ہوا ہے۔ ۱۴۰ھ میں اس کی بنا پڑی۔ ۱۰۰ھ میں اس پر بنو مدرار نے قبضہ کر لیا اور اپنی حکومت کا پایۂ تخت بنا لیا۔

(الکبری ، ص ۱۴۸-۱۴۹)

۱۸- المقریزی: الخطط ، ج ۱، ص ۳۵۲

۱۹- المقریزی: الخطط ج ۱، ص ۳۸۸

۲۰- ابن خلکان ، ج ۱، ص ۱۱۹

نیز ملاحظہ ہو:

Stanley Lane-poole: Egypt in the midlle Ages, p. 97.

۲۱- جوہر الصقلی ، مطبوعہ مصر ، ص ۲۱

مصر کی حالت فتح فاطمی سے پہلے

فتح فاطمی سے پیشتر ۳۲۳ھ سے اخشیدیوں کی حکومت مصر پر چلی آرہی تھی، اور یہ صورت ۳۵۸ھ تک قائم رہی جب المعز لدین اللہ کے جیوشش کی قیادت کرتے ہوئے جوہر نے مصر فتح کر لیا۔

اس عہد میں اخشیدی خاندان صاحب قوت و شوکت تھا۔ یہ خاندان خلافت عباسیہ کا مطیع تھا اور عباسی خلافت اس کی پشت پناہ اور معین و مددگار تھی۔ عام حالات بھی بہتر تھے۔ امن و امان کی کارفرمائی تھی۔ چنانچہ مصر میں فاطمیوں کے حملے روکنے کی اسے پوری طاقت حاصل تھی، جو خلافت عبید اللہ المہدی کے زمانے سے اس پر قبضہ کی فکر میں تھے۔ ۳۲۴ھ میں قائم بن المہدی کے دور میں جب جیوش فاطمی نے مصر پر حملہ کیا تو اخشیدیوں نے اسے پسپا کر دیا۔

اخشید اور خلیفۂ عباسی کے درمیان تعلقات بہت زیادہ خوشگوار تھے" اور مستحکم بنیادوں پر قائم تھے۔ یہاں تک کہ ابن واثق خلیفہ کے حکم سے اخشید کے بجائے والی بن کر آیا۔ اخشید نے بغاوت کر دی اور خطبہ سے عباسی خلیفہ کا نام نکال کر خلیفہ قائم فاطمی کا نام داخل کر دیا ـــــ یہ عمل گویا فاطمیوں کے اعتراف اجلال کا آغاز تھا۔

۳۳۴ھ ذی القعدہ میں اخشید کی وفات بہ مقام فلسطین ہوئی۔ وہ بیت المقدس میں دفن کیا گیا۔ اس کا بڑا بیٹا ابوالقاسم انوجور[۱] اس کا جانشین بنا۔ اس کی عمر ۱۵ سال کی تھی۔ اس کی نگہداشت اور تدبیر امر کی ذمہ داری ابوالمسک کافور کو عطا ہوئی۔

کافور مصر کے ایک شخص کا حبشی غلام تھا۔ محمد طغج بانی دولت اخشیدیہ نے اسے خرید لیا۔ رفتہ رفتہ یہ اس کا سپہ سالار اعظم بن گیا۔

سیوطی کا بیان ہے کہ اخشید نے کافور کو ۱۸ دینار میں خریدا تھا[۲]۔ مقریزی کا کہنا ہے کہ ہدیہ کے طور پر یہ محمد بن طغج کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا۔[۳]

اپنے غلاموں میں اخشید کافور کو بہت چاہتا تھا۔ چنانچہ بہت جلد اس نے اپنے دونوں بیٹوں ابوالقاسم انوجور اور ابوالحسن کا "اتابک"[۴] بنا دیا۔ اخشید نے کافور میں نجابت اور ہمت کا جوہر دیکھا۔ بعض مؤرخین کہتے ہیں وہ کہا کرتا تھا:

"خدا کی قسم حکومت ابن طغج کا وارث اس غلام کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا۔"

اخشید کے بعد کافور نے اپنی ذمہ داریوں کو خوبی سے نباہا۔ ایک دفعہ اہل مصر نے بغاوت کی اسے کچل دیا۔ سیف الدولہ حمدانی (ابوالحسن علی) کے حملہ کو بھی اس نے پسپا کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بہت زیادہ مقبول اور ہر دلعزیز ہو گیا۔ اخشید کے ممالک محروسہ مصر، شام اور حجاز کے منابر پر اسے ابوالمسک کافور کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔[۵] عباسی خلیفہ نے بھی اس کنیت کو شرف قبول بخشا اور حکومت عباسیہ کے قواد و کبار رجال کی نظر میں چڑھ گیا۔[۶]

کافور کے ازدیاد نفوذ و اقتدار کے باعث اس کے اور انوجور کے مابین عداوت اور دشمنی پیدا ہو گئی۔ فوج بھی دو حصوں میں بٹ گئی۔ اخشیدیہ اور کافوریہ۔ ذی قعدہ ۳۴۹ھ میں انوجور کا انتقال ۲۹ سال کی عمر میں ہو گیا۔ بعض مؤرخین کا خیال ہے کافور نے زہر دے کر اسے ہلاک کر دیا۔ اس کی جگہ کافور نے ابوالحسن علی کو مسند نشین کیا، جس کی عمر ۲۲ سال کی تھی۔ لیکن کافور نے

اسے بھی ہدف ستم بنایا۔ انوجور کی طرح اس کا بھی سالانہ وظیفہ چار لاکھ دینار مقرر کر دیا اور لوگوں کو اس کے پاس آنے جانے سے منع کر دیا۔ لیکن اس حالت میں بھی کافور اسے برداشت نہ کر سکا اور اس کا انجام بھی وہی ہوا جو اس کے بھائی کا ہوا تھا۔ یہ واقعہ ۳۵۵ھ کا ہے۔ اس کی وفات کے بعد کافور نے اس کے بیٹے احمد کو صغر سنی کی آڑ لے کر مسند نشین نہیں کیا۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد دربارِ خلافت سے اسے ولایت مصر اور ممالک محروسہ اخشیدیہ کا پروانۂ حکومت عطا ہو گیا۔ خلیفہ کے بعد مصر، شام اور حجاز کے منابر پر اسی کا نام لیا جانے لگا۔

ولایت مصر پر کافور کے فائز ہونے کے بعد المعز نے ایک فوج مصر فتح کرنے کے لیے بھیجی۔ کافور نے اسے پسپا کر دیا، لیکن فاطمی دعاۃ کا استقبال کرنے پر مجبور ہو گیا۔ ان کی دعوت کا نتیجہ یہ نکلا کہ افواج اخشیدیہ و کافوریہ کے بہت سے لوگ فاطمی مذہب کی طرف مائل ہو گئے۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خود مصری بھی چاہنے لگے تھے کہ حکومت عباسیوں سے فاطمیوں میں منتقل ہو جائے۔ پھر بعد میں ایسے حوادث رونما ہوئے جنھوں نے اس جذبہ کو اور زیادہ بڑھا دیا۔ مصر آفات و مصائب کا شکار ہو گیا جس کی نظیر پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔ دریائے نیل ۳۵۱ھ میں اتر گیا۔ قحط عام ہو گیا۔ وبائیں پھوٹ پڑیں۔ گرانی حد سے زیادہ بڑھ گئی۔ گندم نایاب ہو گیا۔ موت کی گرم بازاری اتنی بڑھی کہ لوگوں کے لیے مُردوں کی تدفین اور تکفین ایک کار دشوار بن گئی۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ بہت سی لاشیں دریائے نیل میں بہا دی گئیں۔[9] ابن خلدون کا بیان ہے کہ شرح اموات ۶ لاکھ تک پہنچ گئی۔

پھر مزید براں ۳۵۲ھ (۹۶۳ء) میں قرامطہ نے شام پر حملہ کیا، اور کافور ان کا دفاع نہ کر سکا۔ قرامطہ نے مکہ جانے والے حجاج کے قافلوں کو لوٹ لیا۔ (۳۵۵ھ) کافور نہ صرف قرامطہ کو نہ روک سکا بلکہ انھوں نے مصر پر حملہ کر دیا۔ حکومت کا نظام درہم برہم ہو گیا۔ کافور کی مالی حالت اتنی بگڑ گئی کہ

وہ سپاہیوں اور ملازموں اور غلمانوں کی تنخواہ[10] تک ادا کرنے سے معذور ہوگیا۔ چنانچہ یہ لوگ بغاوت پر آمادہ ہوگئے۔[11]

۲۰ رجمادی الاوّل ۳۵۷ھ (۹۶۸ء) کو ستر سال کی عمر میں کافور کا انتقال ہوگیا۔ اس نے تقریباً ۲۱ سال تک شان و شوکت کے ساتھ حکومت کی۔ دمشق میں اس کی تدفین ہوئی۔[12] اس نے مصر کو اس حالت میں چھوڑا کہ نارکی، طوائف الملوکی اور اضطراب کی کیفیت سارے ملک پر طاری تھی۔

اس عرصہ میں مصریوں کے ایک بڑے طبقہ کے درمیان مذہب فاطمی برابر پھیلتا رہا اور اس طرح جوہر کے لیے فتح مصر کا سامان خود بخود مہیا ہونے لگا۔

اس وقت دولت عباسیہ ضعف و انحلال کے آخری درجہ پر پہنچی ہوئی تھی۔ ہر طرف طوائف الملوکی، بغاوت، شورش اور ہنگامہ آرائی کی کارفرمائی تھی۔ خلیفہ بنی بویہ (۳۳۴ھ — ۴۴۷ھ — ۹۴۵ھ — ۱۰۵۵ء) کے ہاتھوں کٹھ پتلی بنا ہوا تھا۔ خلیفہ کا نام صرف خطبے اور سکّے میں باقی تھا ورنہ اس کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ لیکن اس کی ضرورت اس لیے تھی کہ اس کا ظاہری احترام و اجلال ہی ان امرا کے لیے قوت و اقتدار کا سرچشمہ تھا۔[13]

کافور کے بعد دربار عباسی سے کوئی والی مقرر نہ ہو سکا۔ خود مصریوں نے اخشید کے پوتے ابوالفوارس کو جو ۱۲ سال کا نوجوان تھا[14] والی بنالیا۔ اس زمانے میں اخشید کا بھائی ابومحمد الحسن بن عبیداللہ قرامطہ کے ہاتھوں سے زچ کر شام سے مصر بھاگ آیا۔ مصریوں نے اسے امیر فوج بنادیا۔ یہ بھی ستم گر اور مستبد ثابت ہوا۔ اس نے جعفر بن فرات کو جو وزیر اعظم تھا گرفتار کرلیا اور اس کی ساری دولت سمیٹ کر شام چلا گیا۔[15] حسن کے جانے کے بعد ابن فرات پھر برسر اقتدار آگیا۔ اور تقریباً ۱۵ مہینے تک داد حکومت دیتا رہا۔ لیکن اس اثنا میں حالات بد سے بدتر ہوتے گئے۔[16] اور فتح مصر کی آسانیاں

فاطمیوں کے لیے پیدا ہوتی گئیں۔

حواشی اور مآخذ

۱۔ ابو المحاسن: ج ۲، ص ۲۷۱

۲۔ انجور یا اُنوجور کے معنی عربی زبان میں "محمد" کے ہیں۔ جیسا کہ ابن خلکان (ج ۱، ص ۲۴۵) اور سیوطی (ج ۲، ص ۳۷۳) نے ذکر کیا ہے۔

۳۔ حسن المحاضرہ فی اخبار مصر والقاہرہ (ج ۲، ص ۳۷۳) وابن خلکان ج ۱، ص ۱۳۱،

۴۔ الخطط: ج ۲، ص ۲۶

۵۔ ترکی زبان میں "اتا" کے معنی ہیں باپ اور "بگ" کے معنی ہیں امیر۔ لہذا اتابک کے معنی ہوئے پدر امیر یا اتالیق امیر۔

۶۔ یہ کنیت از قبیل نہج وشکا لکت تھی کیونکہ مشک کا رنگ کالا ہوتا ہے اور کافور بھی سیاہ رنگ تھا۔ لفظ کافور کے لیے یہ ٹھٹھول اور زیادہ پُرلطف تھی کیونکہ کافور سفید ہوتا ہے اور یہ سیاہ فام تھا۔

۷۔ Stanley Lane-poole: The Story of Cairo, p. 101.

۸۔ ابو المحاسن: ج ۱، ص ۳۱۵

۹۔ المقریزی: خطط، ج ۲، ص ۲۷

۱۰۔ مقریزی نے ان غلمان کی تعداد ایک ہزار سات سو بتائی ہے۔

۱۱۔ G. Wiet: Precis d, Histoire Musalmane de l, Egypt, p. 31

۱۲۔ Stanley Lane-poole: The Story of Cairo, p. 103.

۱۳۔ Gibban: Decline and Fall of the

Roman Empire, VI, pp. 54-55.

۱۴- ابن خلکان، ج۱، ص ۴۵۷

۱۵- Stanley Lane-poole: History of Egypt in The Middle Ages, pp. 87, 90.

۱۶- Stanley Lane-poole: The History of Cairo, p. 117.

فتح مصر

اسباب ترغیب:

۱۔ مصر پر قبضہ کے بعد شام و حجاز پر قبضہ میں فاطمیوں کو آسانی پیدا ہو جاتی
۲۔ مصر کا جغرافی محل وقوع مابین شرق و غرب تھا جو مفید مطلب تھا۔
۳۔ دولت و ثروت کی کثرت
۴۔ نشر عقائد کی دوسرے متصلہ ممالک میں آسانی فتح مصر کے بعد۔

عبید اللہ المہدی (۲۹۷ھ - ۳۲۲ھ) اوّل خلیفہ فاطمی نے مصر پر تین حملے کیے جو ناکام رہے۔

حملۂ اوّل - ۳۰۱ھ

حملۂ دوم - ۳۰۷ھ - جو وقتاً فوقتاً ۳۰۹ھ تک جاری رہا۔

حملۂ سوم - ۳۲۱ھ - جو عہد القائم بن المہدی یعنی ۳۲۴ھ تک جاری رہا۔ ابتک مصر اتنا طاقتور تھا کہ اس نے یہ حملے رد کر دیے۔

قائم کی باقی مدت خلافت (۳۲۲ھ - ۳۳۴ھ) میں یہ حملے ملتوی رہے۔ کیونکہ حکومت عباسیہ دفاع کا پورا سر و سامان بہم رکھتی تھی۔ نیز ایک وجہ بلاد مغرب میں خوارج کی شورشیں بھی تھیں۔ اثرات و نتائج کے اعتبار سے ابو یزید مخلد بن کیداد

کی شورش اور بغاوت تھی جس نے فاطمی حکومت کو زیر و زبر کر کے رکھ دیا۔ اس کے چوٹی کے آدمی جان سے مارے گئے اور اس کا خزانہ سونے چاندی سے خالی ہو گیا۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جوہر صرف ایک سپہ سالار ہی نہیں تھا، مدبّر اور صاحب سیاست بھی تھا۔ اس طرح اس نے مصریوں کے دل جیت لیے۔ سپاہ اور اہل لشکر کو بھی انعام و اکرام سے مالا مال کر دیا۔

اہل فسطاط کو جب خبر ملی کہ جوہر اسکندریہ پر قابض ہو گیا ہے تو وزیر جعفر بن الفرات نے کبار رجال دولت کی ایک مجلس منعقد کی اور تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد سب کی رائے یہ قرار پائی کہ جوہر سے صلح کر لی جائے۔ چنانچہ ابن الفرات کو گفتگوئے صلح اور طلب امان سے متعلق سارے اختیارات دیدیے گئے۔ ابن الفرات نے ابوجعفر مسلم کو جو اشراف علویین میں شمار ہوتے تھے، اور جن کا مصری بے حد احترام کرتے تھے، اپنا نائب بنا کر اس کارِ خاص پر بھیجنا چاہا۔ انھوں نے یہ پیش کش منظور کر لی اور اصحاب نفوذ و رائے کے ایک وفد کے ساتھ روانہ ہو گئے۔[1]

یہ وفد جوہر سے تروجہ[2] میں ۱۸ رجب ۳۵۸ھ میں ملا۔ جوہر نے اس کی عرضداشت قبول کر لی۔

اس طرح مصریین اور فاطمیین میں پیمان صلح استوار ہو گیا۔ صلح نامہ جو ایک وثیقۂ تاریخی کی حیثیت رکھتا ہے مقریزی نے نقل کیا ہے۔[3]

مصر پر حملہ کی تیاریاں معز پہلے ہی سے کر رہا تھا۔ چنانچہ اس نے پڑاؤ کے مقامات پر کنوئیں کھودنے اور راستہ ہموار کرنے کے احکامات جاری کر دیے اور زر و مال بھی مصارف جنگ کے لیے جمع کرنا شروع کر دیا۔

معز نے کوئی دقیقہ تیاری میں اٹھا نہیں رکھا۔ کہتے ہیں اس کا لشکر شجاعانِ کتامہ (ایک بربر قبیلہ) کے ایک لاکھ افراد سے زیادہ پر مشتمل تھا۔ انھیں معز نے

مالامال کر دیا۔ اور بقول مقریزی ان کے ارزاق وعطایا پر جو رقم خرچ کی وہ چودہ ملین دینار سے کم نہ تھی۔

فتح مصر اور شام وحجاز پر قبضہ کرنے کے لیے خلیفہ معز کتنا بے چین تھا، اس کا اندازہ اس کے اس خطبہ سے ہوگا جو اس نے فوج کے کوچ سے پہلے شیوخِ کتامہ کے سامنے دیا تھا۔ اس نے کہا تھا:

"ہمیں تمہاری نصرت کی ضرورت ہے۔ یاد رکھو تمہیں ہمارے احکام کی پابندی ہر حال کرنی ہے۔ مجھے خدا سے (قوی) امید ہے۔ جس طرح اس نے مشرق کا مرحلہ ہم پر آسان کر دیا ہے اسی طرح مغرب کا مرحلہ بھی تمہاری مدد سے آسان کر دے گا۔"[۴]

اس کارِ اہم کو سرانجام دینے کے لیے معز کی نظر جوہر پر گئی جس کی حربی مہارت اور جنگی قابلیت کو سب مانتے تھے۔ جس نے بڑی کامیابی کے ساتھ مغرب کے دور دراز علاقوں کو معز کے ممالک محروسہ سے ملحق کر دیا تھا۔ چنانچہ اس لشکر کی کمان اس نے جوہر کو سونپی۔

معز کو جوہر پر کتنا اعتماد تھا اس کا اندازہ اس امر سے ہوگا کہ جب وہ جیوش فاطمی کو رخصت کرنے شہر رقادہ[۵] پہنچا تو اس نے کہا:

"خدا کی قسم اگر جوہر تن تنہا بھی فتح مصر کے ارادے سے چل کھڑا ہو تو وہ اسے معمولی سی کوشش سے فتح کر لے گا۔ اور ہم ضرور خراباتِ ابن طولون میں جا کر دم لیں گے، اور ایک ایسے شہر کی بنیاد ڈالیں گے جس سے دنیا دنگ رہ جائے گی۔"

اس خطبہ سے تین امور پر روشنی پڑتی ہے:

۱۔ اپنے سالارِ لشکر کی مدح میں زیادہ سے زیادہ غلو جس کا اثر یہ ہوا کہ مصری عساکر کی پچھلی ناکامیوں کے باوجود ان الفاظ نے جوہر میں ایک نیا ولولہ پیدا کر دیا اور اس نے اپنے آپ کو خلیفہ کے حسن ظن کا سزاوار ثابت کرنے کے لیے تن من دھن

کی پابندی لگا دی۔

۲۔ معز احوال مصر سے پورے طور پر واقف تھا اور جانتا تھا کہ اب فاطمی لشکر کا روک لینا مصر کے بس سے باہر ہے۔

۳۔ معز نے طے کر لیا تھا کہ اس کا نیا پایۂ تخت مصر ہوگا تاکہ وہاں سے وہ بلادِ شرق پر اپنے دینی و سیاسی نفوذ کو آسان پائے۔

نیز جدید پایۂ تخت کے لیے "قاہرہ" کا لفظ پہلے سے یعنی قبل اس کے کہ جوہر قاہرہ کی بنیاد ڈالتا معز کے ذہن و دماغ میں موجود تھا۔

علاوہ ازیں ابن خلکان کی روایت ہے[6] کہ معز نے اپنی اولاد اور رجالِ دولت کو حکم دیا کہ جوہر کو رخصت کرتے وقت اس کے سامنے پا پیادہ آئیں۔ اور اس کے ہاتھ چومیں۔ برقہ کے والی کو بھی یہ حکم پہنچا جو اسے گراں گزرا۔ اس نے ایک لاکھ دینار دے کر اس سے بچنا چاہا لیکن نہ بچ سکا۔

جوہر نے جب خلیفہ کی دست بوسی کی اور گھوڑے پر بیٹھ گیا تو اسے اذنِ رخصت ملا۔ جب وہ قصر پر پہنچا تھا تو معز نے اپنا سارا لباس سوا انگشتری کے اسے عطا فرمایا۔

۱۴ ربیع الثانی ۳۵۸ھ (فروری ۹۶۹ء) کو جوہر قیروان[7] سے اپنا لشکر گراں لے کر باہر نکلا۔ اس کے ساتھ اونٹوں پر لدے ہوئے ایک ہزار دو سو صندوق تھے جو مال و زر سے بھرے ہوئے تھے۔ سپاہ کی تعداد ایک لاکھ سے متجاوز تھی۔[8] ابن زولاق[9] کی روایت کے مطابق ابوجعفر مسلم علوی سے جب جوہر کے لشکر کی تعداد پوچھی گئی تو اس نے کہا:

"ایسا ہی مجمع کثرت اور تعداد کے لحاظ سے تھا جیسا میدان عرفات میں ہوتا ہے۔"

جوہر منزلیں طے کرتا ہوا برقہ پہنچا۔ پھر وہ اسکندریہ وارد ہوا۔ وہاں کے دروازے بغیر کسی مقاومت کے کھول دیے گئے۔ اسکندریہ میں فاتحانہ شان سے داخل

ہوتے وقت اس نے اپنے لشکر کو سختی کے ساتھ منع کر دیا کہ اہل شہر کو ذرا بھی نہ ستایا جائے۔[۱۰]

یہ کیفیت چوتھے فاطمی خلیفہ المعز ۳۴۱ھ — ۳۶۵ھ (۹۵۲ء — ۹۷۵ء) تک رہی۔ اس نے مصر پر چڑھائی کی لیکن کافور اخشیدی نے حملہ روک لیا اور حائل ہو گیا۔

لیکن معز کا عزم قائم رہا۔ اس کی کامیابی کا ایک سبب یہ بھی تھا۔ کہ خوارج کی شورش ختم ہو چکی تھی اور مغرب میں امن وامان قائم ہو چکا تھا۔ اس کے برعکس مصر میں کافور کی وفات کے بعد شورش اور بدامنی اور ہنگامہ آرائی عام ہو گئی تھی۔ خلافت عباسیہ کمزور تھی اور بزنطینیوں کو اپنی سرزمین سے نکالنے کی جدوجہد کر رہی تھی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مصر میں فاطمی دعوت کے اثر سے لوگوں کی ایک بڑی تعداد جو شیعہ ہو گئی تھی معز کو تقاضے کر کر کے حملہ کی دعوت دے رہی تھی۔[۱۱]

یعقوب بن کلس نے معز کو حملۂ مصر پر آمادہ کرنے میں بڑا حصہ لیا۔[۱۲]

حواشی ومآخذ

۱۔ الکندی: ص ۲۸۵ نیز یحییٰ بن سعید: ص ۱۳۲

۲۔ اسکندریہ سے قریب ایک مقام۔

۳۔ اتعاظ الحنفا: ص ۶۹/۷۰

۴۔ قیروان بلاد مغرب کا بہت بڑا شہر ہے۔ شہر رقادہ سے اس کی مسافت چار میل ہے اپنی مساجد، باغات، اور خوبی وکثرت عمارات کے اعتبار سے یکتا مانا جاتا ہے (البکری: کتاب المغرب فی ذکر بلاد افریقیہ والمغرب، ص ۲۲-۲۷

۵۔ ابن خلکان، ج ۱، ص ۱۱۹ نیز G. Migeon: Art Mussulman, V. 1. P. 41

۶۔ المقریزی: اتعاظ الحنفا، ص ۷۱

۷۔ یحییٰ بن سعید: ص ۱۳۲

۸۔ ابن خلکان، ج ۱، ص ۱۱۹۔ نیز المقریزی: الخطط، ج ۱، ص ۳۷۸

۹۔ المقریزی: اتعاظ الحنفا، ص ۶۰، ۶۱

۱۰۔ جوہر الصقلی

۱۱۔ یعقوب ایک نو مسلم یہودی تھا جو ۳۳۴ھ میں مصر آیا۔ اور کافور کے دامن اقتدار سے وابستہ ہو گیا۔ اور ترقی کی منزلیں طے کرتا اور مناصب عالیہ پر فائز ہوتا رہا۔ شعبان ۳۵۶ھ میں اسلام قبول کر لیا۔ اب اور زیادہ کافور کی نظر میں چڑھ گیا۔ وزیر جعفر بن الفرات جلنے لگا۔ اس نے کافور کی وفات کے بعد اسے قید کر لیا۔ پھر بعد میں رجالات دولت کی مداخلت سے رہا کیا لیکن اس کی ساری دولت لے لی۔ لیکن خطرہ ابن کلس کے سر پر بہر حال موجود تھا۔ آخر چپکے سے بلاد مغرب پہنچ گیا اور معز کے پاس پناہ گزین ہوا۔ اس نے معز کے ضعف احوال پر اسے متوجہ کیا۔ اور حملے کی ترغیب دی۔ پھر ۳۶۲ھ میں معز کے ساتھ مصر واپس آیا۔

جوہر کا اماں نامہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

یہ امیر المومنین المعز لدین اللہ (صلوات اللہ علیہ) کے غلام جوہر کاتب کی طرف سے اماں نامہ ہے تمام اہلِ مصر کے لیے خواہ وہ مصری ہوں یا باہر کے۔ تم نے جن لوگوں کو اپنا ترجمان بنا کر میرے پاس بھیجا ہے وہ پہنچ گئے۔ وہ لوگ یہ ہیں:

ابوجعفر مسلم الشریف (اطال اللہ بقاءہ)، ابو اسماعیل الرسی (ایدہ اللہ) ابو الطیب الہاشمی (ایدہ اللہ)، ابوجعفر احمد بن نصر (اعزہ اللہ)، قاضی (اعزہ اللہ)۔ ان سب نے تم سبھوں کی طرف سے یہ بتایا کہ تم ایک ایسا اماں نامہ چاہتے ہو جس میں تمھارے جان و مال، شہر اور تمام متعلقات کے محفوظ رہنے کی ضمانت ہو۔ میں نے انھیں بتا دیا ہے کہ مولانا و سیدنا امیر المومنین (صلوات اللہ علیہ) پہلے ہی سے ان باتوں کا حکم دے چکے ہیں اور وہ تم سب پر نظرِ کرم رکھتے ہیں۔ لہٰذا اللہ تعالےٰ نے تم پر جو انعام کیا ہے اس پر اس کی حمد کرو۔ تمھاری جو حمایت کی ہے اس پر شکر ادا کرو۔ تم پر جو باتیں ضروری ہیں ان کی تکمیل میں کوشاں رہو۔ اور امیر المومنین کی اُس اطاعت میں عجلت سے کام لو جو تمھاری محافظ ہے۔

اور تمھاری خوش بختی و سلامتی کی ضامن ہے۔ امیر المومنین (صلوات اللہ علیہ) نے فاتح و منصور فوجوں کو صرف اس لیے نکال باہر کیا ہے کہ تمھارا اعزاز قائم رہے تمھاری حمایت ہوتی رہے اور تمھاری طرف سے دفاعی جنگ کرتے رہیں۔ کیونکہ تمھیں اچک لینے کے لیے ہاتھ آگے بڑھ چکے تھے اور ذلیل کرنے والا (فرمانروا) تمھیں ختم کر رہا تھا اور اپنے ذاتی فائدے کے لیے اسی سال تمھارے شہر پر اپنا اقتدار و غلبہ قائم کر کے لوگوں کو قید کرتا رہا اور تمھاری نعمتوں اور اموال پر اسی طرح قبضہ کرتا رہا جس طرح دوسرے مشرقی علاقوں کے لوگ کرتے رہے۔ اس کا ارادہ (اور زیادہ مضبوط ہو گیا) اور اس کی دیوانگی اور بڑھ گئی۔ چنانچہ مولانا و سیدنا امیر المومنین (صلوات اللہ علیہ) نے اس کا تدارک کرنے کے لیے ان فاتح و منصور فوجوں کو نکال باہر کیا اور تمھاری خاطر انھیں فنا کرنے کے لیے پکے امیر المومنین کا یہ جہاد تمھارے لیے بھی ہے اور مشرقی شہروں کے ان تمام مسلمانوں کے لیے بھی جن پر رسوائی و ذلت چھا گئی تھی، مصیبتیں امڈ آئی تھیں، نکبتیں مسلسل طاری تھیں۔ خوف دامنگیر تھا۔ فریادیں اور نالہ و شیون بلند ہو رہے تھے۔ اس فریاد پر صرف اس ہستی نے لبیک کہا جسے ان لوگوں کی حالت زار نے بے چین کر دیا اور جسے ان کی مصیبتوں نے رلایا اور جگایا۔ یہ ہستی مولانا و سیدنا امیر المومنین (صلوات اللہ علیہ) کی ہے۔

آخر اللہ کے فضل و کرم سے اس (امیر المومنین) کو یہ امید ہوئی کہ یہ مظلومین جو دائمی ذلت اور مسلسل عذاب میں مبتلا تھے بچ جائیں گے اور جس پر مایوسی چھا گئی ہے اسے امن نصیب ہو گا اور جو مسلسل خوف و ہراس میں مبتلا ہے اس کا خوف دور ہو جائے گا۔ پھر انھوں (امیر المومنین) نے وہ حج قائم کیا جو معطل ہو چکا تھا کیونکہ لوگوں نے اس حاکم کے ڈر سے اپنے حقوق و فرائض ترک کر دیے تھے۔ اس وقت لوگوں کی جان محفوظ تھی نہ مال۔ اس وقت ان پر بار بار حملے ہوتے تھے جس میں خون بھی بہائے جاتے تھے اور مال بھی چھینے جاتے تھے اور ان (امیر المومنین)

کی اس وقت بھی یہ عادت تھی کہ راستوں کو پُرامن رکھنے میں کوشاں رہتے اور راستوں پر لغو حرکتوں کو بھی روکتے تاکہ لوگ امن و اطمینان کے ساتھ چلیں پھریں، اور اپنی روزی حاصل کریں۔ اس وقت امیر المومنین (صلوات اللہ علیہ) کو اطلاع ملی کہ راستے بند ہیں، اور گزرنے والے خوف زدہ کیونکہ ظالموں، فسادیوں کا کوئی ہاتھ پکڑنے والا نہیں۔ پھر اس (امیر المومنین) نے یہ بھی کیا کہ سکّے کو نئے سرے سے بنوایا اور اسے بابرکت سکۂ منصوریہ کے معیار پر لائے اور ملاوٹ کو بند کرادیا۔ یہی وہ تین خصلتیں ہیں کہ جو شخص مسلمانوں کے معاملات سے دلچسپی رکھتا ہوا سے ان تین اصلاحات سے مفر نہیں۔ بلکہ ان ضروری باتوں کے لیے اسے اپنی پوری قوت صرف کرنی پڑے گی۔ اور ان احکام کی تعمیل سے بھی مفر نہیں جن کی طرف مولانا وسیدنا امیر المومنین (صلوات اللہ علیہ) کے غلام (جوہر کاتب) نے اشارہ کیا ہے یعنی عدل کا قیام، حق کی اشاعت، ظلم و عدوان کا قلع قمع، رنج و غم کو دور کرنا، راہ حق پر قائم رہتے ہوئے شفقت اور عمدگی کے ساتھ مظلوم کی مدد، لطف نگاہ، شرافت، خوش باشی، خبر گیری، اہل ملک کی رات دن حفاظت خصوصاً اس وقت جب کہ وہ تلاش معاش میں سرگرداں ہوں۔ ان تمام باتوں کی ذمّے داری اس پر ہے جو پراگندہ عوام کی شیرازہ بندی کرے، ان کے ٹیڑھ کو سیدھا کرے، ان کی حالت درست کرے، دلوں کو سمیٹ لے، اور ان سب کو اپنے آقا یعنی امیر المومنین کے احکام کی اطاعت پر متفق کرے جو انھوں نے اپنے اس غلام کو دیے ہیں۔ وہ احکام یہ ہیں کہ جن ظالمانہ ٹیکسوں کو امیر المومنین تم پر باقی رکھنا مناسب نہیں سمجھتے ان کو میں ختم کردوں۔ کتاب اللہ اور سنت نبوی کے مطابق تم میں قانونِ میراث جاری کردوں، اور اس مال کو بھی ساقط کردوں جو وصیت کے بغیر ہی مرنے والوں کے ترکے میں سے بیت المال کے لیے لیا جاتا ہے حالانکہ اس کو بیت المال میں آنے کا کوئی حق ہی نہیں۔ نیز تمھاری مسجدوں کی مرمت، ان کے فرش اور روشنی کی طرف توجہ دوں اور موذنوں، اماموں

اور خادموں کے باذ اغنت روزینے جاری رکھوں اور اسے بند نہ کروں ، اور یہ صرف بیت المال سے دوں نہ کہ محصّل کے سپرد کر دوں۔ یہ ہیں وہ باتیں جن کا مولانا و سیدنا امیر المومنین (صلوات اللہ علیہ) نے اپنے خط میں ذکر کیا ہے اور جن کی تمھارے ترجمانوں کو (ایدہم اللہ و اصحابہ اجمعین بطاعت امیر المومنین) ضمانت دی ہے۔ تم نے اس کے علاوہ بھی کچھ باتوں کا ذکر کرتے ہوئے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ تمھارے امان نامے میں ان کا بھی ذکر کر دیا جائے۔ اس سلسلے میں نے تمھاری خواہش کے مطابق تمھاری تسکین کے لیے ان کا ذکر کر دیا ہے ورنہ نہ تو ان کے ذکر کی ضرورت تھی اور نہ اس کا ڈھنڈورا پیٹنے سے کوئی فائدہ ہے اس لیے کہ اسلام ایک مخصوص طریقہ اور قابل پیروی قانون ہے اور وہ یہ ہے کہ تمھارے مذہب پر تمھیں قائم رہنے دیا جائے اور تمھیں اسی طریقے پر چھوڑ دیا جائے جس پر تم تھے۔ اسی طرح اپنی عام مسجدوں اور جامع مسجدوں میں علمی و اجتماعی فرائض ادا کرتے رہو اور اس طریقہ پر قائم رہو جس پر اسلاف امت یعنی صحابہ (رضی اللہ عنہم) تابعین اور وہ فقہائے امصار قائم تھے جن کے مذہب اور فتوے کے مطابق احکام جاری ہوتے تھے۔ نیز اذان، نماز، روزۂ رمضان، فطرہ، قیام لیل (تراویح و تہجد) زکوٰۃ، حج اور جہاد اسی طرح جاری رہیں جس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں بیان کیے ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ نے اپنی سنت میں نص فرمائی ہے اور ذمیوں کے لیے سابق صورت کو جاری رکھا۔ اور تمھارے لیے اللہ کی مکمل، وسیع اور دوامی امان میرے ذمے ہے جو ہر روز تازہ اور پختہ رہے گی۔ یہ امان تمھارے جان، مال، خاندان، مویشی، جائداد، مکان، قلیل و کثیر سب کے لیے ہے۔ تم پر کوئی معترض نہیں ہوگا، اور نہ کسی ناکردہ گناہ کو جرم قرار دیا جائے گا نہ کسی بے گناہ کی گرفت کی جائے گی بلکہ تمھاری حفاظت و صیانت کی جائے گی اور تمھاری طرف سے مکمل دفاع کیا جائے گا۔ تمھیں کوئی ایذا نہ پہنچائے گا اور تم پر کوئی زیادتی نہیں کرے گا۔ کوئی قوی پر بھی ظلم و تم

نہ کر سکے گا چہ جائیکہ کسی ضعیف پر۔ نیز میں تمھاری عام بھلائی اور نفع کی کوشش
میں لگا رہوں گا۔ تمھیں بھلائی ہی حاصل ہو گی اور تمھیں اس کی خیر و برکت
محسوس ہو گی۔ اور تم سب امیر المومنین (صلوات اللہ علیہ) کی اطاعت میں خیر و
برکت کے ساتھ خوش حال رہو گے۔ میں نے تمھاری جو خیر خواہی اپنے اوپر
لازم کر لی ہے اسے پورا کرنا میرا ذمہ ہے کیونکہ میں نے تمھیں اللہ کے پختہ
عہد و ذمہ کے علاوہ انبیاء و مرسلین و ائمہ اور آقایان امرائے مومنین (قدس
اللہ ارواحہم) نیز مولانا امیر المومنین المعز لدین اللہ (صلوات اللہ علیہ) کا بھی
ذمہ دیا ہے۔ لہٰذا اس کی طرف رجوع ہونے کا اعلان و اشاعت کرتے ہوئے
میری طرف آؤ۔ مجھ پر سلامتی بھیجو اور تم اس وقت تک میری نگرانی میں رہو جب
تک میں پل صراط کو عبور کر کے مبارک ٹھکانے میں نہ پہنچ جاؤں۔ تم حفاظت
میں رہو اور طاعت کی محافظت بھی کرتے رہو اور اس کے لیے قتال کرتے
رہو۔ اس کے فرائض کی طرف لپکتے رہو۔ مولانا و سیدنا امیر المومنین
(صلوات اللہ علیہ) کے مقرر کردہ کسی والی کو یا ان کے کسی ولی کو، چھوڑ نہ
دو اور میں نے جن باتوں کا حکم دیا ہے ان سے چمٹے رہو۔ اللہ تعالیٰ تم سب
کو توفیق و ہدایت دے!

ماخذ

۱- تاریخ جوہر الصقلی، قائد المعز لدین اللہ الفاطمی (حسن علی ابراہیم)، مطبع حجازی
مصر، ۱۹۳۳ء، ص ۴۰، ۴۱، ۴۲

فتح بلادِ عرب کا مقدّمہ

افریقہ میں فاطمیوں کے قوت بازو بنو کتامہ تھے۔ یوں تو دوسرے بربری قبائل نے بھی انھیں سر آنکھوں پر بٹھایا، لیکن بنو کتامہ کی فدویت، عقیدت اور جاں نثاری کا عالم ہی دوسرا تھا۔ فاطمیوں نے بھی ان کی حوصلہ افزائی، اور ان کے ساتھ حسن سلوک میں کوئی کمی نہیں کی۔

لیکن مغرب اقصیٰ کی سرحد سے باہر نکلنے اور مصر پہنچنے کے بعد فاطمی ایک ایسی ناقابل تسخیر قوت بن گئے، جس کا مقابلہ وقت کے ملوک و سلاطین کے لیے مشکل ہو گیا۔ یہ ایسا قافلۂ سبک سیر و زمین گیر تھا جس کے زور میں بڑی بڑی قوتیں اور حکومتیں خس و خاشاک کی طرح بہہ گئیں۔

مغرب اقصیٰ میں فاطمی خلفشار

ایک فاطمی اہل قلم کا بیان ہے:

"بنو فاطمہ نے جب یہ دیکھا کہ مشرق میں ان کو کامیابی کی امید بھی

نہیں ہے تو انھوں نے بلادِ مغرب کی طرف توجہ کی۔ یہ ملک دارالخلافہ بغداد سے دور تھا۔ سب سے پہلی فاطمی دولت جو مغربِ اقصیٰ میں قائم ہوئی وہ[۲] دولتِ دارسہ ہے۔ یہ حکومت تقریباً ڈیڑھ سو سال قائم رہی مگر اتنی ترقی نہ کر سکی کہ اس کو شمار اہم ترین دولتوں میں ہو سکتا۔ البتہ جو دولت ایک طویل مدت[۳] تک باقی رہی وہ تاریخ میں "دولتِ فاطمیہ" کے نام سے مشہور ہے جس کے پہلے خلیفہ کا ظہور رقادہ (مغرب) میں[۳] ہوا۔ اس کی ابتدا ایک فرقے سے ہوئی جو "اسمٰعیلیہ" کہلاتا ہے۔ لیکن اس فرقے نے ترقی کرتے کرتے سیاست کے میدان میں قدم رکھا، اور مغرب، مصر اور شام فتح کر لیے۔ اس کے ساتھ کا دوسرا فرقہ اثنا عشریہ فرقے ہی کی حالت میں رہا۔ اس نے کبھی اسمٰعیلیہ کی طرح سیاسی شکل اختیار نہیں کی۔ ۱۸۳ھ میں اس فرقے کے ساتویں امام حضرت موسیٰ کاظم کے انتقال کے بعد ان کے امام علی رضا ہوئے۔ پھر چار امام گذرے بارھویں امام حضرت محمد منتظر ہیں[۴] جو قیامت کے دن ظاہر ہوں گے[۵]۔

اب آئندہ صفحات میں فاطمیوں کے عہد فتوحات و کشور کشائی پر ایک نظر ڈالی جائے گی۔

مصادر و حواشی

۱۔ ابن خلدون، ج ۶، ص ۱۸، ۱۹۷

۲۔ ۱۶۹ھ

۳۔ ۲۹۶ھ

۴۔ شہرستانی، ص ۸۰

۵۔ تاریخ فاطمئین مصر، ص ۹۴

فتوحاتِ بلادِ حجاز

جب تک خلافتِ اسلامیہ کا مرکز جزیرۃ العرب رہا اس کی سیاسی وحدت قائم رہی۔ لیکن جب مرکزِ خلافت مدینۂ منوّرہ سے کوفہ، پھر امویوں کے عہد میں دمشق، پھر عباسیوں کے زمانے میں بغداد منتقل ہوا تو یہ وحدت پارہ پارہ ہوگئی، اور جزیرۂ عرب ولایاتِ متفرقہ میں تقسیم ہوگیا۔ یعنی:

: بلادِ حجاز
: بلادِ بحرین، یمامہ، اور عمان
: اور بلادِ یمن

دولتِ امویہ کی سیاست غیر عرب کے مقابلہ میں عربی عصبیت پر قائم تھی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایسا انقلاب رونما ہوا جس نے سطوت عرب ختم کر دی اور فارسی نفوذ و اثر کو نمایاں کر دیا۔ دولت عباسیہ کے قیام و انصرام میں یہ اثر غالب تر رہا۔ یہاں تک کہ معتصم تختِ خلافت پر متمکن ہوا۔ یہ اہل فارس سے بدگمان تھا اس نے ایک ایسے نئے "عنصر" کی تلاش کی جو سیاست بازی میں نہ عربوں کا ہم عناں ہو، نہ اہل فارس کا۔ چنانچہ اس نے ترکوں کو آگے بڑھایا اور انھیں

مرکز سیاست وحرب بنالیا۔ ولایاتِ اسلامیہ میں اپنے عمّال کے نام فرامین صادر کیے کہ قیادت جیوش (سپہ سالاری افواج) کے دفاتر سے عربوں کے نام خارج کر دیے جائیں۔

تیسری صدی ہجری کے اواخر میں ترکوں کی شورشوں اور بغاوتوں میں عباسیوں کو بہت زیادہ الجھ جانا پڑا۔ اس موقعہ سے فائدہ اٹھا کر بعض علویوں نے جو بنی سلیمان بن داؤد بن الحسن بن الحسن ابن علی بن ابی طالب میں سے تھے۔ نفوذ و سلطان حاصل کرنے کی جدوجہد کی۔ اور امارت مکہ پر قابض ہو گئے۔"(۱)

امارت مکہ پر قابض اور متصرف ہونے کے فوراً بعد ان لوگوں نے دولتِ سلیمانیہ کی بنیاد ڈالی۔ ان کے امیر نے عباسیوں کی اطاعت سے انحراف کا اعلان کر دیا، اور خود اپنے لیے امامت کا لفظ استعمال کرنا شروع کر دیا۔ یہ واقعہ ۳۰۱ھ کا ہے۔ جب خلیفہ مقتدر باللہ تخت خلافت پر متمکن تھا۔"(۱) حج کے موقعہ پر علوی امیر نے اپنے خطبہ میں کہا:

"تمام تعریفیں اس خدا کے لیے ہیں جس نے حق کو اپنے نظام کی طرف لوٹا دیا، اور ایمان کے شگوفوں کو کلیوں سے نمودار کر دیا۔ اور دعوت خیر الرسل ؐ کی تکمیل اس کے اسباط نہ کہ بنی اعمام کے ذریعہ فرمائی۔ صلے اللہ علیہ وعلےٰ آلہ الطاہرین۔"(۲)

مکہ میں دولتِ بنی سلیمان نے ابھی اتنا استحکام و اقتدار نہیں حاصل کیا تھا کہ وہ حاجیوں کی حفاظت کر سکتی، اور حملہ آوروں کی تاخت و تاراج سے انہیں محفوظ رکھ سکتی۔ کہ ۳۱۷ھ میں قرامطہ نے اس کا خاتمہ کر دیا، اور بلاد بحرین پر قبضہ کر لیا اور عبید اللہ المہدی فاطمی خلیفہ کے نام کا خطبہ بلادِ مغرب میں شروع کر دیا۔

۳۲۰ھ میں عباسی نفوذ پھر قائم ہو گیا اور خلیفہ راضی بن مقتدر کے نام کا خطبہ جاری ہو گیا۔"(۲) بلکہ اس خلیفہ نے مکہ اور مدینہ کی ولایت محمد بن طغج

اخشید والی مصر کو عطا کر دی۔ اب مکّہ اور مدینہ کے منبروں پر عباسی خلیفہ کے ساتھ اخشید کا نام بھی لیا جانے لگا۔[۵]

مکّہ پر عباسیوں کی سیادت اخشیدیوں کی ولایت کے بعد پھر قائم ہو گئی۔ لیکن ۳۳۴ھ میں جب بنو بویہ کا بغداد پر استیلا ہو گیا، اب وہ بھی اس سیادت میں شریک ہو گئے، اور مکّہ میں خلیفہ مطیع عباسی کے ساتھ معز الدولہ بن بویہ کا نام بھی خطبہ میں لیا جانے لگا۔

پھر بویہیوں نے کوشش کی کہ بلادِ حجاز سے اخشیدیوں کا عمل دخل بالکل ختم ہو جائے۔ چنانچہ ۳۴۲ھ میں مصری امیر الحج اور عراقی امیر الحج کے مابین خطبہ پر جھگڑا ہوا کہ ابن بویہ کا نام لیا جائے یا ابن اخشید کا؟ اس جھگڑے نے جنگ کی صورت اختیار کر لی، مصری ہار گئے اور معز الدولہ بن بویہ کے نام کا خطبہ جاری ہو گیا۔

مدینہ میں بنی حسین بن علی بن ابی طالب کے بعض افراد مقیم تھے اور اس تاک میں تھے کہ جس طرح بنو سلیمان نے مکّہ کی ولایت پر قبضہ کر لیا تھا، یہ مدینہ کی ولایت پر قبضہ کر لیں، لیکن اتنی قوت نہ تھی کہ اس ارادے کو عملی جامہ پہنا سکتے۔

لیکن جب مصر سے طاہر بن مسلم[۶] تشریف لائے جو امام حسین کے احفاد میں تھے تو ان لوگوں نے انھیں اپنا امیر بنا لیا، اور ۳۶۰ھ تک امامت کرتے رہے۔[۷] عباسی حکومت اپنے ضعف کے باعث کوئی مزاحمت نہ کر سکی۔

لیکن ان حالات کے باوجود مکّہ اور مدینہ پر عباسیوں کی سیادت قائم تھی، اور اس سیادت میں ان کا کوئی حریف مقابل نہیں تھا۔ لیکن جب فاطمیوں نے افریقہ میں اپنی خلافت قائم کر لی اور توسیع مملکت کی پالیسی پر

عمل پیرا ہو کر مصر و شام پر قابض ہو گئے اور مصر کو انھوں نے اپنا مستقر خلافت بنا لیا تو ان کی نظریں حجاز مقدس پر جا کر گڑ گئیں کہ یہاں تسلّط اور غلبہ حاصل کیے بغیر عالمِ اسلام پر دھاک نہیں بٹھائی جا سکتی تھی۔ عباسیوں نے بھی آسانی سے ہار نہیں مانی۔ اس نزاع کا بنیادی سبب ایک یہ نظریہ تھا کہ حقیقی "امیرالمومنین" وہی ہے جو حرمین (مکّہ و مدینہ) پر قابض ہو۔

عباسیوں اور فاطمیوں کی اس کش مکش میں مالِ غنیمت کا حصّہ ایک تیسرے فریق کو ملا۔ یعنی بنی حسن کے امرا و اشراف مکّہ کی تولیت پر منتقل ہو گئے، اور بنی حسین کے امرا و اشراف مدینہ کی تولیت پر منتقل ہو گئے۔ اس طرح حرمین کی سیادت ان کے ہاتھ آ گئی۔(۸)

خلیفہ المعز لدین اللہ فاطمی کے زمانہ میں حرمین کی طرف توجہ اور بڑھ گئی۔ ۳۴۸ھ میں جب بنی حسن اور بنی جعفر بن ابی طالب کے درمیان نزاع پیدا ہوئی تو معز نے پوشیدہ طور پر مال و زر، اور اصحاب فہم و فکر بھیج کر کوشش کی کہ دونوں میں صلح ہو جائے۔ آخر یہ کوشش کامیاب ہوئی اور مسجد حرام میں دونوں کے مابین پیمانِ دوستی بندھ گیا۔ معز کے ایلچی نے اس موقعہ پر بنی حسن کے مقتولین کی دیت ادا کر دی۔ اس کا بڑا گہرا اثر پڑا۔ چنانچہ ۳۵۸ھ میں جب مصر کو جوہر صقلی نے فتح کیا تو حسن بن جعفر امیر مکّہ نے مکّہ کے منبروں پر خلیفہ معز کے لیے دعائے درازیٔ عمر و ترقی اقبال مانگی۔ معز کو یہ اطلاع ملی تو اس نے حرم اور وہاں کے عمال کو اس کی ماتحتی میں دے دیا۔(۹)

اس طرح مدینہ منوّرہ میں بھی خلیفہ معز کے نام کا خطبہ جاری ہو گیا۔ اور خلیفہ عباسی کا نام مدینہ اور مکّہ کے خطبات سے ساقط ہو گیا۔(۱۰) معز ان دونوں شہروں میں بے دریغ روپیہ صرف کرتا رہتا تھا۔ چنانچہ ۳۵۹ھ میں اس نے بے اندازہ مال وہاں بھیجا(۱۱) جس سے بلادحجاز میں نشرِ دعوتِ فاطمی میں بڑی سہولت پیدا ہو گئی۔

۳۶۵ھ میں معز کا انتقال ہوگیا اور اس کا بیٹا عزیز مسند آرائے خلافت ہوا۔ لیکن بلادِ حجاز میں اس کا خطبہ جاری نہ رہ سکا۔ چنانچہ اس نے ۳۶۷ھ میں ادریس بن زہری المنہاجی کو امیر حج بنا کر بھیجا۔ اس نے حرمین پر قبضہ کر لیا اور عزیز کے نام کا خطبہ جاری کر دیا۔[۱۲]

۳۸۰ھ میں عزیز کا غلبہ اتنا بڑھا کہ مکہ اور مدینہ سے دعوت عباسیہ کا سلسلہ بالکل منقطع ہوگیا۔[۱۳]

بنی حسین کے پہلے امیر مدینہ طاہر بن مسلم کا ۳۸۱ھ میں انتقال ہوگیا۔ ان کا جانشین ان کا بیٹا حسن بن طاہر ملقب بہ مہنی ہوا۔[۱۴] یہ بھی باپ کے نقشِ قدم پر چلتا رہا اور مدینہ پر سیادت فاطمیئین کا پرچم لہراتا رہا۔ مکہ کی امارت بنی حسن میں سے عیسٰی بن جعفر کے ہاتھ میں تھی۔ اس کا انتقال بھی ۳۸۴ھ میں ہوگیا۔ اس کا جانشین اس کا بھائی ابوالفتوح حسن بن جعفر ہوا۔ اس نے بھی سابقہ نہج قائم رکھا۔ غرض دونوں مقامات پر فاطمیوں کا خطبہ پڑھا جانے لگا۔

ابوالفتوح خلیفہ حاکم بامر اللہ فاطمی کی عقیدت اور ولاء کا دم برابر بھرتا رہا۔ لیکن ۴۰۰ھ میں حاکم کے ایک معتوب اور مفرور وزیر ابوالقاسم حسین بن علی بن المغربی کے ورغلانے سے خود مدعی خلافت بن بیٹھا۔[۱۵] اور بلادِ شام تک کے اکثر مقامات پر اس کا خطبہ جاری ہوگیا۔[۱۶] لیکن خلیفہ حاکم بامر اللہ نے اپنی داد و دہش اور حسن تدبیر سے اسے زک دی، اور ابوالفتوح ایسا زچ ہوا کہ ۴۰۳ھ میں پھر معذرت کناں باحال پریشاں وارد مکہ ہوا۔ آخر کافی سعی و کوشش اور شفاعت و سفارش کے بعد حاکم نے اس کی خطا معاف کی اور اسے پھر امارت مکہ پر بحال کر دیا۔

اس کے بعد ابوالفتوح نہایت وفاداری سے نشر دعوت فاطمی میں مشغول رہا۔ اور بلادِ مقدس میں ان کی سیادت قائم رکھی۔ چنانچہ جب

حاکم کا انتقال ہوا تو اس کے بیٹے ظاہر کا خطبہ اس نے جاری کر دیا۔ اور اس کے بعد ۴۲۷ھ میں مستنصر کا۔ ابوالفتوح کا انتقال ۴۳۰ھ میں ہوا۔ وہ زندگی کی آخری سانس تک اپنے مسلک ولا پر قائم رہا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا شکر مسندِ امارت پر فائز ہوا۔ وہ بھی اپنی وفات تک یعنی ۴۵۳ھ تک مستنصر کی طرف دعوت میں مصروف رہا۔[۱۷]

شکر بن ابی الفتوح لاولد تھا۔ اس کے بعد مکہ میں بنی سلیمان کا نفوذ زائل ہو گیا، اور امارت ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں آئی جو بیت امارت میں نہیں تھا۔ یعنی رئیس ہواشم (بنو ہاشم)، محمد بن ابی جعفر۔ ۴۵۴ھ میں بنی سلیمان نے اس سے جنگ کی لیکن ہار گئے۔ محمد نے انھیں حجاز بدر کر دیا۔ یہ لوگ یمن چلے گئے اور امارت مکہ محمد کے ہاتھ میں آ گئی۔ اس نے بھی مستنصر باللہ فاطمی کا خطبہ جاری رکھا۔[۱۸]

لیکن یہ امیر محمد بن جعفر عجیب و غریب خصائص کا آدمی تھا۔ کچھ ہی دنوں بعد اس نے خلیفہ قائم بامر اللہ عباسی کا خطبہ شروع کر دیا۔[۱۹] خلیفہ مستنصر فاطمی کو جب یہ خبر ملی تو اس نے اپنے یمن کے داعی علی بن محمد الصلیحی کو حملہ کرنے کا حکم دیا۔[۲۰] صلیحی نے استمالت، حسن تدبیر، اور داد و دہش سے اہل مکہ کو مطیع کر لیا۔[۲۱] لیکن مصر میں جب قحط اور وبا کے باعث حالات دگرگوں ہوئے اور محمد بن جعفر کو مالی امداد فاطمی خلیفہ کی طرف سے نہ پہنچ سکی تو وہ کعبہ کی قندیلیں، پردے، باب کعبہ کی چوکھٹ، پرنالے وغیرہ تک کام میں لے آیا۔ اور خلیفہ قائم عباسی کا خطبہ پھر شروع کر دیا۔[۲۲] اور سلطان الپ ارسلان سلجوقی حاکم بغداد کے پاس ۴۶۲ھ میں اپنا قاصد بھیج کر اطلاع دی کہ اس نے قائم کا خطبہ جاری کر دیا ہے، اور اذان سے "حی علی خیر العمل" کے الفاظ نکال دیے ہیں۔ سلطان نے اسے تیس ہزار دینار بھیجے اور خلعت مرصع سے

۳۶۵ھ میں معز کا انتقال ہوگیا اور اس کا بیٹا عزیز مسند آرائے خلافت ہوا۔ لیکن بلادِ حجاز میں اس کا خطبہ جاری نہ رہ سکا۔ چنانچہ اس نے ۳۶۷ھ میں ادریس بن زہری المنہاجی کو امیر حج بنا کر بھیجا۔ اس نے حرمین پر قبضہ کر لیا اور عزیز کے نام کا خطبہ جاری کر دیا۔[13]

۳۸۰ھ میں عزیز کا غلبہ اتنا بڑھا کہ مکہ اور مدینہ سے دعوت عباسیہ کا سلسلہ بالکل منقطع ہوگیا۔[13]

بنی حسین کے پہلے امیر مدینہ طاہر بن مسلم کا ۳۸۱ھ میں انتقال ہوگیا۔ ان کا جانشین ان کا بیٹا حسن بن طاہر ملقب بہ مہنی ہوا۔[14] یہ بھی باپ کے نقشِ قدم پر چلتا رہا اور مدینہ پر سیادت فاطمیین کا پرچم لہراتا رہا۔ مکہ کی امارت بنی حسن میں سے عیسےٰ بن جعفر کے ہاتھ میں تھی۔ اس کا انتقال بھی ۳۸۴ھ میں ہوگیا۔ اس کا جانشین اس کا بھائی ابوالفتوح حسن بن جعفر ہوا۔ اس نے بھی سابقہ نہج قائم رکھا۔ غرض دونوں مقامات پر فاطمیوں کا خطبہ پڑھا جانے لگا۔

ابوالفتوح خلیفہ حاکم بامر اللہ فاطمی کی عقیدت اور ولاء کا دم برابر بھرتا رہا۔ لیکن ۴۰۰ھ میں حاکم کے ایک معتوب اور مفرور وزیر ابوالقاسم حسین بن علی بن المغربی کے ورغلانے سے خود مدعی خلافت بن بیٹھا۔[15] اور بلادِ شام تک کے اکثر مقامات پر اس کا خطبہ جاری ہوگیا۔[16] لیکن خلیفہ حاکم بامر اللہ نے اپنی داد و دہش اور حسن تدبیر سے اسے زک دی، اور ابوالفتوح ایسا زچ ہوا کہ ۴۰۳ھ میں پھر معذرت کناں باحال پریشاں وارد مکہ ہوا۔ آخرکار سعی و کوشش اور شفاعت و سفارش کے بعد حاکم نے اس کی خطا معاف کی اور اسے پھر امارت مکہ پر بحال کر دیا۔

اس کے بعد ابوالفتوح نہایت وفاداری سے نشر دعوت فاطمی میں مشغول رہا۔ اور بلادِ مقدس میں ان کی سیادت قائم رکھی۔ چنانچہ جب

حاکم کا انتقال ہوا تو اس کے بیٹے ظاہر کا خطبہ اس نے جاری کر دیا۔ اور اس کے بعد ۴۲۷ھ میں مستنصر کا۔ ابوالفتوح کا انتقال ۴۳۰ھ میں ہوا۔ وہ زندگی کی آخری سانس تک اپنے مسلک ولا پر قائم رہا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا شکر مسند امارت پر فائز ہوا۔ وہ بھی اپنی وفات تک یعنی ۴۵۳ھ تک مستنصر کی طرف دعوت میں مصروف رہا۔[۱۷]

شکر بن ابی الفتوح لاولد تھا۔ اس کے بعد مکہ میں بنی سلیمان کا نفوذ زائل ہوگیا، اور امارت ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں آئی جو بہت امارت میں نہیں تھا۔ یعنی رئیس ہوا ہاشم (بنو ہاشم) محمد بن ابی جعفر۔ ۴۵۴ھ میں بنی سلیمان نے اس سے جنگ کی لیکن ہار گئے۔ محمد نے انھیں حجاز بدر کر دیا۔ یہ لوگ یمن چلے گئے اور امارت مکہ محمد کے ہاتھ میں آگئی۔ اس نے بھی مستنصر باللہ فاطمی کا خطبہ جاری رکھا۔[۱۸]

لیکن یہ امیر محمد بن جعفر عجیب و غریب خصائص کا آدمی تھا۔ کچھ ہی دنوں بعد اس نے خلیفہ قائم بامر اللہ عباسی کا خطبہ شروع کر دیا۔[۱۹] خلیفہ مستنصر فاطمی کو جب یہ خبر ملی تو اس نے اپنے یمن کے داعی علی بن محمد الصلیحی کو حملہ کرنے کا حکم دیا۔[۲۰] صلیحی نے استمالت، حسن تدبیر، اور داد و دہش سے اہل مکہ کو مطیع کر لیا۔[۲۱] لیکن مصر میں جب قحط اور وبا کے باعث حالات دگرگوں ہوئے اور محمد بن جعفر کو مالی امداد فاطمی خلیفہ کی طرف سے نہ پہنچ سکی تو وہ کعبہ کی قندیلیں، پردے، باب کعبہ کی چوکھٹ، پرنالے وغیرہ تک کام میں لے آیا۔ اور خلیفہ قائم عباسی کا خطبہ پھر شروع کر دیا۔[۲۲] اور سلطان الپ ارسلان سلجوقی حاکم بغداد کے پاس ۴۶۲ھ میں اپنا قاصد بھیج کر اطلاع دی کہ اس نے قائم کا خطبہ جاری کر دیا ہے، اور اذان سے "حیی علی خیر العمل" کے الفاظ نکال دیے ہیں۔ سلطان نے اسے تیس ہزار دینار بھیجے اور خلعت مرصع سے

سرفراز کیا، اور دس ہزار دینار سالانہ کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ اور کہا:

"اگر امیر مدینہ مھنی بھی ایسا کرے تو اسے بیس ہزار دینار یک مشت دوں گا۔ اور پانچ ہزار دینار سالانہ کا وظیفہ مقرر کر دوں گا۔"(۲۳)

امیر محمد بن جعفر نے جب یہ دیکھا کہ خلیفہ فاطمی مصر کے معاملات میں الجھا ہوا ہے، اور خلیفہ عباسی کی طرف سے کوئی اندیشہ نہیں ہے، تو اس نے ایک لشکر ترکوں کا تیار کیا، اور مدینہ پر حملہ کر دیا۔ بنو حسین اس فوری حملہ کا مقابلہ نہ کر سکے، شکست یاب ہوئے۔ انھیں مدینہ سے نکال دیا اور حرمین کی امارت کا مالک بن گیا۔(۲۴)

۴۶۷ھ میں خلیفہ قائم عباسی کا انتقال ہو گیا، اور وہ مالی امداد جو ہر سال ملا کرتی تھی بند ہو گئی، تو امیر محمد بن جعفر نے خطبہ سے عباسیوں کا نام نکال دیا۔ اور خلیفہ مستنصر باللہ فاطمی کا نام داخل کر دیا۔(۲۵) لیکن جب خلیفہ المقتدی بامر اللہ عباسی نے رقم از سر نو جاری کر دی تو امیر محمد نے پھر فاطمی خلیفہ کا نام خطبہ سے خارج کر دیا اور عباسی خلیفہ کا جاری کر دیا۔ یہ سلسلہ مقتدی کی وفات یعنی ۴۸۷ھ تک جاری رہا۔(۲۶) یہ اتنا بد نفس شخص تھا کہ اسے کبھی دولت فاطمیہ کی طرف سے کبھی دولت عباسیہ کی طرف سے رقم خطیر ملتی رہتی تھی۔ لیکن اس کے عہد حکومت میں حجاج کو امن تک حاصل نہ تھا۔(۲۷) ابو المحاسن نے اس کے بارے میں بڑی صحیح بات لکھی ہے:

"یہ شخص بے حد متلون مزاج تھا۔ کبھی عباسیوں کے ساتھ ہو جاتا، کبھی فاطمیوں کے۔"(۲۸)

۴۸۷ھ میں محمد بن جعفر کا انتقال ہو گیا۔ اس کا بیٹا قاسم امیر بنا، اور باپ کے نقش قدم پر چلا۔ اس نے بھی عباسیوں کا خطبہ جاری کیا۔ خلیفہ مستظہر عباسی اور اس کے بیٹے مسترشد عباسی نے اسے مال خطیر اور خلعت فاخرہ سے نوازا۔(۲۹)

۵۱۸ھ میں قاسم کے عہدِ پُرفتن کا خاتمہ ہوا، اور اس کا بیٹا ہاشم امیر بنا۔ اس نے اپنی امارت کا آغاز خلیفہ مسترشد عباسی کے خطبہ سے کیا۔ عدل کو اپنا شعار بنایا۔ نظمِ مملکت کی طرف متوجہ ہوا۔ لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس کے گُن گانے لگے۔ ۵۲۷ھ میں اس کا بھی انتقال ہوگیا۔ اب امارت اس کے بھائی ہاشم کے ہاتھ آئی۔ اس نے خلیفہ حافظ فاطمی کا خطبہ شروع کردیا۔

۵۴۹ھ میں امارت ہاشم کے بیٹے قاسم کے ہاتھ آئی۔ اس نے خلیفہ مستنجد باللہ عباسی کا خطبہ جاری کردیا۔ ساتھ ہی ساتھ دولتِ فاطمیہ سے بھی سازباز شروع کردی۔ چنانچہ ۵۵۰ھ میں اس نے عمارہ یمنی کو اپنا ایلچی بناکر قاہرہ بھیجا۔

اس زمانے میں فاطمی خلیفہ فائز تھا، اور اس کا وزیر طلائع بن زریک عمارہ نے خط پیش کیا اور خلیفہ اور وزیر کی مدح میں جو قصیدہ کہا تھا وہ سنایا۔ خلیفہ اور وزیر کی طرف سے لطف وقبول کا اظہار ہوا۔"[۳۱]

۵۵۱ھ میں عمارہ واپس آیا۔ لیکن قاسم نے پھر اسے اپنا سفیر بناکر قاہرہ روانہ کیا۔ کیونکہ اس کی فوج نے حجاج مصر و شام کے ساتھ زیادتی کی تھی، اور ان کا مال ومنال لوٹ لیا تھا۔ عمارہ دوسری مرتبہ پھر امیر حرمین کا قاصد بن کر قاہرہ آیا۔ لیکن اس مرتبہ مصر کو اس نے اپنا وطن بنالیا"[۳۲] اور دولتِ فاطمیہ کے ممتاز اور مایۂ ناز شعراء میں، فائز کے عہد میں بھی، اور عاضد کے عہد میں بھی"[۳۳] اس کا شمار ہونے لگا۔

خلیفہ فاطمی فائز اور اس کے وزیر ابن زریک کی حکومت میں امیر حرمین کی ان دونوں سفارتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ دولتِ فاطمیہ کی رضاجوئی کا متمنی تھا۔ لیکن فاطمی نفوذ، عباسی نفوذ پر غالب نہ آسکا، اور حرمین میں خلیفہ مستنجد باللہ عباسی کا خطبہ پڑھا جاتا رہا۔

قاسم بن ہاشم کا ۵۵۶ھ میں انتقال ہوگیا۔ اس کا جانشین عیسے بن فلیتہ ہوا۔ لیکن اس کے عہد میں دولتِ فاطمیہ ہی ختم ہو گئی۔(۳۳)

دولت فاطمیہ کا عہد زوال ہو، یا عصر انقراض ہر حالت میں حجاز مقدس کے اندر ان کی دعوت جاری رہی، اور اجلال و احترام کی نظر سے دیکھی جاتی رہی۔ دراصل یہ کارنامہ شیعہ تحریک کا ہے جس کی نشر و تبلیغ میں فاطمی دعاۃ برابر مصروف رہے۔(۳۴)

اور ولاۃ مکہ و مدینہ جو مختلف اوقات میں دعوت بنی عباس کے تابع رہے عظمت و عقیدت کی نگاہ سے فاطمی خلفاء ہی کو دیکھتے رہے اور یہ تاثیر تھی اس دعوتِ تشیعیت کی جو فاطمی دعاۃ برابر جاری رکھے ہوئے تھے۔

فاطمی خلفا سے اہل حرمین کی عقیدت و محبت کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ انھوں نے اپنے اقتدار کے وقت میں ہمیشہ وہاں کا امن و امان بحال رکھا اور لوگوں کی جان و مال کی حفاظت کی۔ معیشت کے وسائل کو آسان بنایا۔ غلّہ، اناج اور مال و زر کی کھیپ کی کھیپ بھیجتے رہے۔ اب ان حالات میں ہمیں تعجب نہیں ہوتا جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ خلفائے فاطمیین کی اقامت خطبہ پر ان لوگوں نے بھی اعتراض نہیں کیا جو سنی مذہب رکھتے تھے۔ نیز ان کے امراء نے مکہ اور مدینہ میں مذہب شیعی کے وہ کثیر مظاہر بھی باقی اور جاری رکھے جو عصر فاطمی میں مصر کے اندر رائج تھے حالانکہ عباسی خلفا ان کی استمالت اور انھیں دولتِ فاطمیہ سے منحرف کرنے کے لیے بے دریغ روپیہ صرف کرتے رہے تھے۔(۳۵)

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عباسیوں سے مخالفت کے باوجود فاطمی خلفا کو عالم اسلام کا جو احترام حاصل تھا اس کا سبب یہ تھا کہ انھوں نے سرزمین مقدس حجاز کو ہر طرح کے خطرات سے پاک رکھنے کی پوری سعی کی۔ انھوں نے

قرامطہ کو رد کیا، حجاج کے قافلوں کو قتل و غارت سے محفوظ رکھا، اور لوگوں کی سلامتی جان و مال پر پوری توجہ مبذول کی۔(۳۶)

مصر کے مؤرخین اور اہل قلم کی یہ خصوصیت نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ وہ اپنے افکار و خیالات میں رو رعایت کے قائل نہیں ہیں۔ تحقیق و مطالعہ کے بعد جس نتیجہ پر پہنچتے ہیں اس کا اظہار بے تامل کر دیتے ہیں۔

مصر کے سرکاری کتب خانوں میں مخطوطات کا جو بیش بہا خزانہ ہے مصری مصنفین اس سے بھی پورا استفادہ کرتے ہیں اور غیر ممالک کے کتب خانوں میں متعلقہ موضوع پر جو کتابیں دستیاب ہوسکتی ہیں ان کا بھی ایک ایک حرف پڑھتے ہیں، اور یہ سارا مواد سامنے رکھنے کے بعد کوئی رائے قائم کرتے ہیں۔

حجاز مقدس میں بنو فاطمہ کی محبوبیت اور مرجعیت و مقبولیت کے بارے میں ڈاکٹر جمال الدین نے ـــــ جن کی تحریر کا اقتباس ہم نے اوپر پیش کیا ہے ـــــ جو کچھ لکھا ہے وہ ان کی بے تعصبی اور جذبۂ تحقیق کا آئینہ دار ہے۔

مصادر و حواشی

۱ - ابن خلدون: العبر و دیوان المبتداء و الخبر، ج ۴؛ ص ۱۱

۲ - القلقشندی: صبح الاعشیٰ فی صناعۃ الانشاء ج ۴؛ ص ۲۷۲، ۲۷۸

۳ - ابن خلدون: ج ۴؛ ص ۹۹

۴ - ابن خلدون: ج ۴؛ ص ۱۰۰

۵ - ابن خلکان: وفیات الاعیان: ج ۲؛ ص ۵۲، ج ۲، ۵

ابو المحاسن: النجوم الزاہرہ فی ملوک مصر و القاہرہ ج ۴؛ ص ۲۲

۶- ان کا پورا نام ہے:
محمد بن عبداللہ بن طاہر بن یحییٰ المحدث بن الحسن بن جعفر بن عبیداللہ بن ع
بن الحسین بن علی بن الحسین ابن علی بن ابی طالب۔
(ابن حزم: جمہرۃ انساب العرب، ص ۹۴)

۷- ابن خلدون، ج ۴، ص ۱۲

۸- : الحضارۃ الاسلامیہ فی القرن الرابع الہجری، ج ۲، ص ۵، ۶

۹- المقریزی: اتعاظ الحنفاء، ص ۱۴۵، ۱۴۶

۱۰- عبدالقادر الانصاری: درر الفرائد المنظمہ، ص ۲۰۲

۱۱- اتعاظ الحنفاء، ص ۱۷۲

۱۲- ابن خلدون، ج ۴، ص ۱۰۱

۱۳- ابن خلدون، ج ۴، ص ۱۰۱

نیز عبدالقادر الانصاری: درر الفرائد المنظمہ، ص ۲۰۳

۱۴- ابن خلدون، ج ۴، ص ۱۰۹

۱۵- المقریزی: الخطط، ج ۲، ص ۱۵۷

۱۶- عبدالقادر الانصاری: درر الفرائد المنظمہ، ج ۱، ص ۲۰۷، ۲۰۸

۱۷- : خلاصۃ الکلام فی امراء البیت الحرام، ص ۱۸

۱۸- ابن خلدون، ج ۴، ص ۱۲۲

۱۹- القلقشندی: صبح الاعشیٰ، ج ۴، ص ۲۷۰

۲۰- ابن خلدون، ج ۴، ص ۲۱۵

۲۱- Bulletin School of Oriental Studies. Letters of Al-Mustansir Billah part VII, 1934, p. 324.

۲۲- ابن الجوزی، مرأۃ الزمان فی تاریخ الاعیان، القسم الثانی، المجلد الاول، ورق

٢٣ - ابن الاثیر، ج ١٠، ص ٢١

ابو المحاسن، ج ٥، ص ٤٨

٢٤ - القلقشندی: ج ٤، ص ٧٨٠

٢٥ - ابو المحاسن: النجوم الزاہرہ، ج ٥، ص ٩٨

٢٦ - القلقشندی: صبح الاعشی، ج ٤، ص ٢٨٠

٢٧ - النجوم الزاہرہ، ج ٥، ص ١٤٠

٢٨ - ابن خلدون، ج ٤، ص ٢٠٥

٢٩ - ابن الاثیر، ج ١٠، ص ١٤٠

٣٠ - ابن خلکان: وفیات الاعیان، ج ١، ص ٤٥٥، ٤٧٦

٣١ - عمارہ الیمنی: النکت العصریہ فی اخبار الوزراء المصریہ، ص ١٣١٠٣١٠٣٢٠٣٤ -

٣٢ - حسن ابراہیم: الفاطمیون فی مصر، ص ١٤٣

٣٣ - القلقشندی: صبح الاعشی، ج ٤، ص ٢٨١

٣٤ - Stanely Lane-poole, A History of Egypt in The Middle Ages, pp. 117, 118, 123.

٣٥ - النفوذ الفاطمی فی جزیرۃ العرب

(الدکتور جمال الدین، معلّم التاریخ الاسلامی بکلیۃ الادب بجامعۃ الفواد الاول (١٩٥٠م)، ص ٢٧

٣٦ - النفوذ الفاطمی فی جزیرۃ العرب، ص ٢٨

بحرین: فاطمی سیادت میں

انقلاب و تغیر، بیعت اور نقضِ بیعت کی داستان

حجرِ اسود اور قرامطہ

○

جزیرۂ عرب میں قرامطہ عباسیوں کے نفوذ کی راہ میں ہمیشہ ایک خطرہ بنے رہے کیونکہ بلادِ بحرین میں ابو سعید الحسن ابن بہرام الجنابی نے ۲۸۳ھ ہی سے یہاں فاطمی دعوت کی نشر و تبلیغ کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ اس کی تعلیمات اس اقلیم کے باشندوں کے دلوں میں گھر کر گئیں۔ خاص طور پر اعراب اس سے بہت متاثر ہوئے جو شورش اور ہنگامہ آرائی کی ہر معرکے میں شرکت کے لئے بے چین رہتے تھے تاکہ انہیں اس بہانے قتل و غارت اور سلب و نہب کے مواقع میسر آئیں۔

ابو سعید جنابی نے شہر "ہجر" کو جو بلادِ بحرین کا دارالحکومت تھا، دو سال کے محاصرے کے بعد فتح کر لیا اور شہر احساء کو نئی دولتِ قرامطہ کا دارالحکومت بنایا جس کی تاسیس اس نے ۲۸۶ھ میں کی تھی۔

جزیرۂ عرب میں یہ حکومت اپنی شان اور آن بان کے لحاظ سے یکتا تھی اس نے اگرچہ حکومت کو اپنے خاندان میں موروثی بنا لیا تھا لیکن ایک

مجلس شاورت کی تشکیل کی جو بارہ ارکان پر مشتمل تھی۔ سربراہ مملکت کی حیثیت فوج کے سپریم کمانڈر انچیف کی تھی۔ اس کے ہاتھ میں تمام امور کی باگ تھی۔ اسے مطلق العنان اختیارات حاصل تھے۔ غلاموں کے ذمے زمین کا جوتنا اور بونا تھا۔ عربوں سے فوجی خدمت کے سوا کوئی کام نہیں لیا جاتا تھا۔

ابوسعید نے بہت زبردست نظام حربی استوار کیا تھا۔ اس نے نوجوانوں کی ضروریات زندگی کا بندوبست کر کے انہیں فنون جنگ، گھوڑ سواری، اور اسلحہ کے استعمال کا ہنر سیکھنے کا بڑا معقول بندوبست کیا تھا۔ اس طرح حربی ماحول میں ان کی نشوونما کا انتظام کر کے انہیں یکسر مرد رزم آرا بنا دیا تھا۔

ابوسعید کا یہ اقتدار اور دبدبہ دیکھ کر عباسی خلیفہ معتضد نے عباس بن عمر الغنوی کی زیر سرکردگی ایک لشکر اس کی سرکوبی کے لئے بھیجا۔ اور اسے یمامہ اور بحرین کی گورنری بھی عطا کر دی۔ یہ واقعہ ۲۸۹ھ کا ہے۔ لیکن اس لشکر کو شکست فاش ہوئی اور عباس گرفتار ہو گیا۔ ابوسعید نے اس شرط پر اسے رہائی بخشی کہ وہ معتضد تک اس کا خط پہنچا دے۔ اس خط میں اس نے لکھا تھا۔

"اس علاقہ پر کبھی تمہارا قبضہ نہیں تھا۔ میں نے اسے فتح کیا۔ اور یہاں کا حکمران بن گیا۔ اس سے زیادہ کی مجھے ضرورت نہیں جو کچھ تمہارے قبضہ میں تھا وہ میں نے نہیں لیا نہ ایسا ارادہ ہے نہ تمہارے راستہ میں دشواریاں پیدا کیں۔ نہ تمہاری رعیت کے کسی فرد کو ضرر پہنچایا۔ پھر تم نے اپنا لشکر میرے خلاف کیوں بھیجا؟ تمہیں معلوم ہونا چاہیئے نہ میں اس اقلیم سے نکالا جا سکتا ہوں نہ تم یہاں پہنچ سکتے ہو۔ پس بہتر یہ ہے کہ اس چیز کا لالچ نہ کرو جس سے تمہیں کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔"

معتضد نے یہ خط پڑھ کر کہا۔

"سچ تو کہتا ہے۔ واقعی اس نے ہمارے قبضے سے کوئی چیز نہیں چھینی"
اس کے بعد وہ کچھ دیر سر جھکائے سوچتا رہا اور گویا ہوا۔
"خدا کا یہ کافر دشمن جھوٹا ہے۔ تمام مسلمان میری رعیت ہیں۔ خواہ بلاد اللہ میں سے کہیں کیوں نہ ہوں۔ خدا کی قسم اگر میری عمر نے وفا کی تو میں اس کی سرکوبی کے لئے ایک زبردست لشکر بھیجوں گا"

خلیفہ معتضد کی اس بات سے واضح ہوتا ہے کہ وہ حقیقت حال سے واقف تھا اور جانتا تھا کہ بحرین وغیرہ کے علاقے اس کی سیادت سے آزاد تھے لیکن وہ جمیع بلاد اسلامیہ پر اپنا نفوذ قائم کرنے پر تلا ہوا تھا۔ چنانچہ جب وہ بستر علالت پر دراز تھا اس وقت بھی اس سے غافل نہیں تھا اس نے ایک مرتبہ کہا۔

"میری آرزو ہے کہ مرنے سے پہلے بحرین پر قبضہ کر لوں۔ خدا کی قسم میں نے اپنے دل میں اٹل فیصلہ کر لیا ہے کہ گھوڑے پر سوار ہو کر سیدھا بحرین کی طرف چل پڑوں اور جو شخص بھی قد میں میری تلوار سے بڑا نظر آئے اس کی گردن اڑا دوں۔"

بہر حال ابو سعید ایک مستحکم حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا جس کا نفوذ ہجر، احساء، قطیف، جملہ بلاد بحرین اور طائف تک حاوی تھا

اگر اس کی عمر وفا کرتی تو اس کا دائرۂ حکومت پورے عرب تک پھیل جاتا۔ لیکن ۳۰۲ھ میں اپنے ایک خادم کے ہاتھوں اسے جام مرگ پینا پڑا۔ جسے اس نے عباسی لشکر میں سے گرفتار کیا تھا۔ اب اس کی مسند پر اس کا بیٹا سعید متمکن ہوا۔ لیکن ابھی پورے طور پر معاملات مملکت سنبھال نہیں پایا تھا کہ چھوٹے بھائی ابو طاہر سلیمان نے بغاوت کر دی۔ اسے قتل کر دیا اور دولت قرامطہ کی زمام حکومت اس کے ہاتھ میں آ گئی۔ بعد ازں

عبید اللہ المہدی نے بھی ایک فرمان کے ذریعہ اس کی حکومت تسلیم کر لی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بلادِ مغرب کی خلافت فاطمیہ سے بحرین کے قرامطہ محبت اور ہمدردی رکھتے تھے۔ اب قرامطہ اور فاطمیین کی سیاستیں یکجا تھیں اور عباسیوں کی مخالفت میں اتحاد پیدا ہو گیا۔

ابو طاہر مجد و عظمت کی منزل کی طرف بڑھتا رہا۔ حکومت کے ابتدائی چند سال شؤون مملکت کے سدھارنے میں صرف ہوئے۔ اس اثناء میں جزیرۂ عرب پر قبضہ کرنے کی تیاریاں بھی کرتا رہا۔

عبید اللہ المہدی کو مدد پہنچانے کی ایک تدبیر اس نے یہ سوچی کہ عباسیوں کے مشرقی علاقہ میں یلغار کی جائے، اس نے بصرہ اور کوفہ پر بھی حملہ کیا۔ اور مال غنیمت سے لدا پھندا بحر واپس آیا۔

۳۱۶ھ میں ابو طاہر نے بغداد پر چڑھائی کی اور قریب تھا کہ بغداد اس کے ہاتھ آ جاتا لیکن خلیفہ مقتدر عباسی کے خادم خاص اور سالار لشکر مونس کے فریب نے یہ حملہ کامیاب نہ ہونے دیا۔ اس نے بہت سے زہریلے پھل ابو طاہر کے لشکر میں پہنچائے جنہیں کھا کر بہت سے لوگ ہلاک ہو گئے آخر ابو طاہر کا لشکر ناکام واپس آیا۔

لیکن اس ہزیمت نے اس کے عزم اور ولولے میں کوئی کمزوری نہیں پیدا کی۔ دوسرے سال اس کے بے پناہ حملہ سے سارا عالم اسلام دہل اٹھا۔ ذی الحجہ ۳۱۷ھ (جنوری ۹۳۰ء) میں اس نے مکہ پر حملہ کیا۔ اس کے ساتھ کوئی بڑا لشکر نہ تھا۔ سات سو سوار اور نو سو پیادے لے کر وہ بڑھا اور اس نے حاجیوں کا قتل عام مسجد حرام میں شروع کر دیا۔ اس نے بیت اللہ کا دروازہ، قبۂ زمزم اور حجر اسود تک اکھاڑ ڈالا۔ اس نے غلاف کعبہ بھی اتار لیا اور اپنے اصحاب میں تقسیم کر دیا۔ اہل مکہ کے

گھروں کو لوٹ لیا۔ اور عبید اللہ المہدی کے نام کا خطبہ مکہ میں شروع کر دیا اور خلیفہ مقتدر عباسی کا نام خطبہ سے نکال دیا اور حجرِ اسود لے کر اپنے دارالحکومت احساء واپس آیا۔[12]

ابو طاہر نے اس فعل شنیع کا ارتکاب ——— جیسا اولیری کا خیال ہے[13] ——— اس لئے نہیں کیا تھا کہ اسے قیروان (فاطمی ہیڈ کوارٹر) سے اس طرح کی ہدایت بصیغۂ راز موصول ہوئی تھی کہ یوں اہلِ مکہ سے اس بات کا انتقام لیا جائے کہ انہوں نے مہدی کے نام کا خطبہ نہیں جاری کیا۔

ہمارے اس دعوے کی دلیل یہ ہے کہ عبید اللہ المہدی نے اس حادثۂ فاجعہ کا ارتکاب سخت ناپسند کیا اور ابو طاہر کو لکھا:[14]

"مقامِ حیرت ہے کہ تو نے اتنا بڑا جرم ہمارے نام پر کیا۔ اور وہ بھی کہاں؟ اللہ کے حرم اور اس کے پڑوسیوں پر۔ یہ وہ مقام ہے جہاں عہدِ جاہلیت (قبل از اسلام) میں بھی خونریزی حرام رہی اور وہاں کے رہنے والوں کی اہانت نامحمود سمجھی جاتی رہی۔ تو نے اس اصول کو توڑا، حجرِ اسود تک کو اکھاڑ ڈالا۔ اسے اپنی سرزمین میں لے آیا اور اب اس کا متوقع ہے کہ ہم تیرا شکریہ ادا کریں۔ پس خدا کی لعنت تجھ پر، پھر خدا کی لعنت ہو تجھ پر، اور سلامتی ہو اس پر جس کے قول و فعل سے مسلمان محفوظ رہیں۔ اور جو کچھ آج کرے کل اس کا حساب دینے کو تیار رہتے۔"[15]

ابو طاہر نے معذرت کا ایک خط عبید اللہ المہدی کو لکھا اور اسے یقین دلایا کہ بہت جلد وہ حجرِ اسود کو بیت الحرام میں اس کی جگہ نصب کر دے گا۔[16]

ابوطاہر نے صرف مکے پر حملہ اور وہاں مہدی کی امامت ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ۳۲۳ ھ میں فاطمیوں کے دائرۂ فرماں روائی کو حجاز تک وسیع کر دیا[۵۳] کیونکہ خلافت عباسیہ بلادِ حجاز کے راستوں کی حفاظت کرنے سے اور اپنی رعایا کی حمایت سے قاصر تھی۔ اس واقعہ سے عباسیوں کی سطوت و شوکت کم ہوگئی اور فاطمیوں کے حامیوں کے لئے میدان ہموار ہوگیا۔ جیسا کہ ابوطاہر نے اپنے بعض قصائد مدحیہ میں جو اس نے مہدی کے لئے لکھے تھے خود بھی اظہار کیا ہے[۵۴]۔ مثلاً :-

انا الداع للمهدی لاشك غیره
انا الصادم الضرغام والفارس الذکر[۵۵]

---

۳۳۲ ھ میں ابوطاہر کا انتقال ہوگیا۔ اس نے اپنے بڑے بھائی احمد ہندسی کے لئے وصیت کی تھی کہ وہ اس کا جانشین بنے۔ لیکن بعض لوگوں نے سابور بن ابوطاہر کی طرف میلان کا اظہار کیا۔ آخر یہ مسئلہ فاطمی خلیفہ القائم کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ احمد حکمرانی کرے اور سابور اس کا ولی عہد ہو۔ چنانچہ احمد ابوالمنصور کے لقب سے مسندِ خلافت پر متمکن ہوگیا۔ یہ بھی اپنے بھائی کی طرح فاطمیوں کی محبت میں سرشار تھا۔ اس نے ۳۳۹ ھ میں خلیفہ منصور فاطمی کے حسبِ ہدایت حجرِ اسود کو احساء سے لے جاکر کعبہ میں اس کی جگہ نصب کردیا، حالانکہ عباسی حکومت پچاس ہزار طلائی دینار کی پیش کش کر رہی تھی۔ مگر ابوطاہر نے یہ پیش کش رد کردی[۵۶]۔ یہ واقعہ اس بات کا ثبوت ہے کہ بحرین کے قرامطہ خلفاءِ فاطمیین کے کس درجہ اطاعت گزار اور عقیدت کیش تھے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بحرین کی قرامطی حکومت نے عباسی حکومت کی دشواریوں میں بہت زیادہ اضافہ کردیا۔ ان کی شورشوں اور ہنگامہ آرائیوں سے بلادِ مغرب میں فاطمیوں نے فائدہ اٹھایا اور اپنا نظمِ مملکت استوار کرتے رہے

جب بھی عبداللہ مہدی نے مصر کی طرف پیش قدمی کی۔ قرامطۂ بحرین نے مشرق میں عباسیوں کو ایک نیا میدانِ جنگ قائم کرنے پر مجبور کر دیا۔

فاطمیین اور قرامطہ کا اتحاد۔ نشرِ مذہب اسماعیلی میں چوتھی صدی ہجری کے اندر بہت زیادہ ممد و معین ثابت ہوا، اور علویوں کا ستارہ چمک اُٹھا۔ کیونکہ عباسی حکومت ضعیف ہو چکی تھی اور فاطمیوں نے خلافتِ علویہ مصر، بلادِ شام اور جزیرۂ عرب کے اکثر علاقوں پر قائم کر لی تھی حالانکہ یہ سارے علاقے عباسیوں کے ماتحت تھے۔

چوتھی صدی ہجری کے نصف آخر میں بلادِ بحرین کی دولت قرامطہ باہمی نزاع میں اُلجھ گئی۔ ابوطاہر کے افرادِ خاندان نے تختِ حکومت پر قبضہ کرنا چاہا، ۳۵۸ھ میں سابور بن ابوطاہر نے اپنے چچا ابومنصور کو گرفتار کر لیا اور دولت قرامطہ کا سربراہ بن گیا۔ لیکن ابومنصور اس قید سے بچ نکلا۔ اس نے سابور کو قتل کر دیا۔ اس کے بھائیوں اور حامیوں کو جلاوطن کر کے جزیرۂ کروال[۲۱] بھیج دیا۔ ۳۵۹ھ میں ابومنصور کو زہر دے کر ہلاک کر دیا گیا۔ یہ سابور کے حامیوں کی حرکت تھی۔ اب ابومنصور کا بیٹا حسن بن احمد، اعظم لقب اختیار کر کے اس کا جانشین بنا[۲۲]

حسن بن احمد تختِ حکومت پر بیٹھتے ہی ضبطِ امورِ مملکت کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے ابن ابی طاہر کے بہت سے حامیوں کی جن کی تعداد تین سو سے زیادہ تھی جلاوطن کر کے جزیرۂ کروال بھیج دیا۔ پھر اطمینان سے اپنے نفوذ کی توسیع میں منہمک ہو گیا اور بلادِ شام پر غارت گری شروع کر دی[۲۳]

حسن بن احمد نے جو پالیسی اختیار کی وہ فاطمیوں کی مخالفت پر مبنی تھی اس نے خلیفہ عباسی سے مصالحت اختیار کر لی۔ جس نے اسے فاطمیوں سے جنگ کرتے ہوئے بیش قرار مدد مال و زر اور اسلحہ کی صورت میں دی۔ اس

نے بھی جوابی طور پر مکہ میں خلیفہ مطیع عباسی کا خطبہ جاری ہونے پر مزاحمت نہیں کی۔ جو اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ فاطمیوں سے منحرف ہو چکا تھا۔

حسن بن احمد کا یہ رنگ دیکھ کر خلیفہ المعز لدین اللہ فاطمی نے سابور کے اتباع کو شہ دینا شروع کی۔

احمد نے اس کا جواب اس طرح دیا کہ بلاد بحرین سے معز کا نام خطبہ سے خارج کر دیا اور مطیع عباسی کی اقامت دعوت میں مصروف ہو گیا۔ اس نے عباسیوں کا شعار یعنی سیاہ رنگ بھی اختیار کر لیا۔ ۳۶۰ھ میں اس کے لشکر اور جیش فاطمیین میں کئی معرکے ہوئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے دمشق پر قبضہ کر لیا[۲۵] اور مصر پر چڑھائی شروع کر دی۔ اور قاہرہ خطرہ میں پڑ گیا جس کے اردگرد جوہر صقلی نے ایک بہت بڑی خندق دفاعی نقطۂ نظر سے کھود رکھی تھی۔

لیکن جوہر کے عساکر قاہرہ کی تاب نہ لا سکا[۲۶]۔ اور اپنا لشکر لے کر ۳۶۲ھ میں احساء واپس آ گیا[۲۷]۔

اس شکست کے باوجود قرامطہ اور فاطمیین کے مابین نزاع و عداوت کا سلسلہ ختم نہیں ہوا۔ حسن قتال جدید کی تیاریاں کرنے لگا۔ المعز لدین اللہ فاطمی جب مغرب سے قاہرہ وارد ہوا تو رستے ہی میں اسے ایک خط لکھ کر یاد دلایا کہ اس کے اسلاف و آبا و اجداد فاطمیین کی محبت میں سرشار تھے اور قرامطہ کی دعوت فاطمیوں ہی کے لئے تھی[۲۸]۔ اپنے اس خط میں لکھا تھا۔

"کیا تو اپنے جد ابوسعید میں کوئی اسوہ اور ابوطاہر کے عمل میں کوئی نمونہ نہیں پاتا؟ کیا تو نے ان کے اخبار و کتب، اور اشعار و حمایات نہیں پڑھے؟ کیا تو نہیں جانتا وہ ہمارے غلام تھے اور عزم شدید، امور رشید اور فعل حمید ان کی سرشت تھی؟ ہمارے ہی نام کا ظہور تھا جس کے

باعث ان کا نام پھیلا۔ ان کی ہمت بلند ہوئی۔ ان کا عزم استوار ہوا۔ وفود آفاق ان کے پاس حاضر ہونے لگے۔ ان کی ہیبت سے دشمنوں کی روح لرزنے لگی۔ وہ بنو عباس کے دشمن جاں تھے۔ ان کے لشکر عباسیوں پر ترکتازیاں کرتے تھے، جو لشکر ان کے سامنے آیا شکست کھائی۔ جو سردار نمودار ہوا گرفتار ہوا۔ جو عسکر مقابل آیا پارہ پارہ ہوا کیونکہ ہماری نصرت ان کی ہمرکاب تھی!"

اپنے اس خطاب میں المعز نے عالم اسلام کے طول و عرض میں دعوت کے نشر و شیوع پر بھی روشنی ڈالی تھی۔

"ایں ہمہ دنیا کا کوئی جزیرہ اور اقلیم ایسی نہیں ہے جہاں ہمارے داعی موجود نہ ہوں۔ وہ لوگوں کو ہماری طرف دعوت دیتے ہیں۔ ہمارے راستے پر رہبری کی تلقین کرتے ہیں۔ ہمارے علم کو پھیلاتے ہیں، ہماری قوت سے ڈراتے ہیں۔ ہمارے ایام کی بشارت دیتے ہیں۔ اختلاف زبان و لغات کے باوجود یہ کام انجام پاتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالے فرماتا ہے (وما ارسلنا من رسول الا بلسان قومه لنبين لهم) اور قرآن حقائق سے بہت اچھی طرح واقف ہے، پھر اے عہد شکن بتا تیرا عزم و ارادہ کیا ہے؟ کیا کوئی ایسی بات ہے جس میں تجھے شک ہے؟ کوئی ایسا امر ہے جس کے بارے میں تو مبتلائے ریب ہے؟ کیا تو فہم و حکمت سے محروم ہے؟ کیا تو کلمۂ اسلام سے خارج ہے؟"

آخر میں المعز نے حسن بن احمد کو اگر اس نے اپنے تئیں حوالے نہ کر دیا انجام بد سے ڈراتے ہوئے لکھا ہے۔

"اگر تو اپنے ساتھیوں کے ساتھ حاضر ہو گیا تو تیرے اور تیرے رفقاء کے بارے میں جو فیصلہ کروں گا وہ تین امور میں سے ایک پر مبنی ہو گا یا قصاص، یا از روئے رحم بلا فدیہ رہائی یا فدیہ، اور اگر تو نے انکار

کیا تو پھر نہ کوئی آسمان تجھے سایہ دے گا، نہ کوئی زمین تجھے پناہ دیگی نہ کوئی رات تجھے چھپائے گی نہ کوئی دن تجھے محفوظ رکھے گا، نہ کوئی پرچم تجھے ڈھانپے گا نہ کوئی طاقت تیری مدد کر سکے گی"[۱]

المعز نے صرف اس خط پر اکتفا نہیں کیا بلکہ حسن کو معزول بھی کر دیا اور بنی ابی طاہر کا حق خدمت تسلیم کر لیا لیکن حسن اس سے متاثر نہیں ہوا۔ اس نے جواب دیا:

"آپ کا خط ملا، جس کا حاصل کم اور تفصیل لاطائل ہے۔ جواب میں ہم خود آپ کی طرف آ رہے ہیں"[۲]

پھر اس نے مصر پر ۳۶۳ھ (۹۷۴ء) میں حملہ کر دیا لیکن اس مرتبہ بھی اسے شکست ہوئی اور وہ اپنا لشکر لے کر بحرین واپس آگیا اور فاطمیوں نے بلادِ شام کا علاقہ اس سے چھین لیا۔

لیکن ۳۶۵ھ میں افتکین ترکی نے دمشق پر قبضہ کر لیا اور حسن کو یہ خوشخبری پہنچی۔ وہ احساء سے دوڑا دوڑا آیا اور یہاں اپنی قوت کے مستحکم کرنے میں لگ گیا لیکن جب خلیفہ عزیز باللہ فاطمی کو یہ حال معلوم ہوا اس نے قاہرہ سے ایک لشکر گراں افتکین اور قرامطہ کی سرکوبی کے لئے بھیجا، دونوں کو شکست ہوئی۔ اس کامیابی نے فاطمیوں کے قدم بلادِ شام میں جما دیئے اور قرامطہ پھر اپنے بلاد میں جلاوطن کر دیئے گئے۔

۳۶۶ھ میں حسن بن احمد کا انتقال ہو گیا تو بلادِ بحرین کے قرامطہ میں داخلی جھگڑوں نے پھر سر اٹھایا کیونکہ قرامطہ کی اکثریت فاطمیوں سے مخالفت اور عباسیوں سے نیابت کی پالیسی کو سخت ناپسند کرتی تھی۔ طے پایا کہ اب زمام حکومت دو سرداروں جعفر اور اسحاق کو سونپی جائے۔ ان دونوں نے پھر اس پالیسی کی تجدید کی جو حسن بن احمد کی تولیت سے قبل امراء قرامطہ کی تھی — یعنی اقامت

حسن بن احمد کی وفات کے بعد قرامطہ نے پھر عباسیوں پر تاخت و تاراج کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ۳۷۵ھ میں انہوں نے کوفہ پر زبردست حملہ کیا۔ حملہ اتنے زور شور کا تھا کہ ان کی دھاک بیٹھ گئی۔ پھر صمصام الدولہ سلطان بنی بویہ نے ایک لشکر قرامطہ کی سرکوبی کے لئے بھیجا جس نے انہیں نہر فرات کے ساحل پر شکست فاش دی اور قادسیہ تک ان کا تعاقب کیا۔[۳۳]

چوتھی صدی ہجری کے اواخر سے قرامطہ کی قوت میں ضعف اور اضمحلال شروع ہوا۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ جزیرہ عربیہ کے شرقی کنارے پر ایک چھوٹی سی ریاست رہ گئی۔ البتہ اب بصرہ پر اس کی ایک چوکی چنگی وصول کرنے کے لئے قائم تھی۔[۳۴]

ماخذ و حواشی

۱۔ النفوذ الفاطمیین فی بلاد العرب ص ۳۱

۱۔الف۔ القرامطہ

یہ ایک سیاسی جماعت تھی جو اسماعیل بن جعفر صادق کی امامت کی طرف لوگوں کو دعوت دیتی تھی۔ اس کے مخصوص اغراض و مقاصد تھے جن کے حصول کا وسیلہ اس نے اس دعوت کو بنا لیا تھا۔

اس تحریک کے داعیوں میں سے ایک شخص حمدان بن الاشعث کی طرف "قرامطہ" کی نسبت پہلے پہل کی گئی ہے۔ کہتے ہیں کہ اسے قرمطہ کہا اس لئے دیا گیا کہ اس کے پاؤں کوتاہ تھے اور پست قامت بھی تھا۔

(النویری: نہایۃ الارب فی فنون الادب ج ۲۳ ورق ۵۶)

لیکن Ivanow نے اپنی کتاب The Rise of the Fatimids p. 69)

...ں لکھا ہے کہ "کرامتہ" جنوبی عراق کے باشندوں میں ایک معروف لفظ تھا۔ اگرچہ عربی میں ...ستعمال نہیں ہوتا تھا، اس کے معنی ہیں فلاح (کسان) یا قروی (دیہاتی)، بعد میں یہ لفظ معرب ہو کر "قرمطہ" بن گیا۔

پہلے پہل یہ لفظ حمدان بن الاشعث کے لئے استعمال ہوا کیونکہ اس کے متبع اسی نام سے اسے یاد کرتے تھے۔

(عبدالعزیز الدوری: دراسات فی العصر العباسی الثانی ص ۱۵۸)

۲۔ الجنابی نسبت ہے جنابہ کی طرف جو ساحل خلیج فارس پر ایک شہر کا نام ہے۔

(یاقوت: معجم البلدان ج ۲ ص ۱۴۲—۱۴۳)

۳۔ O. Leary, A Short History of the Fatimid Khalifate.

Encyclopaedia of Religion and Ethics vol III P 225

۵۔ المقریزی: اتعاظ الحنفا ص ۲۱۶

۶۔ المقریزی: اتعاظ الحنفا ص ۲۱۸

۷۔ المقریزی: اتعاظ الحنفا ۲۱۹

۸۔ ابن الاثیر: الکامل فی التاریخ ج ۷ ص ۲۷

۹۔ حسن ابراہیم: الاسلام السیاسی ج ۳ ص ۳۳۹

۱۰۔ ابن الاثیر: ج ۷ ص ۴۵ — ۴۹

۱۱۔ المقریزی: اتعاظ الحنفا ص ۲۴۲

۱۲۔ ابن الاثیر: ج ۸ ص ۱۰

نیز عبدالقادر الانصاری: درر الفرائد المنظمہ ج ۱، ص ۱۹۵، ۱۹۶

A Short History of the Fatimid Khalifate page 86

۱۴ - عبدالقادر الانصاری: درر الفرائد المنظم ج ۱ ص ۱۹۶

۱۵ - ادیری نے اپنی کتاب A Short History of the Fatimid Khalifate P. 85 میں لکھا ہے کہ عبید اللہ مہدی نے یہ خطاب نام ابو طاہر کو اس لئے لکھا تھا کہ خود اس واقعہ کی مسئولیت سے اپنے آپ کو بچائے۔

۱۶ - ابن خلدون: ج ۴ ص ۸۹

۱۷ - المقریزی: اتعاظ الحنفاء ص ۲۴۴

۱۸ - حسن ابراہیم: الاسلام السیاسی ج ۲، ص ۲۳۹

۱۹ - ابوالمحاسن: النجوم الزاہرہ ج ۲ ص ۲۲۵، ۲۲۶

۲۰ - ابن خلدون: ج ۴ ص ۸۹، ۹۰

۲۱ - بلاد بحرین کا ایک جزیرہ

(یاقوت: معجم البلدان ج ۱ ص ۳۶۵)

۲۲ - ابن خلدون: ج ۴ ص ۹۰

۲۳ - ابن خلدون: ج ۴ ص ۹۰

۲۴ - المقریزی: اتعاظ الحنفاء ص ۱۸۰

۲۵ - ابن خلدون: ج ۴ ص ۹۰

۲۶ - Stanley Lane-Poole, A History of Egypt in the middle ages P. 10

۲۷ - المقریزی: اتعاظ الحنفاء ص ۲۵۰

۲۸ - ابن الاثیر: ج ۸ ص ۲۱۱

۲۹ - المقریزی: اتعاظ الحنفاء ص ۲۵۸ - ۲۶۵

۳۰ - ابن الاثیر: ج ۸ ص ۲۱۱

۳۱ - ابن الاثیر (ج ۸ ص ۲۲۸) نے لکھا ہے کہ حسن کی وفات کے بعد چھ آدمیوں پر مشتمل ایک مجلس کو اختیارات حکمرانی تفویض ہوئے۔

۳۲- ابن خلدون - ج ۴ ص ۹۱

۳۳- ابن الاثیر ج ۹ ص ۱۴-۱۵

۳۴- المقدسی: احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم ص ۳۳

نیز الحضارۃ الاسلامیہ فی القرآن الرابع الہجری ج ۲ ص ٦۵

۳۵- حجر اسود اکھاڑنے کا واقعہ قرامطہ کے ہاتھوں پیش ضرور آیا لیکن اس کے زمانے کی تعیین میں اختلاف ہے۔ اور قرین صواب رائے ان مورخین کی ہے جو کہتے ہیں یہ واقعہ ابو سعید کے زمانے میں نہیں پیش آیا۔

نفوذِ فاطمی یمامہ میں

○

ولایات جزیرۂ عرب میں یمامہؓ تیسری صدی ہجری کے نصف اول تک عباسیوں کا مطیع اور منقاد رہا، پھر مستعین باللہ عباسی کے زمانہ میں یہاں کی فرمانروائی محمد الاخیضر بن یوسف بن ابراہیم ابن موسی الجون بن عبداللہ بن الحسن بن الحسن بن علی بن ابی طالب کے ہاتھ میں آگئی۔ انہوں نے حضرمہ کو پایۂ تخت بنالیا۔ اس طرح یمامہ میں علوی حکومت قائم ہوگئی جو دولت بنی اخیضر کے نام سے مشہور ہے۔ چونکہ خلافت عباسیہ ضعف و انحلال کا شکار بنی ہوئی تھی۔ ترکوں کا اثر و نفوذ بڑھتا جارہا تھا اور خلفائے عباسیہ کے بجائے اصل قوت و طاقت کا سرچشمہ صرف وہ ہی رہ گئے تھے۔ لہٰذا یمامہ کی علوی حکومت کو پھیلنے پھولنے کے اور زیادہ مواقع مل گئے۔

اخیضر کے انتقال کے بعد، حکومت اس کے بیٹے یوسف کے ہاتھ میں آگئی۔ جب اس کا انتقال ہوا تو مسندِ حکومت پر اس کا بیٹا اسماعیل بیٹھا۔ چونکہ علوی حکومت قائم ہوچکی تھی۔ لہٰذا یمن کے اسماعیلی داعی منصور بن حسین بن حوشب اور علی بن حسین نے اپنے آورد ے دعوت و تبلیغ کے لئے بلاد سندھ سے یمامہ بھیجے۔ جیسے انہوں نے نشر مذہب اسماعیلی کے لئے بلاد سندھ

بلاد مصر، مغرب اور بحرین وغیرہ میں اپنے داعی بھیج رکھے تھے۔[۵]
بنو اخیضر یمامہ پر حکومت کرتے رہے۔ یہاں تک کہ بلاد بحرین کے قرامطہ نے جزیرۃ عرب پر تسلط حاصل کرنے کے لئے سرگرمیاں شروع کر دیں۔ چوتھی صدی ہجری کے اوائل میں انہوں نے یمامہ فتح کر لیا۔ مکہ اور عمان پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس طرح حکومت بنی اخیضر کا بالآخر یمامہ سے خاتمہ ہو گیا۔[۶]
جب تک بحرین میں قرامطہ روبہ زوال نہیں ہو گئے۔ یمامہ پر ان کا پرچم لہراتا رہا۔

ماخذ و حواشی

[۱] اس کی حد مشرق میں بلادِ بحرین سے اور مغرب میں اطرافِ یمن و حجاز سے اور جنوب میں نجران سے اور شمال میں نجد و حجاز سے ملتی ہے۔
(القلقشندی: صبح الاعشیٰ ج ۵ ص ۵۸)

[۲] ابن حزم الاندلسی: جمہرۃ انساب العرب ص ۴۱

[۳] مذہب اسماعیلی کی نسبت اسماعیل بن جعفر صادق کی طرف ہے۔ ان کے اتباع اسماعیلیہ کے نام سے مشہور ہیں۔

[۴] المقریزی: اتعاظ الحنفاء ص ۶۸

[۵] ابن خلدون: ج ۴ ص ۹۸-۹۹

عمّان پر فاطمیوں کا اقتدار

○

تیسری صدی ہجری کے اواخر میں عمّان دولتِ عباسیہ کا مطیع اور منقاد بن گیا، جب کہ خلیفہ معتضد عباسی کے عہد حکومت میں بنو شامہ بن لوئی بن غالب کی یہاں حکومت تھی۔ پھر محمد بن قاسم شامی نے خلیفہ معتضد کی اعانت سے اسے فتح کر لیا۔ معتضد نے اسے یہاں کا والی تسلیم کر لیا اور بنی عباس کا خطبہ رائج ہو گیا۔ یہ حکومت موروثی طور پہ ان کے خاندان میں قائم ہو گئی۔ پھر ۳۰۵ھ میں یہ خاندان ضعف واختلال سے دوچار ہوا، قرامطہ نے اس سے فائدہ اٹھایا۔ ۳۱۱ھ میں ابوطاہر قرمطی نے اس پر قبضہ کر لیا اور بلادِ مغرب میں فاطمی خلیفہ عبیداللہ المہدی کے نام کا خطبہ جاری کر دیا[۲۱]۔ اس طرح عمّان دولتِ قرامطہ میں شامل ہو گیا، اور اس کے والی وہیں سے نامزد ہونے لگے۔

عمان کی عنانِ حکومت جب یوسف بن وجیہ کے ہاتھ میں آئی تو اس نے بصرہ پر بحری حملہ کر دیا، یہ واقعہ خلیفہ متقی باللہ کے عہد کا ہے۔ لیکن یوسف اس حملہ میں کامیاب نہیں ہوا اور ۳۳۲ھ ناکام لوٹ گیا[۲۲]۔ اس شکست کے بعد وہ زیادہ عرصہ تک زندہ نہیں رہا۔ اس کے غلام نافع نے اس کے خلاف شورش کی اور زمامِ حکومت ہاتھ میں لے لی اور معز الدولہ بن بویہ کی اطاعت

اختیار کر لی، اس کے نام کا خطبہ جاری کر دیا اور اس کا نام دینار و دراہم پر مسکوک کرا دیا۔[۲]

عمان کے عدم استقرار امور سے قرامطہ نے فائدہ اٹھایا اور ۳۵۴ھ میں اس پر قبضہ کر لیا۔ نافع بھاگ گیا۔ لوگوں کی رائے سے عبدالوہاب بن المہدی مروان والی بنا۔ اور اس نے علی بن احمد کو کاتب بنا لیا۔ یہ زیادہ ہوشیار ثابت ہوا اس نے زنگیوں کو فریب کاری سے اپنے ساتھ ملا لیا اور ان کی مدد سے والی بن گیا اور عبدالوہاب کو معزول کر دیا۔

معزالدولہ بن بویہ کو یہ موقع غنیمت معلوم ہوا۔ ۳۵۵ھ میں وہ واسطے ایلہ آیا۔ اور یہاں سے اس نے عمان پر بحری حملہ کر دیا۔ لشکر کی قیادت ابوالفتوح محمد بن عباس کے سپرد کی اور عضدالدولہ سے مدد کی درخواست کی۔ اس نے سیراف میں سپاہیوں سے لدی ہوئی کشتیاں اس کے سپرد کر دیں، ابوالفتوح غالب آیا۔ عمان پر اس کی حکومت قائم ہو گئی اس نے معزالدولہ کا خطبہ جاری کر دیا۔[۳]

معزالدولہ کے انتقال کے بعد حالات نے پھر پلٹا کھایا۔ یہاں تک کہ ۳۶۲ھ میں ابوحرب یہاں کا حاکم ہو گیا جو عضدالدولہ کا آدمی تھا۔

پھر خوارج نے سر اٹھایا لیکن عضدالدولہ نے ان کی شورش دبا دی۔[۴]

عمان کے امراء میں بنو مکرم بہت سربرآوردہ تھے۔ بویہیوں کو ان سے کافی مدد ملی۔ بنی عباس کا خطبہ بھی انہی کی وجہ سے جاری ہو گیا۔ لیکن جب بغداد میں بنو بویہ مائل بہ زوال ہوئے تو بنو مکرم مستقل حکمران بن گئے۔ ان میں کا ایک فرد مؤیدالدولہ ابوالقاسم علی ابن ناصرالدولہ حسین بن مکرم ۴۱۸ھ میں والی بنا، اس نے اپنے حسن عمل، جود و کرم اور تدبیر و سیاست سے حکومت اپنے خاندان میں موروثی بنالی۔[۵]

۴۲۸ھ میں ابوالقاسم کا انتقال ہو گیا۔ اس کا جانشین اس کا بیٹا ابوالجیش

بنا۔ لیکن اس کے سالار لشکر علی بن ہطال نے غیر معمولی اثر و نفوذ حاصل کر لیا۔ کچھ عرصہ بعد ابوالجیش کا انتقال ہوا تو یہ خود والی بن گیا۔

یہ خبر جب سلطان بنی بویہ ابی کالیجار کو ملی، اس نے اپنے وزیر ابوالمنصور کو حکم دیا کہ مرتضےٰ کو جو ابوالقاسم بن مکرم کا نائب تھا ابن ہطال سے جنگ پر آمادہ کرے۔ مرتضیٰ تیار ہو گیا۔ اس نے ابن ہطال کو شکست دی، اور ابی منصور نے ابومحمد ابن مکرم کو ۴۳۱ھ میں عمان کی امارت سونپ دی[9]۔

لیکن بنی مکرم سے یہ بار سنبھل نہ سکا۔ آخر ابوالمنظفر بن ابی کالیجار بویہی عمان کا امیر بنا۔ لیکن یہ بھی عاجز اور درماندہ ثابت ہوا۔ یہاں عمان کے خوارج سے ٹکراتے، چونکہ عمان کے لوگ دیلم سے بیزار تھے لہذا ابن ارشد کو جنگ میں کامیابی ہوئی۔ ۴۴۲ھ میں اس نے ابوالمظفر پر مکمل غلبہ حاصل کر لیا اور زمام اپنے ہاتھ میں لے لی اور راشد باللہ کا لقب اختیار کر لیا[10]۔

لیکن خوارج کی کامیابی سے حکمرانی نہ کر سکے، ۴۴۸ھ میں عبدالملک نے عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اور خوارج کے لئے اطاعت کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا[11]۔ عباسی اور بنی بویہ پہلے ہی ضعف و انحلال کا شکار تھے۔ وہ اپنی سیادت قائم رکھنے کے لئے کچھ نہ کر سکے۔

مصر کی دولتِ فاطمیہ نہایت غور و فکر سے عمان کے اضطرابات کو دیکھ رہی تھی۔ وہ تیسری صدی ہجری کے اواخر ہی سے یہاں دعوت و تبلیغ شروع کر چکی تھی۔ جب خلیفہ مستنصر باللہ فاطمی کو عمان کے حالات کی اطلاع ملی اور معلوم ہوا کہ وہاں عباسی نفوذ دم توڑ رہا ہے اور عوام میں بے اطمینانی ہے تو اس نے المکرم احمد کو جو اپنے باپ کی وفات کے بعد والی بنا تھا ۴۶۹ھ میں لکھا کہ عمان میں اپنی سرگرمیوں کا آغاز کر دے[12]۔ پھر اواخر ۴۸۱ھ میں اس نے السیدۃ الحرہ کو جس کے تصرف میں بلادِ یمن کی حکومت تھی، لکھا کہ اے

احمد بن مرزبان کو ہندوستان میں اور اسماعیل بن ابراہیم کو عمان میں داعی بنا کر بھیجنے سے پورا اتفاق ہے بلکہ اسماعیل کے انتخاب پر اس نے سیّدہ کو مبارکباد دی تھی۔ اور سیدہ نے بلادِ یمن، ہند اور عمان میں نشرِ دعوت فاطمی کے سلسلے میں جو گراں بہا خدمات انجام دی تھیں ان پر خوشنودی کا اظہار کیا تھا۔[۱۳]

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خلافت فاطمیہ کو عمان میں اپنی دعوت کے پھیلانے سے کس درجہ غیر معمولی دلچسپی تھی۔ اور کوئی شبہ نہیں کہ اس دعوت کے پسِ پردہ جو مقصد کارفرما تھا وہ اقطارِ جزیرۂ عرب میں سیاسی نفوذ تھا۔

مصادر و حواشی

۱۔ ابن خلدون: ج ۴ ص ۹۳

۲۔ ابن الاثیر: ج ۸ ص ۱۳۰

۳۔ ابن الاثیر: ج ۸ ص ۱۸۶

۴۔ ابن الاثیر: ج ۸ ص ۱۸۶، ۱۸۷ نیز ابنِ خلدون: ج ۴ ص ۳۴۴، ۴۴۴

۵۔ سیروف: ساحل خلیج فارس کا ایک مقام (یاقوت، معجم البلدان)

۶۔ ابن خلدون: ج ۳ ص ۴۲۵، ج ۴ ص ۴۴۳، ۴۴۴، ۵۰۴

۷۔ ابن الاثیر: ج ۸ ص ۲۱۲، نیز ابن خلدون ج ۴ ص ۵۰۴

۸۔ ابن خلدون: ج ۴ ص ۹۳

۹۔ ابن الاثیر: ج ۹ ص ۱۶۱، ۱۶۲

۱۰۔ ابن الاثیر: ج ۹ ص ۱۹۵، نیز ابن خلدون: ج ۴ ص ۴۸۹، ۴۹۰

۱۱۔ ابن خلدون: ج ۴ ص ۹۳

۱۲۔ Bulletin school of oriental studies (Letters of Al-Mustansir Billah) 1934 Part-VII P.321

۱۳۔ B.S.O.S 1934 Vol VII Part 2 P. 321, 324.

بلادِ یمن پر فاطمیوں کی حکومت

سیّدہ حرہ کی عقیدت واطاعت کے لازوال کارنامے

سلطان صلاح الدین ایوبی کی فوج کشی

عباسیوں کے ہاتھ میں خلافت آئی تو یمن بھی ان کے احاطۂ اقتدار میں داخل ہوگیا۔ یمن کے والی بغداد سے نامزد ہونے لگے۔ انہوں نے اپنا دارالحکومت صنعاء کو بنالیا۔ لیکن بے چینی اور اضطراب کی کیفیت طاعت و انقیاد کے باوجود برابر قائم رہی۔ جب مسندِ خلافت پر مامون بیٹھا تو اسے صلاح دی گئی کہ یمن میں ایسے شخص کو والی بنا کر بھیجنا چاہیئے جو وہاں کے لوگوں کو دبا کر رکھ سکے اور فتنہ و فساد کا قلع قمع کر دے۔ کیونکہ دعوت شیعیت برابر پھیل رہی اور برگ و بار لا رہی تھی۔ چنانچہ حسن ابن سہل نے رائے دی کہ محمد بن ابراہیم الزیادی کو یمن کی ولایت سونپی جائے۔ مامون نے اس رائے پر صاد کیا۔ یہ واقعہ ۲۰۳ھ کا ہے۔ لیکن ایک ہی سال کے اندر اس نے زبیدہ کو دارالحکومت بنالیا۔ اور سارے یمن کو اپنے احاطۂ اقتدار میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔ چنانچہ بہت جلد اس نے حضرموت، شحر، دیار کندہ، لحج اور تہامہ کو مطیع بنالیا رفتہ رفتہ اس نے اتنی قوت حاصل کرلی کہ مستقل بادشاہ بن بیٹھا۔ لیکن خلافت

بغداد سے رشتہ منقطع نہیں کیا۔ خطبہ بنو عباس کا جاری رہا اور سال بہ سال تحائف اور ہدایا اور خراج کی ترسیل بغداد کو جاری رہی۔

غرض محمد بن ابراہیم الزیادی نے یمن کی گورنری کو اپنے خاندان میں موروثی بنا لیا۔ ۲۴۵ھ میں اس کا انتقال ہوا۔ اس کا جانشین اس کا بیٹا ابراہیم ہوا پھر اس کا بیٹا زیاد۔ لیکن یہ بھی زیادہ عرصہ تک فرمانروائی نہ کر سکا۔ اس کا جانشین اس کا بیٹا ابوالجیش اسحاق تھا۔ ۸۰ سال کی عمر تک یہ امور مملکت سرانجام دیتا رہا۔

بلادِ یمن میں دولتِ زیادیہ کا انخلال و انحطاط ابوالجیش ابراہیم کے اواخر عہد میں شروع ہو گیا۔ چنانچہ صنعا میں اسعد بن ابی جعفر نے خروج کیا اور قبضہ کر لیا۔ صعدہ میں یحییٰ بن القاسم الرسی ملقب بہ ہادی نے بغاوت کی اور قابض ہو گیا۔ یہ دعوتِ زیدیہ — اتباع زید بن علی زین العابدین — کا علم لے کر کھڑا ہوا۔ جب اس کا نفوذ بڑھ گیا اور اس کے اختیار میں دن بدن اضافہ ہونے لگا تو اس نے صنعا پر حملہ کر دیا۔ اور اسے سعد بن جعفر کے ہاتھ سے چھین لیا۔ لیکن بنو اسعد کی شورش جاری رہی۔ بہرحال صنعا سے صعدہ واپس گیا اور یہاں دولتِ بنی الرسی کی بنیاد ڈال دی۔ اس طرح یمن میں تین حکومتیں قائم ہو گئیں، ایک زبید میں، دوسری صنعا میں اور تیسری صعدہ میں۔

دولت زیادیہ کے ضعف و انخلال نے دعوتِ فاطمیہ کو سربراہ ہونے کے غیر معمولی مواقع بہم پہنچائے۔ اس زمانے میں محمد الحبیب نے جو اسماعیلیہ کے امام تھے اور سلمیہ میں مقیم تھے۔ علی بن الفضل الیمانی اور ابوالقاسم رستم بن الحسین بن فرح بن حوشب کوفی کو یکے از آلِ محمد، مہدی کی دعوت پھیلانے کے لئے بھیجا۔ یہ لوگ ۲۶۹ھ میں یمن پہنچے اور نشر دعوت کے کام میں مشغول ہو گئے۔

کچھ عرصہ بعد بنی ابن حوشب نے ایک لشکر تیار کیا اور صنعا پر حملہ کر دیا۔ اور بنی جعفر کا عمل دخل بالکل ختم کر دیا اور یمن کے طول و عرض میں اپنے داعی پھیلا دیئے۔ جنہوں نے زور و شور سے دعوت کا سلسلہ شروع کر دیا اور یمن میں اکثر شہروں پر قبضہ کر لیا۔[۴]

ابنِ حوشب نے جب دیکھا کہ مہدی کی دعوت تیزی سے کامیاب ہو رہی ہے اور اہالی یمن کا بڑا حصّہ اس دعوت کو فرطِ جوش و عقیدت سے قبول کر رہا ہے تو اس نے محمد الحبیب اور اس کے بیٹے عبیداللہ کو فتح بلاد اور کامیابی دعوت کی اطلاع دی۔ ساتھ ہی ساتھ اموال و ہدایا بھی نذرانے کے طور پر روانہ کئے۔[۵]

محمد الحبیب نے بلادِ یمن میں فاطمی دعوت کی کامیابی پر قناعت نہیں کی۔ بلکہ بلادِ مغرب میں اس کے نشر و توسیع کی جد و جہد شروع کر دی۔ چنانچہ ابوعبداللہ الحسین ابن احمد بن محمد بن زکریا کو ابن حوشب کے پاس بھیجا اور حکم دیا کہ وہ اس کی اطاعت و اقتدا اختیار کرے اور اس کے بعد مغرب میں دعوت اسماعیلیہ کی نشر و توسیع کا اہتمام کرے۔ چنانچہ ابوعبیداللہ ابن حوشب کے پاس آیا اور اس کے کبار اصحاب میں شمار ہونے لگا، یہاں اسی اثنا میں ابوسفیان اور حلوانی کی وفات کی اطلاع آئی جو مغرب میں اسماعیلی داعی تھے۔ تو ابن حوشب نے ابوعبیداللہ کو بلادِ مغرب میں المہدی کی طرف دعوت دینے کا فریضہ سپرد کیا، چنانچہ ابوعبداللہ مکہ پہنچا، پھر بلادِ مغرب کی طرف کوچ کیا، اور وہاں اسماعیلی دعوت کا فریضہ انجام دینا شروع کر دیا اور انہیں بتایا کہ ظہور مہدی کا — جو آلِ محمد میں سے ہوگا — وقت قریب آگیا ہے۔ ابوعبداللہ امام محمد الحبیب کی خدمت میں یہاں سے تحائف و ہدایا اور قاصد بھیجنے لگا۔[۶]

محمد الحبیب نے اپنے بعد اپنے بیٹے عبیداللہ المہدی کے لئے امامت کی وصیت کی۔ چنانچہ باپ کی وفات کے بعد عبیداللہ نے بھی پوری تن دہی سے نشر و توسیع دعوت کی طرف توجہ کی اور حصول مقصد کے لئے بے دریغ روپیہ صرف کیا۔

یمن کے اسماعیلی داعیوں کو یقین تھا کہ مہدی کی حکومت کا پرچم بہت جلد وہاں لہرائے گا۔ یہی حال مغرب کے اسماعیلی داعیوں کا تھا۔ وہ بھی مہدی کی آمد کے منتظر تھے، چنانچہ ابو عبداللہ نے عبید اللہ المہدی کی خدمت میں جب وہ سلمیہ میں مقیم تھا کتامہ کے سربرآوردہ اصحاب کا وفد بھیج کر اسے مغرب آنے کی دعوت دی۔[11]

خلیفہ مکتفی عباسی کو جب بلادِ یمن اور مغرب میں شیوع و ذیوع دعوت اسماعیلیہ کی اطلاع ملی تو اس نے بعض لوگوں کو عبید اللہ کی نقل و حرکت کی نگرانی اور اگر ممکن ہو تو گرفتار کرنے کی ہدایت کی۔[12] چنانچہ وفود کتامہ سے ملاقات کے بعد ابو عبداللہ نے سلمیہ سے راہ فرار اختیار کی، اپنے اتباع کو بتایا کہ وہ یمن جا رہا ہے۔ جعفر حاجب جو سلمیہ سے کوچ کے وقت مہدی کے ساتھ تھا کہتا ہے۔

"مہدی نے ہمیں تیاری سفر کا اور اپنے ساتھ چلنے کا حکم دیا اور ہم پر ظاہر یہ کیا کہ اس کا مقصد یمن جانے کا ہے۔"[13]

لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ ابو عبداللہ کو یمن میں دولتِ اسماعیلیہ قائم کرنے کا کچھ زیادہ خیال نہیں تھا بلکہ ابو عبداللہ تو دعوت پاکر مغرب کی طرف کوچ کرنے کی تیاری کر رہا تھا۔ ابنِ اثیر کے بیان سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔[14]

امر واقعہ بھی یہی ہے کہ اپنے والد کی خواہش کے مطابق ابو عبید اللہ کو یہ لگن لگی تھی کہ مغرب میں دولتِ فاطمیہ قائم ہو۔ چنانچہ جب اسے اطلاع ملی کہ ابنِ حوشب نے یمن میں دعوتِ اسماعیلی کی نشر و توسیع میں غیر معمولی کامیابی حاصل کرلی ہے تو اس نے لکھا۔

"یہ تمہاری حکومت ہے۔ میں تو دولتِ فاطمیہ کا ظہور مغرب میں ہی چاہتا ہوں۔"

بہرحال یہ بات شک و شبہ سے بالا ہے کہ عبید اللہ المہدی نے یہ چال اس لئے اختیار کی تھی کہ عباسیوں کی گرفت سے بچ نکلے ۔ جنہوں نے اس کی نقل و حرکت کی نگرانی کے لئے ہر چہار طرف آدمی پھیلا رکھے تھے ۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے اپنے بعض اتباع پر ظاہر یہ کیا کہ یمن کا قصد ہے ورنہ حقیقتہً ارادہ تھا مغرب کا رہا ابن خلدون اور المقریزی کا یہ بیان کہ ابو عبید اللہ نے یمن میں حکومت قائم کرنے کا خیال ترک کر کے مغرب کو اس لئے منتخب کیا کہ علی بن فضل دعوت اسماعیلیہ سے منحرف ہو گیا تھا، بالکل غلط ہے ۔ اس کی تائید میں کوئی دلیل نہیں ملتی ۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ علی بن فضل کا دعوتِ اسماعیلیہ سے انحراف مغرب میں دولتِ اسماعیلیہ کے قیام کے بعد کا واقعہ ہے اور اگر وہ یمن میں اپنی حکومت قائم کرنا چاہتا تو ہر وقت قائم کر سکتا تھا ۔ ابن حوشب کے مقابلہ میں علی بن فضل بے اثر تھا ۔ اور یمن کی بہت بڑی تعداد قدوم مہدی کے لئے دیدہ و دل فرش راہ کرنے کو تیار تھی ۔ وہ دل کی گہرائی سے اس کی امامت کے معتقد تھے اگر وہ یمن کی سرزمین پر قدم رکھتا تو جوق در جوق لوگ اس کے حلقہ اطاعت میں داخل ہوتے اور اس کے ارد گرد جمع ہو جاتے ۔

سلیمہ سے مغرب روانہ ہونے وقت ابو عبید اللہ المہدی کے ساتھ داعی دعات فیروز بھی تھا ۔ لیکن مصر پہنچنے کے بعد وہ یمن واپس آگیا ۔ ابن حوشب نے اس اختصاص کی بنا پر جو اسے مہدی کی بارگاہ میں حاصل تھا جدید حالات سے ناواقف ہونے کے باعث پُر جوش استقبال کیا ۔

لیکن کچھ ہی عرصہ کے بعد مہدی کا خط ابن حوشب کے پاس پہنچا جس میں تاکید تھی کہ فیروز سے نجات حاصل کی جائے ۔ فیروز کو جب یہ پتہ چلا تو وہ بھاگ کھڑا ہوا، اور علی بن فضل کے ساتھ جا کر مل گیا اور اپنی دعوت دینے لگا ۔ ابن حوشب نے علی اور فیروز سے طویل عرصہ تک جنگ جاری رکھی ۔

یمن میں دعوتِ اسماعیلیہ کی کامیابی تمام تر رہینِ منت تھی ابن حوشب اور علی بن فضل کی جدوجہد کی ۔ لیکن علی نے ابن حوشب کا ساتھ چھوڑ دیا ۔۔۔۔ وہ ابوعبیداللہ المہدی کی ولا میں صادق نہیں تھا ۔ فیروز کے بہکا دینے میں آکر اس کا داعی بن گیا اور مہدی سے خلع بیعت کر لی اور یمن پر قبضہ کے خواب دیکھنے لگا ۔ ابن حوشب نے اسے ایک خط لکھا اور اس بات پر ملامت کی کہ محمد الحبیب کا تم دونوں سے کتنا اچھا برتاؤ تھا جس کا جواب تم اس طرح دے رہے ہو ۔ اس نے لکھا ۔

"تم نے خلع بیعت کر لی جس سے جدائی کے سوا تمہیں کچھ نہیں ملا تھا ، کیا تمہیں وہ مواثیق اور عہود یاد نہیں رہے جو تمہارے اور امام کے درمیان تھے ؟"

ابن الفضل نے جواب دیا ۔

"یہ دنیا ایک گوسفند کی حیثیت رکھتی ہے جو اس پر قابو پا لیتا ہے وہ اسے شکار کر لیتا ہے" [21]

علی ابن فضل نے صرف عبیداللہ المہدی کے خلاف خروج نہیں کیا بلکہ ابن حوشب کے خلاف بغاوت بھی کر دی تاکہ یمن پر قبضہ کرے ۔ فریقین کے مابین سخت خونریز جنگ ہوئی ۔ علی بن فضل کا پلہ بھاری رہا ۔ آخر دونوں میں صلح ہو گئی [22]

ابوعبیداللہ المہدی مغرب میں اتنا سرگرم کار تھا کہ وہ ان دونوں کی طرف توجہ نہیں ہو سکا ۔ دونوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا ۔

ابن حوشب عبیداللہ المہدی کی عقیدت میں آخر وقت تک سرشار رہا ۔ یہاں تک کہ ۳۰۲ھ میں اس نے وفات پائی ۔ ۳۰۳ میں علی بن فضل کا بھی انتقال ہو گیا ۔ اس کا بیٹا کمزور ثابت ہوا ۔ اسے قوی دست انصار میسر نہ آسکے ۔۔۔ نہ وسائل و ذرائع ۔ وہ اپنے بھائی سمیت دشمن کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا [23]

ابن حوشب کی مساعی کی بدولت یمن میں اسماعیلیوں کی بہت بڑی جماعت

پیدا ہوگئی تھی۔ مرتے وقت اس نے اپنے بیٹے ابوالحسن اور عبداللہ بن عباس الشاوری کو وصیت کی کہ عبیداللہ المہدی اور اس کے اہل بیت کی دعوت میں سرگرم رہیں اور ایک دوسرے کے ہمدم و دمساز رہیں۔[24]

عبداللہ بن عباس الشاوری نے عبیداللہ المہدی کو ابن حوشب کی وفات کی اطلاع دی اور اپنے لئے ولایت کی اور ابن حوشب کے عزل کی درخواست کی،[25] جو قبول ہوگئی۔[26]

اس حرمان نے ابوالحسن کو مشتعل کردیا۔ اس نے دھوکہ دے کر ابن عباس کو قتل کردیا اور زمام اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لی۔[27]

ابوالحسن اپنے باپ ابن حوشب کے نقش قدم پر نہیں چلا۔ اس نے مذہب اسماعیلیہ سے قطع تعلق کرلیا اور مذہب اہل سنت اختیار کرلیا۔ اکابر و امرا کے مجمع میں اعلان کیا کہ اپنے والد کے راستے کو اس نے ترک کردیا ہے۔[28]

ابوالحسن کے اس اقدام کا سب سے برا اثر اس کے بھائی جعفر پر ہوا جو اس کی اس سیاست اور مسلک سے سخت نالاں تھا۔ اس نے لکھا۔

"آپ نے پاؤں پر اپنے ہاتھ سے کلہاڑی مار لی۔"

لیکن ابوالحسن نے ایک نہ سنی۔ جعفر اس سے خفا ہوکر یمن سے نکل گیا اور عبیداللہ المہدی سے ملنے کے لئے مغرب کی طرف چل کھڑا ہوا کہ اسے یمن کے حالات اور اپنے بھائی کی کیفیت سے آگاہ کرے۔ لیکن جب وہاں پہنچا تو مہدی کا انتقال ہوچکا تھا اور اس کا بیٹا القائم مسند نشین تھا۔ یہ واقعہ ۳۲۲ھ کا ہے۔ جعفر چندے اس کے پاس مقیم رہا۔

ابوالحسن کی اس سیاست کا نتیجہ یہ نکلا کہ بھائی بھائی میں نفرت پیدا ہوگئی۔ اس نے اپنے والد کے اسماعیلی انصار کو مجبور کیا کہ وہ بھی اس کا ساتھ دیں۔ بعض کو قتل بھی کردیا، بعض نے تقیہ کرکے جان بچائی۔ لیکن اس کے باوجود یمن کی فاطمی دعوت ختم نہ کی جاسکی۔ وہ برگ و بار لاتی رہی۔[29] ہر طرح کے تشدد اور جبر کے

باوجود، مغرب کی خلافت فاطمی سے اس کا رشتہ قائم رہا۔

لیکن ابوالحسن کو، دعوت اسماعیلیہ سے انحراف اور خلافت فاطمی سے ترک تعلق کا ثمرہ کچھ اچھا نہ ملا۔ سنّیوں نے بھی اس کی پذیرائی نہیں کی۔ نہ اس انقلاب کو کچھ اہمیت دی بلکہ اسے شک وشبہ کی نظر سے دیکھتے رہے اور آخر کار وہ ان کے ہاتھوں قتل ہُوا، اس کی حکومت چھن گئی۔ اولاد قتل ہوگئی، عورتیں گرفتار کرکے باندیاں بنالی گئیں [۲۰]

ابوالحسن کے بعد ابراہیم بن عبدالحمید شیعی بھی جو کبار دعاۃ اسماعیلیہ میں تھا مذہب اسماعیلی سے منحرف ہوگیا اور اپنے مقبوضہ علاقوں میں بنو عباس کا خطبہ جاری کردیا۔[۲۱] اس نے بھی اسماعیلیوں پر انتہائی تشدد روا رکھا لیکن ابن طفیل نے انہیں اس سے نجات دلائی [۲۲]

ابن طفیل کی وفات کے بعد یمن کے اسماعیلیوں نے اپنا رئیس اور سردار ابن جفتم کو بلالیا۔ لیکن یہ کسی ایک جگہ جم کر نہیں ٹکتا تھا ہمیشہ سفر میں رہتا تھا کہ مباداشی اسے گرفتار کرلیں۔ لیکن اس پریشان حالی کے باوجود خلیفہ المعزلدین اللہ فاطمی سے تحریری رابطہ برابر قائم رکھتا تھا جو مغرب سے مصر آچکا تھا اور قاہرہ کو اپنا دارالخلافہ بنالیا تھا۔ یہ زندگی کی آخری سانس تک خلیفہ کی عقیدت کا دم بھرتا رہا۔ جب موت کو قریب دیکھا تو اپنے اسماعیلی اتباع میں سے ایک شخص یوسف کو اسد کو اپنا جانشین بنالیا۔[۲۳]

بلاد یمن میں خلیفہ عزیز باللہ فاطمی کی دعوت صرف دعاۃ اسماعیلیہ ہی کی سرگرمیوں کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ اس میں امیر صنعاء عبداللہ بن قحطان بن ابی جعفر (۳۹۴ھ) کا بھی حصّہ تھا، امراء بنو جعفر نے ۳۰۳ھ میں علی بن فضل کی وفات کے بعد اس شہر پر قبضہ کرلیا تھا اور قریب کے بعض دوسرے بلاد بھی اپنے دائرہ حکومت

میں شامل کر لئے تھے اور عباسی خلیفہ کا خطبہ بھی جاری کر دیا تھا، لیکن جب صنعا میں عبداللہ بن قحطان کا اقتدار مکمل ہو گیا تو اس نے فتح تہامہ کا عزم کیا اور اسکے امیر ابوالجیش اسحاق بن ابراہیم بن زیاد کو شکست دی، پھر ابن زیاد کے پایۂ تخت زبید میں داخل ہوا اور اس پر قابض ہو گیا۔ خلیفہ عباسی کا خطبہ اپنے ماتحت جملہ بلاد میں منقطع کر دیا اور خلیفہ عزیز باللہ فاطمی کا خطبہ رائج کر دیا۔ اس کے انتقال تک یعنی ۳۸۶ھ تک یہی کیفیت جاری رہی[۳۲]۔

غرض سنیوں کے ہاتھوں بے انتہا مصائب و نوائب برداشت کرنے اور کڑیاں جھیلنے کے بعد فاطمی دعوت نے یمن میں پھر قدم جما لئے[۳۳]۔ اور دعوت عباسی ایک مرتبہ پھر ضعف و انحلال کا شکار ہو گئی۔

یوسف بن اسعد نے خلفاء فاطمیین کے لئے پوشیدہ طور پر دعوت کا سلسلہ جاری رکھا۔ حاکم بامر اللہ کے زمانے میں اس کا انتقال ہوا۔ اس کی جگہ عامر بن عبداللہ الزواحی نے لی جو صاحبِ مال و جاہ تھا، اس نے بے دریغ اپنی دولت اور اپنے اثر و رسوخ کا استعمال نشر دعوت کے لئے شروع کر دیا۔ اور یمن کے بہت سے لوگوں کو مذہب اسماعیلی کا پیرو بنا لیا۔ خلیفہ حاکم اور ظاہر فاطمی کے پورے عہد میں اور مستنصر فاطمی کے اوائل عہد میں[۳۴] دعوتِ فاطمیت کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس کی وفات کے بعد اس کا جانشین علی بن محمد صلیحی بنا[۳۵]۔ یہ بہت بڑا فقیہ اور پاک نفس شخص تھا۔ کئی سال تک قافلۂ حجاج یمن کا سالار رہا اور غیر معمولی عظمت و شہرت کا حامل تھا، ۴۲۸ھ میں اس نے جب حج کیا تو اپنی قوم یعنی ہمدان کے لوگوں کو جمع کیا اور انہیں اپنی نصرت اور موازرت پر راغب کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے یہ دعوت قبول کر لی اور بیعت کے لئے ہاتھ بڑھا دیئے ان میں ستر آدمی خود اس کے کنبہ کے تھے[۳۶]۔

۴۲۹ھ میں صلیحی نے احیاء دعوت اسماعیلیہ کے لئے حجاز سے یمن کا رخ کیا۔ جبل حراز کے قریب ایک قلعہ بنایا اور وہاں اقامت گزیں ہو گیا۔ سنحان

ہمدان اور حمیر کے لوگ جوق در جوق اس کے حلقۂ اطاعت میں داخل ہونے لگے۔[۵]

علی بن محمد صلیحی کو حالات سازگار ملے اور یمن کے گوشہ گوشہ میں دعوتِ اسماعیلی کا پرچار کامیابی کے ساتھ کرتا رہا۔

۴۰۹ھ میں زوال دولتِ بنی زیاد کے بعد اس حکومت کی باگ بنو زیاد کے موالیوں کے ہاتھ میں آئی۔ بنو عباس کا خطبہ انہوں نے بھی جاری رکھا۔ انہی موالی میں ایک شخص نجاح بھی تھا۔ اس نے زبید میں باقاعدہ ایک سنی حکومت قائم کر لی اور اس حکومت کو آزاد و خود مختار بھی بنا لیا۔ اس کا رہن سہن بالکل بادشاہوں کا سا تھا۔ اور پھر تو اس کا نفوذ اور بڑھ گیا۔ جب بارگاہ خلافتِ عباسیہ سے اسے المؤید نصر الدین[۶] کا لقب ملا اور اس کے اقتدار و فرمانروائی کو تسلیم کر لیا گیا۔

نجاح کی حکومت سنی تھی، اس نے دعوت اسماعیلی کا قلع قمع کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا، اب صلیحی کو بھی سخت دشواریاں پیش آئیں۔ لیکن اس نے خفیہ طور پر دعوت کا سلسلہ جاری رکھا۔[۷]

صلیحی نے حکمتِ عملی سے بھی کام لیا اور نجاح کی طاعت کا اظہار ہر دم بھرنے لگا لیکن اندر ہی اندر اس سے گلو خلاصی کی سعی بھی کرنے لگا۔ چنانچہ ۴۵۲ھ میں اس نے نجاح کی خدمت میں ایک باندی پیش کی، جس نے اسے زہر دے کر ہلاک کر ڈالا۔[۸] اس کی جانشینی اس کے بیٹوں سعید الاحوال اور جیاش کے ہاتھ میں آئی۔ لیکن یہ صلیحی کے مقابلہ میں نہیں ٹھہر سکے، اور دھلک کی طرف فرار ہو گئے۔ اس طرح صلیحی نے نجاح کی حکومت پر قبضہ کر لیا اور زبید کو اپنے ممالک محروسہ میں شامل کر لیا۔

یمن میں صلیحی کا دبدبہ جب اچھی طرح قائم ہو گیا تو اس نے ۴۵۳ھ میں

خلیفہ المستنصر باللہ فاطمی کو ایک عریضہ لکھا اور استدعا کی کہ اسے علانیہ دعوت
کا فریضہ انجام دینے کی اجازت مرحمت فرمائی جائے۔ ساتھ ہی ساتھ
گراں بہا ہدایا بھی خلیفہ کی خدمت میں بھیجے۔ جن میں ساٹھ تلواریں بھی
جن کے قبضے عقیق کے تھے، پانچ زرکار پارچہ جات بھی ہدایا میں شامل
علاوہ ازیں عقیق کے نگینے، مشک اور عنبر بھی بڑی تعداد اور مقدار میں
کئے۔ مستنصر نے یہ ہدایا قبول کر لئے اور پرچم رکھنے کی اجازت دے دی
خطاب بھی مرحمت کیا اور یمن کی ولایت سونپ دی اور نشر دعوت کی اجازت
بھی عطا کی۔

مستنصر کی سرپرستی اور پشت پناہی نے صلیحی کا اقتدار بام عروج تک پہنچا دیا
اب اس نے توسیع مملکت کی طرف توجہ کی۔ سب سے پہلے وہ تہامہ کی طرف
متوجہ ہوا اور اسے بڑی آسانی سے فتح کر لیا۔ ٤٥٥ھ ختم ہونے سے پہلے
بلادِ یمن پر وہ چھا گیا اور صنعاء کو اس نے اپنا پایۂ تخت بنا لیا۔ چنانچہ
بیان ہے۔

"علی بن محمد صلیحی سارے یمن پر قابض ہو گیا۔ وہاں کے میدان اور پہاڑ
شمال اور جنوب، غرب و شرق بہت مختصر مدت میں اس کے زیر اقتدار
آ گئے۔"

توسیع مملکت کی مہم سے فارغ ہونے کے بعد صلیحی نے بلادِ یمن کے
اکناف میں دعوتِ اسماعیلیہ کا غلغلہ بلند کر دیا اور ان تمام بلاد میں خلیفہ
فاطمی کا خطبہ پڑھا جانے لگا۔ خلیفہ کے ساتھ خطبہ میں صلیحی اور اس کی
السیدہ اسماء بنت شہاب کا نام بھی لیا جانے لگا۔ اس طرح دعوت
کا بلادِ یمن سے بالکل خاتمہ ہو گیا۔

صنعاء میں جب صلیحی کے قدم جم گئے تو اس نے امراء یمن کو جواب

ے محروم ہو گئے تھے، بلایا اور اپنے پاس رکھا اور اپنے برادر نسبتی اسعد بن شہاب کو زبید وغیرہ کا گورنر مقرر کر دیا، اس نے قسم کھائی تھی کہ گورنری اس کو سونپے گا جو ایک لاکھ دینار کا نذرانہ اس کی خدمت میں پیش کرے گا۔ لیکن اس قسم پر اسے پچھتانا پڑا۔ اس کی بیوی اسماء یہ رقم لے کر اس کے پاس آ گئی اور اپنے بھائی اسعد بن شہاب کی گورنری کے لئے ساعی ہوئی، صلیحی نے اس سے پوچھا تم نے یہ رقم کہاں سے پائی؟

وہ بولی: خدا کے پاس سے ــــ وہ جسے چاہتا ہے بے حساب دیتا ہے۔

صلیحی مسکرانے لگا سمجھ گیا، یہ اسی کے خزانے کی رقم ہے جو اسے دی گئی ہے۔ غرض صلیحی نے اسعد ابن شہاب کو ۴۵۶ھ میں زبید کی گورنری پر مامور کر دیا۔ سیرت و کردار کے اعتبار سے بلند پایہ شخص تھا اس نے اپنی رعایا پر کبھی کوئی ظلم روا نہیں رکھا اور خاص طور پر سنیوں کے ساتھ تو حد درجہ روادارانہ برتاؤ ملحوظ رکھا۔ اس کا تسامح سنیوں کے ساتھ یہاں تک پہنچ گیا کہ اس نے انہیں اپنے مذہب کے اظہار و اعلان کی عام اجازت دے دی۔

صلیحی یمن پر خلیفہ مستنصر باللہ فاطمی کے نائب کی حیثیت سے حکومت کرتا تھا، اس کی آرزو تھی کہ مصر جائے اور دربار خلافت میں حاضری دے۔ اس سلسلہ میں صلیحی اور خلیفہ مستنصر باللہ فاطمی کے مابین کافی خط و کتابت ہوئی جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان دونوں کے مابین کتنا مضبوط اور محکم رشتہ قائم تھا۔ محرم ۴۵۵ھ میں المستنصر نے صلیحی کو ایک خط لکھ کر اپنے بیٹے احمد الملقب بہ ابو القاسم کی ولادت کی خبر دی اور اسے ہدایت کی کہ سارے یمن میں یہ خبر مشتہر کر دے۔ رمضان ۴۵۵ھ میں اسے جو خط لکھا اس میں ابن بادیس کی افریقہ میں بغاوت

کا حال درج کیا اور بتایا کہ وہ اس پر کس طرح غالب آیا۔ اور اپنے حدود مملکت میں اس کے بلاد کو شامل کر لیا۔[49] اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مستنصر یمن کی رتی رتی کی خبر اپنے نائب صلیحی کو بھیجتا رہتا تھا۔

نشرِ دعوتِ فاطمیت کے سلسلے میں مستنصر نے صلیحی کو نہ صرف یمن بلکہ حجاز کا بھی ذمہ دار بنا دیا تھا۔ ۴۵٦ھ میں اس نے جو خط لکھا ہے اس میں لکھا ہے کہ والئ حجاز سے رافت و رحمت کا سلوک کیا جائے۔ نیز اس کے خدمات جلیلہ پر جو اس نے نشرِ دعوت کے سلسلہ میں انجام دیئے تھے شاندار الفاظ میں خراج تحسین ادا کیا ہے اور اسے "عمدۃ الخلافۃ" کا لقب بھی مرحمت کیا۔[50]

اب صلیحی نے مصر جا کر خلیفہ کا دیدار کرنے کا فیصلہ کر لیا اور باقاعدہ عریضہ لکھ کر حاضری کی اجازت چاہی، خلیفہ نے جمادی الآخر ۴۵۹ھ کے خط میں اجازت دے دی۔[51] لیکن صلیحی نے براہِ راست جانے کی بجائے فیصلہ کیا کہ پہلے مکہ جا کر فریضۂ حج ادا کرے۔ چنانچہ اپنے بیٹے المکرم احمد کو جانشین سونپی اور روانہ ہو گیا۔ راستہ میں سعید الاحول بن نجاح نے دھوکے سے قتل کر دیا۔ یہ واقعہ اواخر ۴۵۹ھ کا ہے۔[52]

علی بن محمد صلیحی کی وفات کے بعد المکرم احمد یمن کا فرمانروا بن گیا۔ خلیفہ المستنصر نے از راہ کرم ۴٦٠ھ میں تعزیت نامہ لکھا اور اس کی فرمانروائی کی توثیق کر دی۔ نیز امورِ دعوت اس کے سپرد کر دیئے۔[53]

زمام امور ہاتھ میں لینے کے بعد المکرم نے زبید پر چڑھائی کر دی۔ سخت معرکہ برپا ہوا۔ سعید اپنے ساتھیوں سمیت دھلک کی طرف فرار ہو گیا۔ المکرم نے زبید پر قبضہ کر لیا اور اپنے ماموں اسعد بن شہاب کو وہاں کا والی مقرر کیا۔ پھر کئی مرتبہ بنو نجاح نے زبید واپس لینے کی کوشش کی لیکن ہر مرتبہ ہزیمت اور شکست سے دوچار ہوئے، آخری معرکہ میں سعید بن نجاح قتل ہو گیا اور

المکرم کا کوئی حریف میدان میں نہیں رہ گیا - اس نے دینار کا نیا سکہ ڈھلوایا۔
جس پر یہ عبارت نقش کرائی۔

"الملک السید المکرم ، عظیم الحرب ، سلطان امیر المومنین"[55]

یہ خبر پا کر خلیفہ المستنصر نے اسے تہنیت نامہ لکھا اور "امیر الامراء" کے لقب
سے نوازا۔[56]

لیکن المکرم میں باپ کے سے اوصاف نہ تھے - چنانچہ ہم دیکھتے ہیں سعید احول
سے زبید واپس لینے کے بعد، وہ صنعاء گیا اور اپنی بیوی السیدۃ الحرہ بنت احمد
بن محمد بن جعفر بن موسیٰ صلیحی کو کاروبار حکومت سونپ دیا اور خود لذائذ حیات
سے تمتع حاصل کرنے میں لگ گیا۔[57]

٧٠م ھ میں مستنصر نے بدر جمالی کو اس کے زبردست خدمات کے باعث
جملہ امور مملکت کا سربراہ بنا دیا اور اس کے القاب میں یہ اضافہ کیا۔

"السید الاجل ، امیر الجیوش ، کامل قضاۃ المسلمین ، ہادی دعاۃ المومنین"!

القاب کے اس اضافہ کے فوراً بعد قضاۃ ، دعاۃ اور منصب داران حکومت
سب اس کے مطیع ہو گئے۔[58]

مستنصر نے اس فیصلہ کی اطلاع السیدۃ الحرہ کو بھی دی اور وزیر اعظم بدر جمالی
کا تعارف کرتے ہوئے لکھا۔

"یہ ہمارا خلیفہ اور باب دعوت ہے"![59]

مکرم نے اپنی وفات سے قبل وصیت کر دی تھی کہ امور دعوت میں اس کا
ابن عم ابو حمیر سبا بن احمد المظفر بن علی الصلیحی اس کا جانشین ہوگا - ٧٧م ھ
میں جب اس نے وفات پائی تو سیدہ حرّہ نے خلیفہ مستنصر کو ایک عریضہ لکھا اور
شوہر کی وفات کی خبر دیتے ہوئے استدعا کی کہ اس کے بیٹے عبد المستنصر کو جو ہنوز
کم سن بچہ تھا ، باپ کی گدی دی جائے - خلیفہ نے یہ استدعا منظور کر لی اور حکم
دیا کہ اب سرکاری مراسلات عبد المستنصر کے نام پر بھیجے جایا کریں۔[60] - نیز اپنے خاص قاصد

عزالدین ابوالحسن جوہر المستنصری کے ہاتھ سیدہ حرہ کو تعزیت نامہ بھیجا اور اس کے شوہر کی وفاداری اور خدمات کو سراہا۔

لیکن صغر سنی کے باعث عبدالمستنصر کی تولیت امرائے یمن کو ناگوار گزری مگر خلیفہ نے اس خاندان کے گراں بہا خدمات کے باعث عبدالمستنصر کو اس کے منصب ولایت پر بحال رکھا۔[61]

خلیفہ المستنصر باللہ فاطمی بلادِ یمن میں استقرارِ امور کے لئے ساعی تھا تاکہ اس کی سیادت کو کسی طرح کا ضعف نہ پہنچے۔ چنانچہ جب داعی ابی حمیر سبا بن احمد صلیحی اور ابو ربیع سلیمان بن الامیر الزواحی کے مابین عبدالمستنصر کی تولیت پر نزاع برپا ہوئی تو اس نے سیدہ حرہ کو ایک مکتوب بھیجا اور اس نزاع پر قلق اور تشویش کا اظہار کیا اور اسے ان دونوں کے مابین مصالحت کرا دینے پر آمادہ کیا۔

اس طرح مستنصر نے صلیحیین اور آل زواحی کو الگ مراسلہ بھیجا اور اس امید کا اظہار کیا کہ وہ باہمی اختلاف ختم کر کے سیدہ حرہ اور اس کے بیٹے عبدالمستنصر کی دل و جان سے اطاعت کریں گے۔[62]

خلیفہ کی اس تحریک کا حسبِ دل خواہ اثر ہوا اور نزاع ختم ہو گیا جس پر اس نے قلبی مسرت اور خوشنودیٔ طبع کا اظہار کیا۔[63]

لیکن عبدالمستنصر کچھ زیادہ دن نہ جیا۔ اس کی وفات کے بعد داعی سبا بن احمد المظفر اور سیدہ حرہ کے مابین ریاست دعوت اور اقتدار و حکومت پر نزاع برپا ہو گئی۔

سبا بن احمد سیدہ حرہ سے شادی کرنا چاہتا تھا، لیکن اس نے اس تجویز کو حقارت سے ٹھکرا دیا۔ فریقین نے قتال و جدال کی تیاریاں شروع کر دیں۔ آغاز جنگ کے کچھ روز بعد سبا بن احمد کو سلیمان بن عامر الزواحی نے لکھا۔

"خدا کی قسم تم اپنی مراد کو نہیں پہنچ سکتے جب تک خلیفہ المستنصر باللہ کا فرمان تمہاری تائید میں نہ ہو"[۶۴]

چنانچہ صباء بن احمد نے مستنصر کی خدمت میں اپنے دو پیامبر القاضی حسین بن اسماعیل اجیہانی اور ابو عبد اللہ الطیب کو اپنی عرضداشت دے کر بھیجا۔[۶۵]

خلیفہ المستنصر باللہ فاطمی نے سیدہ حرہ کو لکھا کہ وہ داعی سباء بن احمد سے شادی کرے۔ اس نے یہ پیغام دے کر اپنی جانب سے اپنے استاذ کو جو "امین الدعوۃ" کے لقب سے ملقب تھے بھیجا اور انہیں ہدایت کی کہ اس باب میں وہ سیدہ حرہ سے گفتگو کر کے اسے ہموار کرنے کی کوشش کریں۔[۶۶]

خلیفہ کا قاصد جب سیدہ حرہ کے سامنے اس کے وزراء، امراء، اعیان اور رجال دولت کی موجودگی میں پہنچا تو اس نے اس طرح اسے مخاطب کیا۔

"امیر المومنین نے سیدہ حرہ، ملکہ رضیہ زکیہ، وحیدۂ زمن، سیدۂ ملوک یمن، عمدۃ الاسلام، ذخیرۂ دین، عصمت مسترشین، ولیۂ امیر المومنین کو اپنا سلام بھیجا ہے۔ اور لکھ دیا ہے۔

وماکان لمومن ولا مومنۃ اذا قضی اللہ ورسولہ امرًا ان یکون لھم الخیرۃ من امرھم ومن یعص اللہ ورسولہ فقد ضل ضلالاً مبینا۔

(یعنی اللہ اور رسول کسی امر میں جب کوئی فیصلہ کر دیں کسی مومن یا مومنہ کو اس باب میں کوئی اختیار باقی نہیں رہ جاتا جو اللہ اور رسولؐ کی نافرمانی کرتا ہے بلاشبہ وہ سخت گمراہ ہے)

مولانا امیر المومنین نے آپ کی شادی، عمدۃ الخلافۃ، امیر الامراء ابی حمیر سباء بن احمد بن المظفر علی الصلیحی سے ایک لاکھ دینار نقد اور پچاس ہزار دینار کے تحائف وغیرہ پر کر دی۔"

سیدہ حرّہ کو اس کے وزیر ذریع بن ابی الفتح اور القاضی حسین بن اسماعیل الیامی اور بعض دوسرے رجال دولت نے بھی داعی سبا بن احمد سے شادی کی صلاح دی۔ بہر حال سیدہ حرہ نے خلیفہ کی خوشنودی مزاج کی خاطر رشتۂ ازدواج قبول کرلیا۔[۷۶]

اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ خلیفہ مستنصر کا ارشاد نہ صرف مذہبی و سیاسی مسائل میں بلکہ ذاتی مسائل میں بھی حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا تھا اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس رشتۂ ازدواج کے معاملہ میں خلیفہ کی مداخلت اس لئے تھی کہ یمن کے امراء اور دعاۃ متحد رہیں، ان میں افتراق نہ پیدا ہو۔

شادی کے بعد سیّدہ حرّہ کا رتبہ خلیفہ کی نگاہ میں اور زیادہ اونچا ہوگیا۔ چنانچہ نہ صرف خلیفہ اسے خط لکھا کرتا تھا بلکہ خلیفہ کی والدہ اور بہن کی طرف سے بھی مراسلت کا سلسلہ جاری رہتا تھا اور خلیفہ کے اعتماد کا تو یہ عالم تھا کہ اس نے یمن کے علاوہ بلادِ ہند اور عمان کی تنظیم اور دعوت کی ذمہ داری بھی اسے سونپ دی۔[۷۸]

۴۸۷ھ میں خلیفہ المستنصر باللہ فاطمی کا انتقال ہوگیا۔ اس کی جگہ اس کا بیٹا ابوالقاسم احمد الملقب بہ المستعلی باللہ مسند آرائے خلافت ہوا۔ سیّدہ حرہ نے پورے جوش و خروش کے ساتھ اس کی تائید و حمایت کی۔ حالانکہ مصر میں اس کی خلافت پر اتفاق نہ تھا، کیونکہ افضل بن بدر جمالی نے مرحوم خلیفہ کے بڑے بیٹے اور ولی عہد نزار کو نظر انداز کر کے نزار کے چھوٹے بھائی ابوالقاسم احمد کے ہاتھ پر بیعت کرلی تھی۔ اس پر بے چینی پیدا ہوئی۔ اسکندریہ کے لوگوں نے خلیفۂ جدید کے خلاف، نزار کی حمایت میں بغاوت کردی لیکن افضل اس بغاوت پر غالب آگیا۔[۷۹]

صفر ۴۸۹ھ کو مستعلی نے سیدہ حرہ کو ایک خط لکھا اور اس بغاوت کی روداد بیان کی۔ اس طرح مستعلی کی والدہ نے بھی سیدہ حرّہ کو الگ سے ایک خط لکھا اور نزار کی بغاوت، گرفتاری اور افضل کی کامیابی کے حالات بیان کئے۔

یہ نزاع جو مصر میں برپا تھی اور جس نے دو فرقے نزاریہ اور مستعلیہ پیدا کر دیئے تھے یمن پر ذرا بھی اثر انداز نہیں ہوئی۔ یمن کے لوگ مستعلی کی خلافت کو تسلیم کرتے رہے۔

اس طرح فرقۂ نزاریہ کے مراکز بلاد مشرق میں قائم ہوئے۔ لیکن یمن میں اسے انصار میسر نہ آسکے۔ نزاریہ فرقہ کا سربراہ حسن بن صباح تھا۔ یہ نزار کی امامت کا داعی اور مستعلی کی امامت کا منکر تھا۔ اس فرقہ کو نہ صرف یمن میں انصار میسّر نہیں آئے بلکہ یہاں نزار کا نام ذرا بھی نہ چلا۔ مصر کے اسماعیلیوں کی اکثریت کا بھی یہی حال تھا۔

مصر کے نزاریوں نے مستعلی کی امامت نہیں قبول کی۔ وہ اس سے اور وزیر حکومت افضل سے گلو خلاصی کی برابر تدبیریں کرتے رہے لیکن جو خطّے فاطمی نفوذ کے دائرے میں تھے وہاں قدم نہیں جما سکے۔

البتہ فرقہ مستعلیہ نے مصر میں مضبوطی سے قدم جما لیے اور یمن میں بھی اس کا پرچم اقتدار و نفوذ لہراتا رہا کیونکہ سیدہ حرّہ نے مستعلی کی اطاعت کا قلادہ گلے میں ڈال لیا تھا۔ کوئی شبہ نہیں یمن میں نزاریہ کی ناکامی تمام تر رہین منت تھی سیّدہ حرّہ کی مساعی اور حسن تدبیر کا، یہی وجہ تھی کہ مصر میں تو اسماعیلیوں کے اندر افتراق پیدا ہو گیا لیکن یمن میں ان کی وحدت اور تنظیم ذرا بھی متاثر نہیں ہوئی۔

سیدہ حرہ نے بھی بڑے شان سے یمن میں دعوتِ فاطمیہ کا بوجھ اٹھا رکھا...
۴۹۲ھ میں ان کے شوہر سبا بن احمد کا انتقال ہوا تو اس کی جگہ المفضل...
بن الولید الحمیری کے حصّہ میں ولایت آئی۔[۵۲] سیدہ حرہ نے قیام امن...
میں اس کی بھی پوری مدد کی۔ مفضل کے عہد میں نقباء حصن تعکر کی...
نے بغاوت کردی اور ابراہیم بن زیدون کے ہاتھ پہ داعی اسماعیلیت کی...
حیثیت سے بیعت کرلی، قبیلہ خولان بھی اس جماعت سے مل گیا لیکن...
نے اس بغاوت کو کچل دیا۔[۵۳]

لیکن خولانیوں کے انضمام نے دعوتِ اسماعیلیہ کے خارجین کو ہر...
تقویت پہنچائی۔ ۵۰۴ھ میں ان لوگوں کے اور سیدہ حرّہ کے مابین باقا...
نزاع کی صورت پیدا ہوگئی۔ قاہرہ کی خلافتِ فاطمیہ نے سیدہ کا ساتھ...
خلیفہ آمر باحکام اللہ فاطمی نے داعی علی بن ابراہیم بن نجیب الدولہ کو یمن...
کہ وہ خارجین جماعت کے مقابلہ میں سیدہ حرّہ کی مدد کرے۔[۵۴] یہ داعی مذہب...
شیعہ کے اصول و فروع پر بہت وسیع اور گہری نظر رکھتا تھا۔

ابن نجیب الدولہ نے سیدہ حرّہ کے ساتھ پورے اخلاص اور...
ساتھ اشتراکِ عمل کیا اور بہت جلد بلادِ یمن کے کبار دعاۃ میں شمار ہونے...
پھر جب خلیفہ آمر کے عہد میں مامون بطائحی کو مصر میں وزارت ملی تو اس نے...
ابن نجیب کی شان و شوکت میں اور اضافہ کردیا۔[۵۵] لیکن بعد میں وہ سازش...
ہوا اور سیدہ بھی اسے قتل ہونے سے نہ بچا سکی۔ کیونکہ آمر کو غلط طور پر...
دلایا گیا تھا کہ وہ طائفۂ نزاریہ سے مل گیا ہے۔ یہ واقعہ ۵۲۱ھ کا ہے۔[۵۶]
خلفشار میں سیدہ حرّہ کے قاصد خاص محمد بن الازدی کو بھی جان سے ہاتھ دھو...

بنے جو سیدہ کا سفارشی خط لے کر مصر جاتے ہوئے سازشی لوگوں کا شکار ہو کر فوت ہو گیا تھا۔ اس کی جگہ سیدہ حرہ نے الداعی ابراہیم بن الحسین الحامد کو مقرر کیا۔[۹]

ان حوادث کے باوجود سیدہ حرہ کے اعتقاد جازم میں کوئی فرق نہیں آیا وہ خلیفہ آمر کو دل و جان سے خلیفہ مانتی رہی۔ دونوں میں خط و کتابت کا سلسلہ بھی جاری تھا۔

جہاں تک خلیفہ آمر کا تعلق تھا وہ بھی سیدہ حرہ کی قدر و اجلال میں کوئی کوتاہی روا نہ رکھتا تھا۔ وہ اسے اپنے بہترین اعوان میں شمار کرتا تھا کیونکہ نشر دعوت کے بارے میں اس کے بے پناہ اخلاص سے وہ بے حد متاثر تھا، اس کی یہ آرزو بھی تھی کہ اس کے بعد اس کی اولاد کے ساتھ بھی سیدہ کا طرزِ عمل یہی رہے، چنانچہ جب ربیع الاول ۵۲۴ھ میں اس کا بیٹا ابوالقاسم الطیب پیدا ہوا، اور خلیفہ نے اس کی ولی عہدی کا اعلان کیا تو سیدہ حرہ کو یہ خوش خبری بطور خاص بھیجی اور ترغیب دی کہ بلادِ یمن کے گوشہ گوشہ میں اس خبر کو پہنچا دے۔[۱۰]

---

[۱۰] ابن میسر نے تاریخ مصر (ص ۷۰۱) پر اس جشن مسرت کا ذکر کیا ہے جو اس سلسلہ میں منعقد ہوا تھا۔

شہر قاہرہ کے گلی کوچوں کو خوب آراستہ کیا گیا۔ بازاروں میں اور قصور و محلات کے دروازوں پر دلچسپیوں اور تفریحی پروگراموں کا زور و شور سے اجرا ہوا۔ عساکر کو لباس فاخرہ سے ملبوس کیا گیا۔ قصور و محلات کو خوب اچھی طرح آراستہ پیراستہ کیا گیا۔ آمر نے اپنے خزائن سے زرکار و زرنگار پارچہ جات اور آلات اور طلائی و نقرئی برتنوں کے ذخائر نکلوائے اور ان کی نمائش کی گئی۔ تمام ایوان کو پردوں اور اسلحہ سے ڈھانپ دیا گیا

(باقی بر صفحہ)

۵۲۴ھ میں خلیفہ آمر قتل کر دیا گیا۔ الامیر عبدالمجید ابن محمد بن المستنصر نے امام طیب کا معاملہ چھپا ڈالا۔ لوگوں نے اس کے ہاتھ پر بیعت کر لی کہ اگر خلیفہ کے حرم کے پیٹ سے لڑکا پیدا ہوا تو وہ خلیفہ ہوگا، لیکن لڑکی پیدا ہوئی۔ لہذا امیر عبدالمجید کی خلافت منتقل ہو گئی۔ اس نے "الحافظ" لقب اختیار کیا اور ۳ ربیع الاول ۵۲۶ھ کو اس کی خلافت کا اعلان ہو گیا۔[۵۱]

لیکن سیدہ حرّہ تمام حالات سے واقف تھیں، انہوں نے الحافظ کی خلافت کو باطل گردانا اور تسلیم نہیں کیا۔ الحافظ نے مکاتبت اور مراسلت کے ذریعہ انہیں رام کرنے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ کیونکہ سیّدہ امام طیب کی ولادت کے حال سے واقف تھیں اور برابر ان کی دعوت میں مصروف و منہمک رہیں۔[۵۲] وہ یمن میں خاندان مستعلی کی نقیب اور مذہب اسماعیلی کی علمبردار تھیں۔

لیکن بایں ہمہ خلیفہ الحافظ بھی مایوس نہیں تھا۔ اس نے یمن کے بعض شہروں اور عدن میں آل ذریع کو آلۂ کار بنا کر نشر دعوت میں کامیابی حاصل کر لی، اور معلوم ہے کہ نشر دعوت مستنصر کے سلسلہ میں آل ذریع کے جد عباس ابن المکرم اور داعی علی بن محمد الصلیحی، پھر اس کے بیٹے احمد المکرم نے کیسے نمایاں خدمات انجام دیئے تھے۔[۵۳]

عباس بن مکرم اور اس کے بھائی مسعود کو عدن کی ولایت سیدہ حرّہ کی طرف

(بقیہ حاشیہ از صفحہ) چودہ دن تک جشن کی یہی کیفیت رہی۔ پھر عقیقہ کے موقع پر ایک مینڈھا لایا گیا جو اعلیٰ درجہ کے دیباج اور ریشم سے آراستہ تھا۔ چاندی کے پٹے اس کے گلے میں پڑے ہوئے تھے۔ والد اور مولود کی موجودگی میں اسے ذبح کیا گیا۔ دینار نچھاور کئے گئے۔ ساری فضا عود و عنبر کے بخور کولوں سے معطر ہو گئی۔"

سے ملی تھی۔ یہ لوگ ہر سال ایک لاکھ دینار اس کی خدمت میں پیش کیا کرتے تھے عباس کے انتقال کے بعد اس کے بیٹے ذریع نے یہ عمل جاری رکھا۔ مسعود کی جگہ اس کے بیٹے ابوالمغارات کو جب ملی تو آل ذریع کو ہم نوا بنا کر سیدہ حرّہ کے خلاف بغاوت کرا دی۔ سیدہ کے وزیر المفضل بن ابی البرکات نے ان دونوں سے جنگ کی۔ آخر اس بات پر صلح ہو گئی کہ نصف خراج عدن سیدہ کی حکومت میں پیش کیا جایا کرے گا لیکن یہ صلح زیادہ عرصہ تک نہیں قائم رہی۔ بالاخر آل ذریع نے عدن کو سیدہ کے دائرہ اقتدار سے باہر نکال لیا[54]

اب آل ذریع نے خلیفہ الحافظ کی دعوت اپنے ہاتھ میں لے لی۔

اس طرح یمن میں اسماعیلیہ کے دو طائفے بن گئے۔ ایک کی سربراہ سیدہ حرّہ تھیں جو امام طیب کی دعوت دیتا تھا۔ دوسرے کے علمبردار آل ذریع تھے جو الحافظ کے لئے برسرِ کار تھے۔

۵۳۲ھ میں سیدہ حرّہ کا انتقال ہو گیا۔ اس سے دعوتِ طیبہ کمزور ہو گئی کیونکہ صلیحیین میں کوئی ایسی موثر قوت نہیں تھی جو اس کی جانشینی کر سکتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آل ذریع کے سردار محمد بن بہار الدین نے صلیحیوں کے تمام قلعوں اور ذخائر پر قبضہ کر لیا۔ سیدہ کا وزیر منصور بن المفضل بن ابی البرکات بھی کچھ نہ کر سکا۔ اس طرح آل ذریع کا نفوذ اور بڑھ گیا اور وہ خلافت فاطمیہ مصر کے نقیب بن گئے[55]۔ اور ہر سال گراں قدر رقم مصر بھیجنے لگے۔[56]

۵۴۸ھ میں محمد بن سبا کی وفات ہو گئی۔ جس کا نتیجہ عدن میں بنو ذریع کے اختلال کی صورت میں رونما ہوا اور یہ اختلال وضعف اس کے بیٹے عمران کے عہد میں اور بڑھ گیا۔ اس نے یاسر بن بلال کو اپنا وزیر بنا لیا۔ پھر جب ۵۶۰ھ

یمن عمران کا انتقال ہوا تو یاسر فرمانروا بن گیا اور بنو زریع کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔[۴۴]

۵۶۷ھ میں صلاح الدین ایوبی نے خلافتِ فاطمیہ کا خاتمہ کردیا۔ چنانچہ یمن میں بھی یہ تحریک زوال آشنا ہوگئی۔ صلاح الدین کی آرزو تھی کہ ان تمام مقامات پر قبضہ کرلے جو فاطمیوں کے ماتحت تھے۔ چنانچہ سب سے پہلے اس نے یمن کی طرف توجہ کی۔[۴۵] اس نے اپنے بھائی امیر شمس الدولہ توران شاہ کو ۵۶۹ھ میں اس مہم پر روانہ کیا۔ توران شاہ جب یہاں پہنچا تو اس نے سب سے پہلے زبیعہ کے بنو مہدی پر ہاتھ صاف کیا جو فاطمیین کے حامی و ناصر تھے۔[۴۶] توران شاہ نے عبدالنبی بن مہدی کو اس جرم میں گرفتار کرلیا کہ اس نے عباسی خطبہ بند کردیا تھا اور زبید پر قبضہ کرلیا۔ پھر صنعاء فتح کرلیا۔ پھر عدن کا مورچہ سر کیا اور یاسر بن بلال کو شکست دی اور عدن کو اپنے ممالک محروسہ میں شامل کرلیا۔

ان کاموں سے فارغ ہوکر وہ زبید واپس آیا اور قلعہ تعز پر جو ناقابلِ تسخیر خیال کیا جاتا تھا قبضہ کرلیا۔ تھوڑی ہی مدت میں اس نے یمن کے بڑے حصہ پر قبضہ کرلیا۔[۴۷] اور "الملک المعظم" کا لقب اختیار کرکے فرمانروائی شروع کردی۔ خلیفہ المستضی بامر اللہ عباسی کے بعد خطبہ میں اس کا نام بھی لیا جانے لگا۔[۴۸] اس نے سیف الدولہ مبارک ابن منقذ کو زبید کا اور عز الدین عثمان بن الزنجبیلی کو عدن کا والی بنایا۔ اور خود مصر واپس آگیا یہ واقعہ ۵۷۱ھ کا ہے۔[۴۹]

ماخذ و حواشی

۱۔ عمارۃ الیمنی: تاریخ الیمن ص ۳

۲۔ ابن خلدون: ج ۴ ص ۲۱۲

۳- عمارۃ الیمنی : تاریخ الیمن ص ۴

۴- یحییٰ کا سلسلۂ نسب یہ ہے۔

یحییٰ بن الحسین بن القاسم الرسی بن ابراہیم طباطبا بن اسماعیل بن ابراہیم بن الحسن بن الحسن بن علی بن ابی طالب۔

(ابن حزم : جمہرۃ انساب العرب ص ۲۸)

۵- ابن خلدون : ج ۴ ص ۲۱۳

نیز Kay, Yeman, Its early Mediaeval History P.242

صعدہ - صنعاء سے ساٹھ فرسخ پر واقع ہے (القلقشندی : صبح الاعشیٰ ج ۵ ص ۴۲)

۶- حمص کا ایک علاقہ (یاقوت : معجم البلدان)

۷- Kay, Yeman, Its Early Mediaeval History P. 225

۸- ابن خلدون : ج ۴ ص ۳۰، ۳۱

نیز، المقریزی : اتعاظ الحنفا ص ۶۷، ۶۸

۹- الحمادی الیمانی : اسرار الباطنیہ و اخبار القرامطہ ص ۲۷، ۲۸

۱۰- ابن الاثیر : ج ۸ ص ۱۰، ۱۱ نیز، المقریزی : اتعاظ الحنفا ص ۶۸، ۶۹، ۷۴، ۷۷

۱۱- المقریزی : المواعظ والاعتبار بذکر الخطط والآثار ج ۲، ص ۱۱

۱۲- ابن خلدون : ج ۴، ص ۳۳

۱۳- الیمانی : سیرت جعفر الحاجب ص ۱۱۰ (مجلہ کلیۃ الآداب دسمبر ۱۹۳۶ء)

۱۴- ابن الاثیر : الکامل فی التاریخ : ج ۸ ص ۱۲

۱۵- البہاء الجندی : اخبار القرامطہ بالیمن المنقول من کتاب السلوک فی طبقات العلماء والملوک ص ۱۴۲

۱۶- ابن خلدون : ج ۴ ص ۶۹

۱۷- المقریزی ، اتعاظ الحنفا ص ۶۹

۱۸- الیمانی : سیرة جعفر ابی الحاجب «مجلة کلیة الآداب» دسمبر ۱۹۳۶ء ص ۱۱۴-۱۱۵

۱۹- الیمانی : سیرة جعفر الحاجب ص ۱۱۵

۲۰- ابن المؤید الیمانی : انباء الزمن فی اخبار الیمن ورق ۲۱

۲۱- الحمادی الیمانی : اسرار الباطنیة واخبار القرامطہ ص ۳۲

۲۲- الحمادی الیمانی : اسرار الباطنیة واخبار القرامطہ ص ۳۵، ۳۶

۲۳- الحمادی الیمانی : اسرار الباطنیہ واخبار القرامطہ ص ۳۶، ۳۹

۲۴- الحمادی الیمانی : اسرار الباطنیة واخبار القرامطہ ص ۳۹

۲۵- البهاء الجندی : اخبار القرامطہ بالیمن المنقول من کتاب السلوک فی طبقات العلماء والملوک ...

۲۶- الحمادی الیمانی : اسرار الباطنیة واخبار القرامطہ ص ۴۰

۲۷- الحمادی الیمانی : اسرار الباطنیة واخبار القرامطہ ص ۴۰

۲۸- البهاء الجندی: اخبار القرامطہ بالیمن المنقول من کتاب السلوک فی طبقات العلماء والملوک ...

۲۹- الحمادی الیمانی ، اسرار الباطنیہ واخبار القرامطہ ص ۴۱

۳۰- البهاء الجندی: اخبار القرامطہ بالیمن المنقول من کتاب السلوک فی طبقات العلماء والملوک ...

۳۱- العرشی : بلوغ المرام فی شرح مسک الختام ص ۲۴

۳۲- الدیبع الشیبانی : قرة العیون فی تاریخ الیمن المیمون ورق ۱۶

۳۳- البهاء الجندی : اخبار القرامطہ بالیمن المنقول من کتاب السلوک فی طبقات العلماء والملوک ...

۳۴- الدیبع الشیبانی : قرة العیون فی تاریخ الیمن المیمون ورق ۱۷

۳۵- النفوذ الفاطمیین فی العرب ص ۷۱

۳۶- البهاء الجندی : اخبار القرامطہ بالیمن المنقول من کتاب السلوک فی طبقات العلماء والملوک ...

۳۷۔ نسبت ہے اصلوح کی طرف جو یمن کی ایک بستی ہے۔
(بلوغ المرام فی شرح مسک الختام ص ۲۲)

۳۸۔ عمارۃ الیمنی : تاریخ الیمن ص ۱۸

۳۹۔ العرشی : بلوغ المرام فی شرح مسک الختام ص ۲۴

۴۰۔ عمارۃ الیمنی، تاریخ الیمن ص ۱۱، ۱۲ نیز، ابن المجاور : تاریخ ابن المجاور ورق ۸۶

۴۱۔ بامخرمہ : المختار فی تاریخ عدن ورق ۱۲۷

۴۲۔ ابن خلدون : ج ۴ ص ۲۱۴

نیز O'Leary A Short History of the Fatimid Khalifate P. 202

۴۳۔ دھلک بحرین کے ایک جزیرہ کا نام ہے (یاقوت، معجم البلدان)

۴۴۔ الدیبع الشیبانی : قرۃ العیون فی تاریخ الیمن المیمون

۴۵۔ عمارۃ الیمنی : تاریخ الیمن ص ۱۰

۴۶۔ عرشی : بلوغ المرام فی شرح مسک الختام ص ۲۰

۴۷۔ بامخرمہ : المختار من ثغر عدن ورق ۱۳۹-۱۴۰

۴۸۔ عمارۃ الیمنی، تاریخ الیمن ص ۱۹

۴۹۔ Bulletin School of oriental studies (Letter of Al-mustansir P. 313

۵۰۔ B.S.O.S. Vol VII Part 2 1934 P. 312, 313

۵۱۔ B.S.O.S. 1934 Vol VII Part 2 P. 312

۵۲۔ B.S.O.S. 1934 Vol VII Part 2 P. 3.9

۵۳۔ عمارۃ الیمنی : تاریخ الیمن، ص ۲۲۔ نیز ابن المؤید الیمنی : انباء الزمن فی اخبار الیمن ص

۵۴- B.S.O.S. 1934 vol VII Part 2 P. 319

۵۵- عمارۃ الیمنی: تاریخ الیمن ص ۲۶، ۲۷

۵۶- B.S.O.S. 1934 vol VII Part 2 P 323

۵۷- عمارۃ الیمنی: تاریخ الیمن ص ۲۹

۵۸- B.S.O.S. 1934, vol VII Part P. 317، 318

۵۹- B.S.O.S. 1934, vol VII Part 2 P.316

۶۰- B.S.O.S. 1934 vol VII part 2 P. 316

۶۱- B.S.O.S. 1934 vol VII part2 P. 319

۶۲- B.S.O.S. 1934 vol VII part 2 P. 318, 319

۶۳- B.S.O.S. 1934 vol VII Part 2 P. 321

۶۴- الدیبع الشیبانی: قرۃ العیون فی تاریخ الیمن المیمون ورق ۲۵

۶۵- عمارۃ الیمنی: تاریخ الیمن ص ۳۲

۶۶- ابن المؤید الیمنی، انباء الزمن فی اخبار الیمن ص ۴۳

۶۷- الدیبع الشیبانی: قرۃ العیون فی تاریخ الیمن المیمون ورق ۲۵

۶۸- B.S.O.S. 1934 vol VII part 2 P.321

۶۹- ابن میسر، تاریخ مصر ص ۳۵، ۳۶

۷۰- B.S.O.S. 1934 vol VII Part 2 P. 318

۷۱- ابن میسر: تاریخ مصر ص ۲۵

۷۲- الدیبع الشیبانی: قرۃ العیون فی تاریخ الیمن المیمون ورق ۲۵

۷۳- ایک قلعہ کا نام ہے (یاقوت: معجم البلدان)

۷۴- ابن خلدون: ج ۴ ص ۲۱۶، ۲۲۲

۷۵ - Encyclopaedia of Islam V4. P. 517

۷۶ - عمارة الیمنی : تاریخ الیمن ص ۴۳-۴۴
نیز الدیبع الشیبانی : قرة العیون فی تاریخ الیمن المیمون ورق ۲۷

۷۷ - ابن المؤید الیمنی : انبار الزمن فی تاریخ الیمن ص ۷۷

۷۸ - عمارة الیمنی : تاریخ الیمن ص ۴۷، ۴۸ نیز ابن میسر : تاریخ مصر ص ۷۰

۷۹ - Kay, Yaman, Its Early Mediaeval History P. 298

۸۱ - ابن میسر : تاریخ مصر ص ۷۴، ۷۵

۸۲ - عمارة الیمنی : تاریخ الیمن ص ۱۰۴

۸۳ - تاریخ ابن المجاور، حصہ اوّل ورق ۹۸ نیز عمارة الیمنی : تاریخ یمن ص ۴۸

۸۴ - تاریخ ابن المجاور، حصہ اوّل، ورق ۹۹

۸۵ - المقریزی : الخطط ج ۲ ص ۱۷۴

۸۶ - تاریخ ابن المجاور : حصہ دوم، ورق ۱۰۳

۸۷ - ابن خلدون : ج ۴ ص ۲۴۹

۸۸ - صلاح الدین کی نظر یمن پر اس لئے پڑی کہ نور الدین زنگی سے اسے اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ وہ مصر کی حکومت اس سے چھین لے گا۔

۸۹ - ابو المحاسن : النجوم الزاہرہ ج ۲ ص ۶۹ و المقریزی : السلوک لمعرفة دول الملوک ج ۱ حصہ اوّل ص ۵۲، ۵۳

۹۰ - ابن الاثیر : الکامل فی التاریخ ج ۱۱ ص ۱۴۸، ۱۴۹

۹۱ - المقریزی : السلوک لمعرفة دول الملوک ج ۱ حصہ اوّل، ص ۵۲

۹۲ - ابن الاثیر : الکامل فی التاریخ ج ۱۱ ص ۱۴۹

سسلی (صقلیہ) پر فاطمیوں کا قبضہ اور تسلّط

○

مسلمانوں کی فتح افریقیہ کے ساتھ ہی یعنی ۴۴ھ سے تسخیر صقلیہ کے لئے مہمات کا سلسلہ شروع ہو گیا گو وہ کامیاب نہ ہو سکا۔

سنہ ۲۱۲ھ میں زیادۃ اللہ (اوّل) متوفی سنہ ۲۲۳ھ کی فوج صقلیہ کے مقام مزدا پر اترنے میں کامیاب ہوئی اور سرقوسہ کے قلعہ بند شہر تک بڑھتی چلی گئی لیکن وبا پھوٹ پڑنے کے باعث اسے پیچھے ہٹنا پڑا۔ متعدد لڑائیوں کے بعد مسلمانوں نے بلرم (پلرمو) پر قبضہ کر لیا۔ یہاں سے صقلیہ کے دوسرے شہروں کی تسخیر کا سلسلہ شروع ہوا۔ بالآخر سنہ ۲۶۵ھ میں ایک اغلبی حکمران ابراہیم ثانی نے سرقوسہ فتح کرکے اٹنا کے تمام علاقے زیرِ نگیں کر لئے۔ سنہ ۲۹۰ھ میں صقلیہ کی فتح مکمل ہو گئی۔

پھر فاطمیوں نے جب بنو اغلب کے مقبوضات کو فتح کیا تو سنہ ۲۹۷ھ میں صقلیہ پر بھی ان کا پرچم لہرانے لگا۔[۵]

سنہ ۳۰۱ھ میں فاطمیوں کے خلاف بغاوت ہوئی۔ یہ بغاوت کافی زور دار تھی۔ لیکن فاطمی حکومت بھی کمزور نہیں تھی۔ اس نے آسانی کے ساتھ اسے کچل دیا۔

جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۳۰۵ھ میں صقلیہ ایک مرتبہ فاطمی حکومت کا محکوم اور باجگذار بن گیا۔

مہدی اور قائم کے عہد تک تو صقلیہ میں امن و امان رہا لیکن منصور کے ابتدائی زمانے میں یہاں کا برسرِ اقتدار طبقہ جنگ باہمی میں مبتلا ہو گیا۔ جس کے باعث ملک فتنہ و فساد کی آماجگاہ بن گیا۔ جب منصور کو یہ خبر پہنچی تو اس نے ۳۳۶ھ میں ابوالحسن بن علی کو صقلیہ کا والی مقرر کیا۔ یہاں سے صقلیہ کا بہترین اور مبارک ترین دور شروع ہوتا ہے۔ حسن بن علی بنو کلب سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے عہد میں صقلیہ نے تہذیب و تمدن کے ہر شعبے میں نمایاں ترقی کی جسے بعد میں نارمنوں نے بھی جاری رکھا۔ اس والی نے اپنی دانشمندی اور مصلحت اندیشی سے عربوں اور بربریوں کے درمیان اتحاد کے ذریعے پیدا کئے اور ایک باضابطہ حکومت کی بنیاد استوار کرنے کی کوشش کی۔

صقلیہ کے اکثر شہروں پر فاطمیوں نے قبضہ کر لیا تھا۔ اس جزیرے کے بعض قلعے ایسے بھی تھے جو نصاریٰ کے قبضے میں تھے۔ یہ قلعے ساحل بحر پر واقع تھے۔ ان میں سے قلعہ طرمین کو والی صقلیہ احمد بن حسن بن علی بن ابوالحسن نے ۳۵۱ھ میں فتح کیا اور اس کا نام معز کے لقب کی مناسبت سے معزیہ رکھا۔ اس کے بعد احمد نے رمطہ کا محاصرہ کیا۔ عیسائیوں نے اپنے بادشاہ سے مدد چاہی۔ اس نے بری اور بحری فوجیں ان کی مدد کے لئے رمطہ کو روانہ کیں۔

فریقین میں سخت لڑائی ہوئی جس میں عیسائیوں کے بڑے بڑے سردار مارے گئے۔ یہاں تک کہ ان کا سپہ سالار بھی مارا گیا۔ دشمن کو زبردست شکست ہوئی۔

مسلمانوں نے خندق عبور کر کے نصاریٰ کے کئی جنگی جہاز ڈبو دیئے۔ اور امطہ پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد دوسرے اور شہروں پر حملہ کیا اور بہت سا مال بار... لوٹ لیا۔ آخر میں روم کو جزیہ ادا کرنے کی شرط پر صلح کرنا پڑی۔ یہ ۳۵۴ھ کا واقعہ ہے۔[۶]

ماخذ و حواشی

۱۔ تاریخ فاطمیین مصر، ص ۸۲

۲۔ ابن خلدون؛ ج ۴ ص ۲۰۷

۳۔ Becker کے مضمون "مطالعۂ اسلام" کا ترجمہ از پروفیسر جلیل الرحمن در رسالۂ ...

۴۔ معجم البلدان: ج ۴ ص ۵۳۵

۵۔ تاریخ مصر الحدیث (جرجی زیدان) ص ۲۱۴

۶۔ تاریخ فاطمیین مصر ص ۱۲۰

فرانس اور اٹلی پر فاطمیوں کی یلغار

○

ہدی کے بعد اس کا بڑا بیٹا القائم اس کا جانشین ہوا۔ اس نے فرانس کے جنوبی ساحل پر یورش کی، جنوا[2] کی ناکہ بندی کی اور اس پر قبضہ کر لیا۔ اس نے کلابیریا (Calabria) کے ساحل پر چھاپے مارے، رزم آراؤں کو قتل کیا، ایران جنگ غلام بنا کر اپنے ساتھ لے گیا۔[3]

ماخذ و حواشی

۱۔ ۹۳۴ء تا ۹۴۶ء

۲۔ یہ "جنیوا" نہیں، "جنوا" ہے۔ جو اطالیہ میں واقع ہے۔ غلطی سے اسے "جنیوا" ہی پر زبان زد ہے — لکھا اور پڑھا جاتا ہے۔

۳۔ اسلامی فن تعمیر از ارنسٹ ٹاڈھیام رچمنڈ، سابق اسسٹنٹ آرکیٹکٹ برائے مجلس تحفظ ... ، شائع کردہ انجمن ترقی اردو علی گڑھ (انڈیا) جنوری ۱۹۵۲ء۔ ص ۱۱۹

فاطمی حکومت کا آفتابِ اقبال

اٹلانٹک سے بحرِ قلزم تک تسلط اور قبضے کی داستان

○

مشہور مورخ فلپ ہتی نے اپنی کتاب "لبنان کی تاریخ" میں فاطمیوں کے عہد سطوت و اقتدار کا ذکر بھی کیا ہے۔

اس بحث پر آغازِ سخن کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے:-

یہ محض ایک سلطنت نہ تھی بلکہ ایک جداگانہ خلافت تھی۔ جس نے خلافت بغداد کی حیثیت ہی کو معرضِ بحث میں ڈال دیا تھا۔[1] ایک وقت تو ایسا بھی آگیا تھا کہ یہ خلافتِ بغداد کو تباہ کر کے اس کی جگہ لینے والی تھی۔ اس حکومت کا بانی عبیداللہ سلمیہ تھا۔ تونیسیا میں اس نے المہدیہ کے نام سے نیا دارالحکومت بنایا جہاں ۹۰۹ء سے ۹۳۴ء تک حکومت کرتا رہا۔ اس کے تیسرے جانشین المعز نے مرکزِ حکومت مصر میں منتقل کر دیا۔[2] وہاں اس کے ظفرمند سالار جوہر نے، جو نسلاً سسلی کا ایک غلام اور مذہباً مسیحی تھا، نئے دارالحکومت القاہرہ کی بنیاد رکھی۔ جوہر ہی نے شہرۂ آفاق ازہر یونیورسٹی اور مسجد تعمیر کرائی۔ اسی سالار یعنی جوہر نے ...

سلطنت کی حد لبنانی ساحل تک پہنچا دی۔

صرف اسی پر اکتفا نہ کیا گیا بلکہ اخشیدیوں کو، اس نے مصر اور شام سے نکال دیا۔ العزیز کے دور میں فاطمی سلطنت نقطۂ عروج پہ پہنچ گئی۔ اس کی حکمرانی اٹلانٹک سے بحیرۂ قلزم تک پھیلی ہوئی تھی۔ حجاز، یمن اور موصل بھی اس میں شامل تھے۔ اسی العزیز کا بیٹا اور جانشین الحاکم تھا۔ جس سے دروزیوں کی تحریک چلی۔"

اسی مورخ نے اپنی ایک دوسری کتاب "تاریخ شام" میں اس عنوان پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے۔

عباسی خلافت کی طرح فاطمی خلافت کے ظہور کو بھی شام سے گہرا تعلق ہے حماہ کے جنوب مشرق میں سلمیہ نام ایک غیر معروف اور الگ تھلگ قصبہ ہے یہی قصبہ نویں صدی کے اواخر میں اسمٰعیلی امام کی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا۔ اس کا نام محمد الحبیب تھا اور اس کے پیروؤں کا عقیدہ یہ تھا کہ وہ امام جعفر صادقؑ کے فرزند اسماعیلؑ کا پوتا ہے۔ امام جعفرؑ، امام حسینؑ کی اولاد تھے۔ حبیب نے اپنے خفیہ کارندے پوری اسلامی دنیا میں پھیلا دیئے تھے۔ ان کا کام یہ تھا کہ سنی قوت پر ضرب لگائیں اور حقیقی اسلام یعنی شیعیت کے قیام کے لئے راستہ صاف کریں۔ اسلام کی سیاسی تاریخ میں عباسیوں کے بعد موثر اور خوفناک پراپیگنڈے کا یہ دوسرا انتظام تھا۔

عباسی حکومت کے حامی مؤرخ فاطمیوں کے دعوے صحت نسب کی مذمت کرتے ہیں۔ موجودہ دور کے متعدد یورپی علماء اس شجرۂ نسب کی صحت کے قائل ہیں۔

ماخذ و حواشی

۱۔ تاریخ لبنان ص ۲۷۳

۲۔ حمص کے قریب ایک مقام کا نام ہے۔

۳- سنہ ۹۵۲ھ تا سنہ ۹۷۴ھ

۴- سنہ ۹۳۷ھ

۵- سنہ ۹۶۹ھ

۶- سنہ ۹۷۶ھ تا سنہ ۹۹۴ھ

۷- سنہ ۹۹۶ھ تا سنہ ۱۰۲۱ھ

۸- تاریخ شام - ص ۴۶۷

فاطمیوں کے عہد میں

تہذیب و تمدّن اور ثقافت و حضارت کا عروج

حرفِ آغاز

فاطمیوں نے اپنے عہد اقتدار میں علمی، تعمیری، ثقافتی، تہذیبی، تمدنی، معاشرتی، صنعتی اور حرفتی میدانوں میں سرگرمیاں دکھائیں۔ اور لازوال کارنامے انجام دیئے۔ صرف اس عنوان پر ایک سے زائد ضخیم مجلدات تیار ہو سکتے ہیں۔ محققین اور مورخین نے بھی فاطمیوں کے ان کارناموں کا وقعت اور احترام کے ساتھ ذکر کیا ہے اور کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔

مصر کے مایۂ ناز مورخ حسن ابراہیم حسن نے اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"بنو فاطمہ ایک وسیع حکومت اور ایک عظیم الشان تمدن کی بنیاد ڈالنے میں کامیاب ہوئے جس کی نظیر مشرق میں ان سے پہلے بہت کم ملتی ہے۔ یہ تمدن اپنے مختلف شعبوں کی مستحکم تنظیم، فوجوں اور جنگی جہازوں کی آراستگی عدالت اور رواداری میں مشہور رہے۔ ان سب سے اہم اس کی علم اور ثقافت کی وہ تائید اور امداد ہے جسے سب جانتے ہیں۔ اس تمدن کے بعض آثار اب بھی باقی ہیں[1]"

موسیو لیبان مقلیہ کے اسلامی تہذیب وتمدن کے متعلق لکھتے ہیں:۔

[1]عربوں کے زمانے میں صقلیہ کی علمی، حرفتی اور اخلاقی حالت اس سے زیادہ عروج پر تھی جو ان کے جانے کے بعد رہ گئی۔ تمدن کی عمدگی کا اندازہ اس طرح ہوتا ہے کہ اس سے غیر اقوام کو کیا فائدہ پہنچا۔ اور جب ہم صقلیہ کے عربی تمدن کو اس نظر سے دیکھیں تو اس کی قدر معلوم ہوتی ہے۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ جو امور عام معاشرت سے متعلق تھے۔ مثلاً معاملاتِ جائداد و وراثت وغیرہ ان کو عربوں نے رسم و رواج ملک کے مطابق ٹھہرا دیا تھا تاکہ نارمن بھی بالالتزام انہی قواعد کی پابندی کرتے رہتے۔ عربوں کی علمی اور صنعتی اور حرفتی خوبیاں ایسی مسلم تھیں کہ نارمن بادشاہوں نے انہیں ہر طرح چین دے رکھا تھا۔ خود راہب ان کے عقل و شعور کی قدر کرتے، اگرچہ وہ ان کی ایجادوں اور کاریگریوں کو شیطان کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ منجملہ بہت سے عجیب بیانات کے جو عربوں کے متعلق لاطینی تاریخوں میں لکھے گئے ہیں ہم مندرجہ ذیل واقعہ کو نقل کرتے ہیں جس سے عیسائیوں کی رائے اپنے مذہبی دشمنوں کی بابت ظاہر ہوگی۔ مؤرخ لکھتا ہے:-

رابرٹ وسکاڈ کو اپنی فوج کشی کے زمانہ میں ایک مورت ملی جو سنگِ مرمر کے ستون پر نصب تھی اور اس کے سر پر کانسی کا حلقہ تھا جن پر یہ الفاظ کندہ تھے (یکم مئی کو غروبِ آفتاب کے وقت میرے سر پر سونے کا تاج ہوگا) کوئی شخص ان الفاظ کے معنی نہ سمجھ سکا۔ لیکن صقلیہ کے ایک مسلمان نے جو قید تھا۔ رابرٹ سے کہا کہ میں ان الفاظ کے معنی سمجھ گیا ہوں اگر تو مجھے قید سے رہا کرے تو میں بتادوں۔ جب رابرٹ نے اسے صقلیہ پہنچ کر چھوڑ دینے کا وعدہ کیا تو اس نے کہا کہ یکم مئی کو غروب آفتاب کے وقت اس مورت کا سایہ جہاں تک پہنچے، اس مقام پر کھودا جائے چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور ایک بہت بڑا دفینہ رابرٹ کے ہاتھ لگا۔[2]

اسی طرح مسٹر اسکاٹ نے جو کچھ لکھا ہے اس کا ملخص درج ذیل ہے:-

"پلرمو کے تکلفات بہت ہی بڑھے ہوئے تھے، جرمنی، اٹلی، فرانس اور انگلستان کی خانگی اور تمدنی حالت کا اندازہ مسلمانان صقلیہ سے کیا جائے تو مقدم الذکر نہایت پست حالت میں تھے۔ انہی چیزوں سے کسی قوم کی ترقی خوش حالی اور خوش دلی کا اندازہ لگ سکتا ہے۔

صقلیہ کی تہذیب کا نارمنوں پر جو اثر پڑا وہ بالکل ویسا ہی تھا، جیسا کہ روم کا اثر دوسری ناتراشیدہ اور وحشی قوموں پر پڑا تھا۔ نارمن اپنی مسلمان رعایا سے ہر طرح سبق لینے پر نہ صرف تیار ہی تھے بلکہ سخت منتظر تھے۔ یہ لوگ تہذیب کے لطف و فوائد سے واقف ہو چکے تھے اور ان کی قدر کرتے تھے مگر اب تک خود ان سے مستفید نہیں ہوئے تھے۔ نارمن گو فاتح تھے، تاہم مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کو تفوق حاصل رہا۔ جو اصول حکمرانی مسلمان امراء نے قائم کیا تھا اسی کو نارمنوں نے قائم رکھا۔ وزراء و حکام دیوانی و فوجداری سب مسلمان ہوتے تھے۔ یہی محکمۂ مال و خزانہ کے مہتمم تھے اور یہی عدل و انصاف کے ناظر۔ یہ تسلیم کر لیا گیا تھا کہ تمام لوگوں کی زبان عربی ہے اسی کو وہ بولیں اور اسی میں رسل و رسائل کریں۔ قانون و دستور العمل جتنے نکلتے تھے وہ زبان عرب میں ہوتے تھے۔ اصطلاحات قانونی و زبان عدالت بھی عربی ہی تھی۔ لباس، رسوم، درباروں کے آداب، آپس کے میل جول کے اخلاق سب ایشیائی تھے۔ شاہی خاندان کے تمام رسوم ان کے سانچے میں ڈھلے ہوتے تھے۔ دلائل و براہین کے زور سے یا کفار مسلمانوں کے عادات و اخلاق و تہذیب کے اثر سے عیسائی اکثر مسلمان ہوتے رہتے تھے۔"

ہاربرٹ برنارٹ اپنی کتاب "ارتقائے انسانی" میں لکھتا ہے:۔

"صقلیہ کا معاملہ ایسا ہی تھا بارھویں صدی کے وسط تک یہ جزیرہ اسلامی تہذیب و تمدن کا گہوارہ تھا۔ مسلمانوں کے عہد حکومت کے بعد یہاں عیسائی حکمران ایک عرصہ تک اسلامی طور و طریق اختیار کئے رہے۔ بڑے بڑے

معززاور بااختیار عہدوں پر مسلمانوں کو متعین کیا۔ صقلیہ کا طرزِ حکومت تمام یورپ کے لئے ایک نمونہ تھا۔ نارمن چونکہ بیک وقت صقلیہ اور انگلستان پر حکمران تھے، اور ان کا آپس میں میل جول بھی رہتا تھا۔ اس لئے تمدن اسلامی کے بہت سے اثرات براہ راست صقلیہ کے جزائر برطانیہ تک پہنچ گئے تھے۔

اس موضوع پر اگر بسط و تفصیل سے گفتگو کی جائے تو ہزاروں صفحات رنگے جا سکتے ہیں۔ اور ضخیم ضخیم مجلدات تیار ہو سکتی ہیں۔ لیکن ہمیں صرف ایک ہی موضوع پر گفتگو نہیں کرنی ہے بلکہ فاطمی عہدِ خلافت کے تمام پہلوؤں کو پیش نظر رکھنا ہے لہٰذا ایجاز و اجمال سے کام لئے بغیر چارہ نہیں۔

آئندہ صفحات میں موضوع زیرِ بحث سے متعلق اہم پہلوؤں پر جداگانہ ابواب کے تحت گفتگو کی جائے گی۔

ماخذ و حواشی

۱۔ الفاطمیون فی مصر، ص ۳۱۵

۲۔ تمدن عرب، ص ۲۸۱۔۲۸۴

۳۔ الاخبار الاندلس ج ۲ ص ۶۴

۴۔ روزنامہ زمیندار، لاہور، ۲ نومبر ۱۹۲۳ء، بحوالہ تاریخ صقلیہ ص ۴۱۷

معاشرت

○

"تاریخ صقلیہ" میں اس موضوع پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا گیا ہے :-

اہل صقلیہ اپنے مکانوں کو آراستہ پیراستہ رکھتے، مکانوں کے قطعے دلآویز نکالتے، ان کے سامنے کھلے ہوئے صحن ہوتے جن میں خوشبودار پھولوں کے تختے لگے ہوتے، جابجا فوارے چھوٹتے ہوتے، جابجا روشیں قائم ہوتیں۔ بگنبدیوں سے الگ الگ ٹکڑے نکالتے جن میں نہایت سلیقہ سے پانی پہنچایا جاتا۔ چھوٹی چھوٹی نہریں عمارتوں کے اردگرد چکر کاٹتیں، صحن باغ کے علاوہ مکانوں کے اندر بھی پائیں باغ ہوتے اور مکانوں کے اندر جابجا گلدستے چنے جاتے، کمروں میں فرش وفروش کا اہتمام ہوتا، اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کے سامانِ آرائش سے کمرے سجے ہوتے۔

صاحب کتاب ہیئۃ اشکال العرض نے باشندگان صقلیہ کی عمارتوں کے قیمتی سامانِ آرائش کا تذکرہ کرنے کے علاوہ ان کے عام طرز بود و ماند وضع وقطع اور لباس میں خوش پوشی اور کھانوں میں خوش مذاقی کو خصوصیت سے سراہا ہے۔ اسی طرح ابن جبیر نے صقلیہ کے آراستہ وپیراستہ مکانوں کے ذکر کے علاوہ مسلمانوں کے نفیس ملبوسات کو "لباسِ فاخرہ" سے موسوم کیا ہے

کہ یہاں کے امراء زرق برق لباسوں میں نظر آتے، اسی طرح خدم وخ...
چوبدار ودربان اور تمام دیگر مشرقی آداب وتہذیب کی جلوہ آرائیاں موجو...
تھیں۔ نارمنوں کے عہد میں بھی شہر کی معزز آبادی میں مسلمانوں کا طرز معا...
ہی قابل اتباع سمجھا جاتا تھا؛ مسٹر اسکاٹ یہاں کے تمدن کا اعلےٰ نمونہ...
الفاظ میں پیش کرنے کے بعد غربا کے طبقہ کی معاشرت کو ان الفاظ...
سراہتے ہیں۔

"غربا کے مکانات اچھی وسعت وآرام کے ہوتے تھے اور وہ ایسے بھی ہوں، بہرحال لندن اور پیرس کے اس زمانہ کے غربا کے مکانوں سے بدرجہا بہتر تھے۔

پلرمو کے سوداگروں کے مکانات ہر طرح محلات شاہی سے بڑھے ہوتے تھے، وہاں کے باشندے پرانے سارنیرس کے رہنے والوں سے کسی طرح ترفہ وتنعم میں کم نہ تھے۔ اور ثروت اور تہذیب، فضول خرچی اور تعیش میں تو ضرب المثل تھے۔"

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

مسلمانانِ اندلس وصقلیہ کا طرزِ تمدن بھی زندہ دلی اور شوقینی اور قوت مدرکہ کی ایک تصویر تھا، ان کی صحبتوں میں انتہا درجہ کا لطف دماغی و جسمانی حاصل ہوتا تھا، خشونت کا وہاں نام نہ ہوتا۔ نکاتِ علمی کے ساتھ لطائف وظرائف سے محفلیں گرم رہتیں[1]

ابن جبیر نے صقلیہ کے باشندوں کے لباس وضع قطع، عادات و...
طرز بودوماند اور طریقۂ زندگی کی اعلیٰ تہذیب وشائستگی کا تذکرہ کرکے...
ساتھ صقلیہ کی خواتین کی زیب وزینت، آرائش وجمال آفرینی کا ذکر...
پیرایہ میں بیان کیا ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ صقلیہ کی اسلامی معا...
میں عورتوں کو بلند مرتبہ حاصل تھا اور اس کا اثر یورپ کی عیسائی خوا...

بھی پڑا۔

صقلیہ کی خواتین محلوں کی چار دیواری میں اسیر نہ تھیں۔ مشرقی شرم وحیا کا دامن ہاتھ میں رکھ کر نقاب پوش باہر نکلتیں۔ اگرچہ حسن کی شعاعیں نقاب سے چھن چھن کر باہر آجاتیں لیکن اس موقع پر اگر کسی کی پرمعصیت دُزدیدہ نگاہ نظارۂ جمال کی جسارت کرتی تو رنگ برنگ کے نقابوں کی جھلاہٹ خیرہ کر دیتی۔ ابن جبیر کہتا ہے کہ صقلیہ کی عیسائی عورتوں نے بھی مسلم خواتین کا طرز زندگی اختیار کر لیا تھا۔ وہ بھی رنگ برنگ کا نقاب ڈال کر زرق برق ریشمی و مطلا ملبوسات سے آراستہ ہو کر کلیساؤں میں داخل ہوتیں۔ چنانچہ ایک موقع پر اس نے مسیحی عورتوں کی ایک ٹولی کو سرِراہ گزرتے دیکھا اور اس متحرک گلدستہ کی تصویر چند خطوط میں کھینچ کر اتار لی، ان مسیحی عورتوں کے لباس و سامان زیب و زینت سے مسلمان عورتوں کے پُرتکلف طرزِ معاشرت کا اندازہ ہوگا۔

"اور اس شہر میں عورتوں کی وضع بالکل مسلم خواتین کی ایسی ہے۔ یعنی وہ بھی نہایت شیریں زبان ہیں، چادر اوڑھے ہوئے اور نقاب ڈالے ہوئے رہتی ہیں۔ عید میلاد میں بڑی شان سے نکلتی ہیں۔ سنہرے حریر کے کپڑوں میں ملبوس، ونرم و نازک اور جواہر ٹکے ہوئے جوتے پہنے چادروں میں سمٹی سمٹائی رہتی ہیں۔ گلابی زرتار چادریں اور چہرہ پر رنگین نقاب اور پیروں میں سنہرے موزے پہنے ہوئے ہوتی ہیں۔ غرض مسلمان عورتوں کی آرائش کے تمام سامانوں زیوروں سے آراستہ، مہندی لگائے، کپڑے عطر میں بسائے اسی شان سے گرجے کی طرف ایک ساتھ جاتی دکھائی دیں۔"

ماخذ و حواشی

۱۔ اخبار الاندلس ج ۲ ص ۶۹، ج ۱۳ ص ۲۱۶

۲۔ تاریخ صقلیہ ص ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴

زبان وادب

○

عربی زبان حقیقی معنٰی میں ام الالسنہ ہے ۔ یہ دعوٰے مبالغے سے یکر
ہے ۔ اس زبان میں اتنی جامعیت، وسعت اور لچک ہے کہ ہر مفہوم کو خو
کسی موضوع سے متعلق کیوں نہ ہو، بڑی خوبی کے ساتھ ادا کر سکتی ہے۔
یہی وجہ ہے کہ مفتوحہ ممالک میں عربی زبان ہمیشہ سرعت کے ساتھ
رہی ہے۔ ہر مفتوح ملک میں عربی زبان پہنچی اور اس طرح اس نے اپنی جگہ
کہ عربوں کے رخصت اور جلاوطن ہونے کے بعد بھی، اجنبی دیس میں شان و شوکت
اور اجلال و اکرام ساتھ موجود رہی ۔ اور بالآخر جب تعصب کی بھینٹ چڑھ
اور اسے بالکل ختم کر دیا گیا اور اس کا وجود مٹا دیا گیا تب بھی اس کے
اتنے سخت جان نکلے کہ اب تک عربوں کے سابق مفتوحہ ممالک میں
ان کے آس پاس کے ملکوں میں موجود ہیں ۔ مفتوح قوموں نے عربوں سے
گلو خلاصی حاصل کر لی، لیکن عربی زبان سے چھٹکارا پانا ان کے بس کی
تھی۔ انگریزی، اسپینی، پرتگالی اور فرنچ وغیرہ میں بہت سے انگریزی
اور مصطلحات اب تک موجود ہیں۔ کسی طرح مٹائے نہیں مٹتے
فاطمیوں کے عہد حکومت میں بھی عربی زبان کو غیر معمولی فروغ حاصل

اور ان کی حکومت ختم ہونے کے بعد بھی عربیت کے اثرات کارفرما رہے۔

تاریخ صقلیہ کے فاضل مصنف نے لکھا ہے :۔

"عربی زبان کے اثرات یورپ کی مختلف زبانوں تک پہنچے ، اور ان کی مدد سے ان زبانوں کی تکوین میں بڑی مدد ملی۔ چنانچہ آج بھی یورپ کی مختلف زبانوں میں عربی خیالات ، طرزِ ادا ، اور عربی قواعد صرف و نحو کے علاوہ عربی الفاظ کا بڑا ذخیرہ یادگار کے طور پر باقی رہ گیا ہے۔ موسیو لیبان لکھتے ہیں۔

یورپ کی لاطینی اقوام کی البتہ ایک ایسی مثال ہے جہاں عربی زبان ان کی قدیم السنہ کی جگہ نہیں لے سکی۔ لیکن یہاں بھی اس نے اپنے تسلط کے بین آثار چھوڑے ہیں۔ فرانس میں بھی عربی زبان نے بڑا اثر چھوڑا ، موسیو سدیو نہایت درست لکھتے ہیں کہ یہ امر نہایت قرینِ قیاس ہے کہ عربوں ہی کی زبان سے جو آٹھویں صدی عیسوی سے بحیرہ روم پر قابض تھے فرانسیسی اور پرتگالی زبانوں میں اکثر وہ الفاظ اخذ کئے گئے جو جہاز رانی اور بحری انتظام سے متعلق ہیں۔ علاوہ ازیں یہ بھی قرین قیاس ہے کہ جس وقت باقاعدہ اور مستقل فوجیں یورپ میں قائم ہونے لگیں ، تو افسروں کے نام اور لڑائی میں نعروں کے الفاظ بھی عربوں ہی سے لئے گئے ، اور انتظام مملکت کے متعلق اصطلاحیں بھی بغداد و قرطبہ سے اخذ کی گئیں فرانس کے طبقۂ ثالث کے سلاطین پوری طرح عربوں کے مقلد تھے۔ اسی وجہ سے شکار کے متعلق اکثر الفاظ عربی الاصل ہیں۔ علم ہیئت عربی اصطلاحوں سے معمور ہے ، اکثر ستاروں کے نام بھی عربی ہیں اور ریاضی کی اصطلاحات ، کیمیا کی اصطلاحات اور علم حیوانات اور علم طب کی بہت سی اصطلاحات اور ادویہ کے نام عربی سے اخذ کئے گئے ہیں" یورپین زبانوں میں سے جو زبانیں براہ راست صقلیہ کے اثر سے

متاثر ہوئیں، وہ ایطالوی، جرمن اور پھر بالواسطہ فرانسیسی اور انگریزی زبانیں ہیں۔ ایطالوی زبان پر براہ راست خود عربوں نے اثر ڈالا۔ جرمن زبان فریڈرک کی علمی تحریک سے متاثر ہوئی اور فرانسیسی اور انگریزی زبانوں کو اولاً نارمنوں اور پھر عربی زبان کا اثر قبول کی ہوئی ایطالوی اور جرمن زبانوں نے متاثر کیا۔

ان میں سے خصوصاً اٹلی کی زبان پر براہ راست عربی اثرات پہنچے تو ایک ایسی نئی زبان کی تکوین ہوئی جو عربی اور لاطینی زبانوں سے اس طرح مل کر بنی ہے جیسے ہندوستان میں قدیم سنسکرت اور عربی و فارسی زبانوں کے میل جول سے نئی ہندوستانی زبان اردو عالم وجود میں آئی، یہ زبان فریڈرک دوم کے دربار میں پیدا ہوئی اور نئی ایطالوی زبان کے نام سے موسوم کی گئی۔

مسٹر اسکاٹ یورپ میں عربی زبان کے اثرات دکھاتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یہ زبان اب بھی دریائے ماشن اور دریائے ڈینیوب کے کناروں پر کہیں کہیں بولی جا رہی ہے۔ اس میں عربی اشتقاق اور عربی الفاظ اب بھی موجود ہیں، دور کیوں جایئے، خود انگریزی زبان اور اس کے ذریعہ سے دنیا کا وہ سب سے بڑا حصّہ جہاں انگریزی بولی جاتی ہے عربی زبان کا شرمندۂ احسان ہے۔ بہ نسبت اور ممالک کے اٹلی میں اس زبان نے دفعۃً شمال کی طرف سے فرانس سے اور جنوب کی طرف سے صقلیہ سے حملہ کیا اور جزیرہ نما لاطینی کی بولی پر تفوق حاصل کر کے اس کو نکال باہر کیا۔ اس کی دار و گیر یہیں ختم نہیں ہوئی وہ یونانی ریاست بخیسا ونیکا تک جا پہنچی۔"

پھر ایک دوسرے موقع پر لکھتے ہیں:۔

"اس زبان نے یورپ کے محاورات بلکہ تمام ادب پر گہرا اور مستقل اثر ڈالا ہے، انگریزی زبان کے سب سے زیادہ روزمرہ کے محاورات انگریزی

کہ اسی زبان سے لئے ہوئے اب تک ہماری زبان میں بھی موجود ہیں۔ فرنچ زبان کے اکثر الفاظ و محاورات زبان عربی سے ماخوذ ہیں۔ اسپینی زبان کو تو بگڑی ہوئی عربی کہا جاتا ہے۔

زبان ایطالیہ پر جو اثر صقلیہ کے مسلمانوں نے ڈالا ہے، وہ صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے۔ قصص و حکایات بیشتر عربی یا عبرانی میں لکھے جاتے تھے[۲]

ماخذ و حواشی

۱۔ نفح الطیب ج ۳ ص ۶۷، ۸۸، نیز ج ۲ ص ۱۰۹، ۹۰۴

۲۔ از تاریخ صقلیہ ص ۵۰۴، ۵۱۴، ۵۲۴

تجارت

ناطمیوں نے اپنے دورِ فرمانروائی میں صقلیہ (سسلی) کو عروس البلاد بنا دیا تھا زندگی کی تمام آسائشیں بافراط موجود تھیں۔ غیر ممالک سے تجارتی اور کاروباری تعلقات بھی بہت مستحکم تھے، یہ نتیجہ تھا اس کا کہ انہوں نے تجارت اور صنعت و حرفت میں بہت زیادہ ترقی کر لی تھی "تاریخ صقلیہ" میں وہاں کی تجارت اور کاروبار کا جو جائزہ لیا گیا ہے اس کا ایک حصہ درج ذیل ہے۔

"یہاں کی اشیائے برآمد میں جو چیزیں غیر ممالک کو بھیجی جاتی تھیں ان میں غلہ کی مختلف قسموں کے علاوہ خشک و تر میوے، مچھلیاں، شہد، مٹھائی، حلوا، لکڑی، لوہا، پتھر، مونگا، موتی، گندھک، نوشادر اور کپڑے وغیرہ ہیں۔ جو چیز جس شہر کے مضافات کی پیداوار ہوتی، وہیں کے بندرگاہ سے لادی جاتی تھی، ادریسی نے سب کو نام بنام بتایا ہے جو چیز جہاں جاتی اس کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ مثلاً طبرین سے مختلف قسم کے غلے، لیاج سے مختلف قسم کی لکڑیاں، قطانیہ، شکلہ، قرنیس اور جرجنت سے خشک و تر میووں کی برآمد ہوتی تھی۔ ان میں سے صرف شہر جرجنت ساحل سے دور واقع تھا، اس یہاں کی پیداوار کا بیشتر حصہ پڑا رہ جاتا۔ باقی دن رات تمام مقامات کی پیداوار

افریقہ وغیرہ جاتی اور ان کے ساحل سے جہاز کے جہاز لد کر روانہ ہوتے، اسی طرح خشک و تر میوے اور مچھلیاں افریقہ اور یورپ کو شہد اور مینا کا لوہا، یورپ کو اطرابنش کا موتی اور مونگا یورپ، افریقہ اور اسکندریہ اور اندلس کو بھیجا جاتا۔ نوشادر کی مانگ اندلس اور مصر دونوں جگہ تھی۔ لیکن اسلامی حکومت کے آخر عہد میں مصر میں صقلی نوشادر کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ کیونکہ اولاً یہاں اس کا ذخیرہ ختم ہوگیا۔ علاوہ ازیں مصر میں بعض دوسری چیزوں سے اس کی ضرورت پوری ہونے لگی۔ چنانچہ مقدسی کے بیان کے مطابق ۳۹۰ھ کے قریب نوشادر کی مصر میں برآمد کا سلسلہ قریباً مسدود ہو گیا۔ اسی طرح یورپ میں صقلیہ کی بنی ہوئی چٹائی نہایت کثرت سے جاتی تھی۔ پھر صقلیہ کا بہترین خوبصورت کپڑا بھی غیر ممالک میں پسند کیا جاتا تھا۔ مقدسی لکھتا ہے:-

"صقلیہ سے بہترین اور نفیس کپڑے باہر بھیجے جاتے ہیں۔"

یہاں تک کہ دولتِ کلبیہ کے عہد میں صقلیہ کے اس مشہور کپڑے کی برآمد چوری چھپے ہی ممکن ہو سکتی تھی کیونکہ اس کپڑے کے لئے جوڑا ان میں کبھی رنگ بدلتا تھا۔ صرف شاہانہ ذوق انفرادیت اور شانِ امتیاز کے لئے ممنوع قرار دے دی گئی تھی۔ مقدسی (۲۴۲ھ) لکھتا ہے:-

"اس کپڑے کو دوسرے ملکوں کو لے جانے کی ممانعت تھی۔ اس لئے جو کچھ چوری چھپے چلا جائے وہی دوسرے ممالک میں پہنچتا تھا۔"

اس طرح صقلیہ کا کتان جو نہایت اچھے قسم کا کپڑا تھا، اکثر ممالک میں بھیجا جاتا تھا۔

مسٹر اسکاٹ لکھتے ہیں:-

"ان دونوں ممالک (اندلس و حکومت بیزنطینی قسطنطنیہ وغیرہ) کی پیداوار اور مالِ تجارت صقلیہ کے تاجروں کے ہاتھ آتے تھے۔ ان چیزوں کے مقابلہ میں یہ سوداگر یہاں سے روئی، انگور، نارنگی، شکر، شراب، تیل، تانبا، سیسہ، لوہا، پارہ، کانی نمک، نوشادر، توتیا، چوپائے گھوڑے، ایک

قسم کی مچھلی جس سے ارغوانی رنگ نکالا جاتا تھا ان ممالک میں سے جاتے تھے[3]

اس عہد کے چینی کے نادر برتنوں کا ذکر بھی انفراداً کیا جا سکتا ہے کیونکہ حال کے محققین آثار قدیمہ کو صقلیہ سے چینی کے چند نہایت خوبصورت برتن دستیاب ہوئے ہیں جو کلوفی کے عجائب خانہ میں محفوظ ہیں۔ ان برتنوں سے اگرچہ موسیو لیبان کے بیان کے مطابق یہ خیال کیا جا سکتا تھا کہ یہاں بھی عربوں نے چینی کے برتنوں کے کارخانے بنائے تھے مگر برتنوں کے جو نمونے پائے گئے ہیں وہ زیادہ تر ایرانی وضع کے ہیں، اس لئے موسیو لیبان کے خیال کے مطابق ممکن ہے کہ یہ برتن تجارت کے ذریعہ سے یہاں آئے ہوں۔ اس لئے انہیں اپنا درآمد میں شمار کرنا چاہیئے[4]

ماخذ و حواشی

۱۔ مقدسی ، احسن التقاسیم ص ۲۳۹، ۲۴۱

۲۔ اسکاٹ :۔ اخبار الاندلس ج ۳ ص ۳۹۵

۳۔ لیبان ،۔ تمدن عرب ص ۴۷۷

۴۔ از تاریخ صقلیہ ص ۱۸۰

نقّاشی و مصوّری

موسیو لیبان نے تحریر فرمایا ہے :

ان تصویروں سے جو سکوں پر اور متعدد عربی کاسوں پر بنی ہیں۔ عربوں کی نقاشی کی قابلیت صاف ظاہر ہوتی ہے لیکن ان سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ان میں مصوری کی قابلیت کس درجہ تھی۔ اس کا اندازہ ہمیں مورخوں کے بیان سے ہوتا ہے۔ ان ہی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ عربوں میں متعدد مدارس مصوری کے تھے اور مقریزی کے سے محقق مورخ نے مسلمان مصورین کی سوانح بھی لکھی ہیں۔ وہ بیان کرتا ہے کہ جس وقت خلیفہ المنصور کا قصر لوٹا گیا تو اس میں سے ہزار ٹکڑے مشجّر کے نکلے جن پر خلفائے عرب اور ان کی جنگ جوئیوں اور ارکان سلطنت کی تصویریں بنی ہوتی تھیں۔ کمخواب، ریشم اور مخمل کے تھے انواع و اقسام کی حیوانی اور انسانی تصویروں سے بلسے ہوئے تھے۔

مقریزی کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ دسویں صدی عیسوی میں عربوں کی مصوری قاہرہ میں اعلیٰ درجہ کی تھی۔ وہ دو دیواروں کی تصویروں کا ذکر کرتا ہے جن میں سے ایک کی زمین سیاہ تھی اور اس پہ سفید پردے بنے ہوئے تھے یہ تصویر جس دیوار کے اندر بنی تھی بیٹھی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ دوسری تصویر کی

زمین زرد تھی، پردے سرخ تھے۔ یہ برخلاف پہلی تصویر کے ابھری ہوئی اور دیکھنے والے کی طرف جھکی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ مقریزی نے ایک زینہ کا بھی ذکر کیا جو خلیفہ کے محل میں بنا ہؤا تھا اور جس سے بالکل اصلی زینہ کا دھوکا ہوتا تھا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عرب مصورا صول، علم مناظر اور قرب و بُعد کے اثر سے واقف تھے۔ بہتیری علمی کتابیں علی الخصوص علم حیوانات اور گھوڑوں کی تعلیم وغیرہ کی کتب باتصویر ہیں۔ اس وقت بھی کئی نسخے حریری کے مع تصاویر کے موجود ہیں۔ کاسِسری کتب خانہ اسکوریل کی ایک عربی کتاب کا بیان لکھتا ہے جس میں تقریباً چالیس تصویریں عربی اور ایرانی بادشاہوں، شہزادیوں سپہ سالاروں اور اعیان دولت وغیرہ کی بنی ہوئی ہیں[1]۔

آگے چل کر موسیولیبان نے لکھا ہے :-

خود عربی حروف اس درجہ خوبصورت ہیں کہ ازمنۂ متوسط اور نشأۃ الثانیہ کے بناؤں نے ان نمونوں کو جوان کے ہاتھ لگے محض آرائش سمجھ کر نقل کر دیا ہے موسیو لانگ پیریر اور موسیو لادوا اور دوسرے مصنفین نے ان کی مثالیں اکثر اطالیہ میں دیکھی ہیں۔ اس آخر الذکر مصنف نے تو میلان کے بڑے کلیسائے بیت الخدمت میں ایک نکیلا محراب اور دروازہ دیکھا ہے جس کے گرد ایک تحریر کی لگی تھی اور اس پر ایک عربی لفظ متعدد بار لکھا ہؤا تھا۔ کلیسائے سینٹ پیٹر کے اس دروازے پر جہاں پوپ یوزین چہارم کی مورت ہے۔ حضرت عیسیٰ کے سر کے گرد عربی حرفوں کا ہالہ ہے اور سینٹ پیٹر اور سینٹ پال کے کپڑوں پر بھی ایک ایک عربی سطر لکھی ہوئی ہے۔ افسوس ہے کہ اس مصنف نے ان کا ترجمہ نہیں دیا ہے۔ کیا عجب ہے کہ حضرت عیسیٰ کے سر کے گرد لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ لکھا ہو[2]۔

اگرچہ عہد فاطمی علم و حکمت کی ترقی کا موجد نہ تھا۔ پھر بھی وہ صنعت و حرفت اور معماری میں کافی ممتاز رہا۔ اعلیٰ مصنوعات اور بلند پایہ عمارتیں اسی عہد

تیار ہوتی تھیں۔ پہلے خلفاء المعز اور عزیز کے زمانے میں جو آسودگی ملک کو نصیب ہوئی وہ فرعونی اور اسکندری عہد کی خوشحالی کا مقابلہ کرتی تھی۔ اس خوشحالی کے آثار صنعت و حرفت میں بھی نمودار ہوئے۔

قاہرہ کے عجائب خانے (میوزیم) میں چند دروازوں کے تختے ہیں جن کی تاریخ فاطمی عہد سے شروع ہوتی ہے۔ ان پر مختلف جانوروں کی تصویریں کندہ ہیں۔ کہیں ہرنوں پر وحشی جانور حملہ کر رہے ہیں۔ کہیں خرگوشوں کو گدھ پکڑ رہے ہیں۔ کہیں جانوروں کے جوڑے ایک دوسرے کے روبرو کھڑے ہیں یہی مشابہت عہد فاطمی کے پیتل اور کانسی کے مصنوعات میں بھی پائی جاتی ہے جن میں زیادہ آئینے، لوٹے، صراحیاں اور عود دان شامل ہیں۔ ان میں سب سے بہترین ایک پیتل کا عنقا ہے جو چالیس انچ اونچا ہے۔ اسی طرح پارچہ بافی کی صنعت بھی تعریف کے قابل ہے جس کے نمونے صلیبی لڑائیوں کے زمانے میں مغرب (یورپ) میں داخل ہوگئے۔ کپڑا بننا مصر کی ایک قومی صنعت تھی۔ فاطمی عہد کے کپڑوں میں جانوروں کی تصویریں مختلف نمونوں میں پائی جاتی ہیں مٹی کے برتنوں کی صنعت میں دوسری صنعتوں کی طرح ایرانی وضع کی پیروی کی جاتی تھی۔ اس میں بھی جانوروں کی تصویریں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ مقریزی نے فاطمی خزانوں کے ذکر میں مٹی اور مختلف دھاتوں کی مصنوعات کی تفصیل بیان کی ہے۔ ان برتنوں میں سفالی کام کے برتن بھی شامل ہیں۔

ناصر خسرو کہتا ہے کہ:۔

مصری ایسے عمدہ اور شفاف مٹی کے برتن بناتے تھے کہ ان میں آدمی اپنا ہاتھ آر پار دیکھ سکتا تھا۔

عہد اسلام میں جہاں تک تاریخ سے پتہ چلتا ہے کتابوں کی سب سے پرانی جلدوں کے نمونے مصر سے نکلے جو آٹھویں یا نویں صدی عیسوی کے ہو سکتے ہیں۔ یہ اپنی آرائش اور کاریگری میں قدیم قبطی جلدوں سے مشابہ

ہیں۔ اس مصری صنعت کے فروغ پانے کے بعد چمڑے پر ٹھپّا لگانا اور نقش کرنا مسلمان کاریگروں کی عام صنعت بن گئی۔[۵]

ملاحظہ ہوں تصاویر نمبر ۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶

ماخذ و حواشی

۱۔ تمدن عرب، (موسیولیبان) ص ۴۴۴

۲۔ تمدن عرب (موسیولیبان) ص ۴۸۶

۳۔ Hitti: History of Arabs. P. 630

۴۔ مقریزی، ج ۲، ص ۲۵۴،

Hitti, History of the Arabs. P. 63

صنعت وحرفت

عربوں کے تمدن کا عروج خلفائے فاطمی کے وقت میں ہوا۔ اور اس زمانے میں صنعت وحرفت نے بے انتہا ترقی کی۔ تھوڑے ہی زمانہ میں قاہرہ بغداد کا مدمقابل بن گیا لیکن یہ مقابلہ زیادہ تر حرفت وصنعت میں تھا۔ علوم وفنون میں نہ تھا۔ کیونکہ بغداد کے دارالعلوم ہمیشہ قاہرہ کے مدارس پر فائق رہے۔ یہاں ہمارا مقصود صرف اس تمدن کی مالی اور معیشتی حالت کا دکھانا ہے۔

سرزمین مصر کی زرخیزی اور تجارتی تعلقات کے بدولت خلفائے مصر کی آمدنی خلافت بغداد کی آمدنی سے بڑھ گئی۔ اس دولت کے بہت بڑے حصہ کو انہوں نے نشاط وتنعم کے سامان اور قصر وایوان اور کارواں سرائیں بنانے میں صرف کیا۔ اس زمانہ قدیم میں سواحل نیل پر عمارت گویا مفت بنتی تھی کیونکہ قاہرہ میں ایک معمار کی مزدوری دس آنے روز تھی اور معمولی مزدور کی [illegible] آنے روز۔ تعمیر کے پتھر کی قیمت مع کھدائی اور باربرداری کے فی روپیہ بائیس مکعب گز تھی[1]

[1] مقریزی مورخ عرب لکھتا ہے اور اس کے قول کی تصدیق ہمیں اس زمانے کی تحریریں دیکھنے سے ہوتی ہے کہ خلفائے فاطمی کے عہد حکومت میں (۹۷۲ء-۱۱۷۱ء) تک

صنعت اور علی الخصوص جواہر تراشی و پارچہ بافی سے متعلق فنون اور ان تمام پیشہ ور
نے جو اثاث البیت اور مکانوں کی اندرونی آرائش سے متعلق تھیں اعلےٰ درجہ
کی ترقی پائی تھی۔ مکانوں کی دیواروں پر چینی کی مینا کار تختیوں کا استر یا مختلف
رنگوں کی گچکاری ہوا کرتی تھی اور ان پر گل بوٹے بنے ہوتے تھے، بعض عربی عمارتوں
میں یہ آرائشیں ابھی تک موجود ہیں۔ جن سے ہمیں ان کی خوبی کا اندازہ ہو سکتا ہے
مکانوں کے صحن میں پچی کاری ہوا کرتی تھی یا بڑی بڑی سلیں بچھائی جاتی تھیں
لکڑی کا سامان بہت ہی بیش بہا ہوا کرتا تھا اور ان میں سیپی اور ہاتھی دانت
کا منبت کا کام ہوتا تھا۔ پلنگوں پر کپڑے منڈھے جاتے تھے جن پر انواع واقسام
کے حیوانات کی صورتیں بنی ہوئی تھیں۔ بعض گدیوں پر ایک قسم کا نہایت پرتکلف
سرخ کپڑا چڑھا ہوتا تھا۔

فلزات کے کام نے بھی بڑی ترقی کی تھی۔ گل دان، آفتابے، رکابیاں،
شمع دان اور ہزارہا مختلف قسم کی چیزیں جو اس وقت تک باقی ہیں اس صنعت
کی عمدہ مثالیں ہیں[۲]

ملاحظہ ہوں تصاویر نمبر، ۷، ۸، ۹، ۱۰، ۱۱۔

ماخذ و حواشی

۱۔ بیمار ارزانی تو اس عہد میں عام تھی۔ قاہرہ کی تخصیص بے کار ہے تقریباً ساری دنیا کی یہی کیفیت تھی

۲۔ تمدن عرب، ص ۲۱۰، ۲۱۱

پارچہ بافی

○

پارچہ بافی کا پیشہ صقلیہ میں درجۂ کمال پر تھا، سوتی اور ریشمی ہر طرح کے کپڑے تیار کئے جاتے تھے، روئی کی خام پیداوار سے سوتی کپڑے تیار کرتے اور ریشمی کپڑوں کے لئے ریشم کے کیڑوں کی پرورش انجیر کے درختوں پر کرتے، یہ طریقہ مسلمانوں نے اندلس میں رائج کیا، وہاں سے صقلیہ لائے۔ کیڑوں کی پرداخت کے لئے انجیر کے بے شمار درخت لگائے گئے تھے۔

یہاں کے کپڑے نہایت نفیس، عمدہ اور باریک ہوتے تھے۔ ان میں اعلیٰ درجے کے نقش و نگار کاڑھے جاتے۔ رفتہ رفتہ بازار میں یہاں کا کپڑا سب سے اعلیٰ درجے کا سمجھا جانے لگا۔ ابن حوقل مسلمانان نیپلز کے کپڑوں کے متعلق حسب رائے ظاہر کرتا ہے۔

"میں نے تمام اقطارِ عالم میں اس کپڑے کے مانند کوئی دوسرا کپڑا نہیں دیکھا اور نہ ایسے کاری گر ساری روئے زمین پر کہیں اور دیکھنے میں آئے"۔

اسی طرح مقدسی نے اقلیم مغرب کے عجائب میں پارچہ بافی کی ایک مثال پیش کی ہے جس سے مراد صقلیہ کی پارچہ بافی ہے۔ وہ لکھتا ہے:۔

"اور اس اقلیم میں بکثرت عجائب ہیں اور ان میں سے ایک بوقلموں ہے،

یہ ایک قسم کا جانور ہے جو سمندر کے ساحل پر پتھروں سے اپنے بدن کو رگڑتا ہے جس سے اس کے روئیں گرتے ہیں۔ یہ روئیں ریشم کی طرح نہایت نرم اور ملائم ہوتے ہیں۔ ان کا رنگ سنہرا ہوتا ہے۔ یہ نہایت نادرالوجود ہے چنانچہ اس کو جمع کرتے ہیں اور اس سے کپڑے بنتے ہیں۔ یہ کپڑے دن میں کئی رنگ بدلتے ہیں۔[1]"

یورپین مؤرخوں کو اعتراف ہے کہ کپڑے بننے اور رنگنے وغیرہ کا فن یورپ نے مسلمانانِ صقلیہ سے سیکھا۔ موسیو لیبان لکھتے ہیں :-

"ریشمی کپڑا جزیرہ میں بننے لگا اور اس وقت بھی نورم برگ میں ایک ریشمی چادر شاہان صقلیہ کے اوڑھنے کی موجود ہے جس پر کوفی حرفوں میں پانچسو ہجری (۱۱۳۳ء) کا ایک کتبہ ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کپڑے رنگنے کا فن صقلیہ ہی سے یورپ میں آیا۔"

موسیو سدیو کا بیان ہے کہ یورپ نے ریشمی کپڑوں کی بافت مسلمانان صقلیہ سے حاصل کی وہ کہتے ہیں :-

"جزیرہ صقلیہ میں ریشمی کپڑوں کے بننے کا دستور پڑا جس سے کہتے ہیں کہ بارہویں صدی عیسوی میں اس کے بننے کا ہنر یورپ کے لوگوں نے سیکھا۔"

مسٹر اسکاٹ لکھتے ہیں :-

"دنیا کی کوئی قوم مسلمانانِ صقلیہ کے برابر باریک، اور خوبصورت کپڑا نہیں بنا نہ پلرمو کے ریشمی کپڑوں کا مقابلہ کر سکی۔ وہ قرآن مجید کی آیات اور پھول بوٹے، سنہرے کلابتوں سے اس خوبصورتی کے ساتھ بنتے تھے کہ جس کو دیکھ کر سخت حیرانی ہوتی ہے۔ ان کپڑوں کی بڑی قدر تھی۔ اسلامی دنیا کے بادشاہوں اور امراء کے لئے یہاں کے کپڑے ڈھونڈ ڈھونڈ کر منگوائے جاتے تھے۔[2]"

فنِ رنگ سازی پر ایک صقلی اہلِ علم نے ایک کتاب بھی لکھی ہے جو زرنی

کتب خانے میں موجود ہے۔[۳] ملاحظہ ہوں تصاویر نمبر ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵،

ماخذ و حواشی

۱۔ ملاحظہ ہو:۔

احسن التقاسیم (مقدسی) ص ۲۴۰

المسالک والممالک (ابن حوقل) ص ۸۷

۲۔ ملاحظہ ہو۔

اخبار الاندلس، (اسکاٹ) ج ۲، ص ۶۰، ۶۲،

تمدن عرب (لیبان) ص ۲۸۲

تاریخ عرب (موسیو سدیو) ص ۲۴۴

۳۔ تاریخ صقلیہ ص ۱۳۴، ۴۴!

عہد فاطمی کی صنعتِ ظروف سازی

کوزہ گری، سفالی برتن اور مٹی کے ظروف

○

مشرقی ایران میں مقامی خاندانوں کی نمود اور فروغ نے بغداد کی بالادستی سے نجات حاصل کرنے کے بعد سمرقند کے کوزہ گروں کا ایک نیا اور خود مختار ادا[ر]ہ قائم کر دیا۔ لیکن کوزہ گری کا یہ جدید "اسکول" بغداد کی دست کاری کی صنعت سے الگ تھلگ ہی رہا۔

بعد میں جب مصر نے بغداد کے تسلط سے علیحدگی اختیار کی تو اس نے بھی ایک [نیا] کامیاب اور فروغ پذیر "اسکول" ظروف گلی کے صنعت کاروں اور کوزہ گری کے ماہروں کا قائم کر دیا، سمرقند اور مصر کے ظروف گلی بنانے والوں کے مابین مابہ الامتیاز یہ ہے کہ آخر الذکر نے اس سلسلے میں ان روایات کو زیادہ ابھارا اور فروغ دیا جو بغداد سے وابستہ چلی آ رہی تھیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ دسویں صدی عیسوی [میں] بغدادی اسکول (ظروف گلی) مائل بہ انحطاط ہو چکا تھا۔ اور اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ بغداد کے ہنرور اور دستکار، ترکِ وطن کر کے اور اپنے فنی رموز ساتھ لے کر مصر میں آ بسے تھے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اسٹائل اور تکنیک کے لحاظ سے مص[ر]

کے مصنوعاتِ گلی بغداد کے مقابلے میں کہیں زیادہ مضبوط اور دیدہ زیب نظر آتے ہیں۔

۸۶۸ء میں احمد ابن طولون لفٹیننٹ گورنر بنا کر مصر بھیجا گیا، جس نے وہاں تقریباً آزاد حکومت قائم کرلی، جس کا دائرہ شام تک پھیلا ہوا تھا۔

۹۰۵ء کے بعد خلیفہ بغداد کی بالادستی مصر پر مختصر عرصہ کے لئے پھر قائم ہوگئی اور اس مرتبہ ایک نئی طاقت نے اسے ہمیشہ کے لئے کچل دیا، آخری طور پر مصر اور شام ۹۶۹ء میں ایک ایسی حکومت کے ماتحت آگئے جو گذشتہ نصف صدی سے پورے شمالی مغربی افریقہ پر قابض اور حکمران تھی، یہ نئی طاقت فاطمیوں کی تھی، جن کا دعویٰ تھا کہ وہ بنتِ رسول فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کی اولاد ہیں۔ یہ حکومت خلافتِ بغداد سے بالکل بے تعلق تھی۔ اور خود ہی مدعی خلافت تھی۔ اس کے ہاتھ میں سیاسی اور مذہبی اقتدار کی باگ بیک وقت تھی۔ فاطمی خاندان نے مصر پر کم و بیش دو سو سال تک (۹۶۹ء سے ۱۱۷۱ء تک) حکومت کی اور اس ساری مدت میں اسلامی آرٹ کا مرکز بغداد کے بجائے مصر ہی رہا۔

عہدِ فاطمی کے بہت سے ظروف گلی، فسطاط کے ملبے اور خرابے میں پائے گئے ہیں۔ فسطاط وہ شہر ہے جو پہلے مصر کا دارالحکومت تھا مگر خلیفہ المعز فاطمی نے جب نیا دارالخلافہ قاہرہ بنایا اور بسایا تو اس کی حیثیت ایک پسماندہ قصبے کی رہ گئی۔ صدیوں تک یہ مقام فوجی اور نیم فوجی گودام کی حیثیت سے استعمال ہوتا رہا۔ یہاں سے جو چیزیں برآمد ہوئی ہیں ان میں وہ برتن بھی ہیں جو چین، ایران، اسپین، اطالیہ اور دوسرے ممالک سے درآمد کئے گئے تھے۔ اسٹائل اور تکنیک، نیز بھٹی سے نکلے ہوئے ناقص مال کی نوعیت سے بآسانی اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان میں مقامی بنے ہوئے برتن کون سے تھے؟

مقریزی کا یہ دعوےٰ ہے کہ بغداد کے بنے ہوئے مٹی کے چمکدار برتن، سونے کی پالش لگے ہوئے اور سادہ بغداد کی طرف خلیفہ المستنصر فاطمی کے ایوان میں ایک

قیمتی خزانہ تصور کئے جاتے تھے۔ قطعاً مشتبہ ہے۔ اس لئے مشتبہ ہے کہ مستنصر فاطمی کے ایران میں اس طرح کے برتنوں کا پایا جانا۔ یا انہیں گراں بہا سمجھا جانا اس بات پر دلالت نہیں کرتا کہ وہ بغداد کے بنے ہوئے تھے، کیونکہ چکدار گلی ظروف کی صنعت مصر میں کب سے شروع ہوئی اسے ادبی یا تاریخی شواہد سے ثابت کرنا محال ہے۔ البتہ یہ ضرور ثابت ہے کہ دسویں صدی عیسوی میں فاطمی دور کے ظروف گلی بغداد پہنچ چکے تھے۔ اگرچہ ان کے عہد آغاز کا تعین نہیں کیا جا سکتا۔

دونوں مقامات ـــــ مصر اور بغداد ـــــ کے ظروفِ گلی دیکھ کر بلا تامل بغیر کسی تامل کے کہا جا سکتا ہے کہ دونوں کی ساخت اور طرز میں نمایاں فرق ہے بغداد کے برتن ظاہر میں دیدہ زیب لیکن کمزور ہوتے تھے اور مصر کے برتن بظاہر دیدہ زیب نہ ہونے کے باوجود مضبوط اور بہتر ہوتے تھے اور ہر رنگ میں ہوتے تھے۔ مثلاً نارنجی، زرد، سنہرے، گہرے، ہلکے سب طرح کے۔

فاطمی عہد کے سفال سازوں میں ایسے ہنرور اور کاریگر بھی تھے جنہوں نے اپنے نام بھی اپنے مصنوعات و تخلیقات پر کندہ کر دیئے ہیں۔ ان میں ایک ممتاز اور نمایاں ہستی سعد کی ہے۔

فاطمی عہد کے نقشی برتن بھی ایک خاص خصوصیت کے حامل تھے۔ یہ قلعی دار اور بے قلعی ہر طرح کے ہوتے تھے۔

۱۱۷۱ء میں دولتِ فاطمی کا خاتمہ ہو گیا۔

فاطمیوں کے خزائن صلاح الدین ایوبی کے ہاتھ آئے جس نے سلطان کا لقب اختیار کر کے ٹیگرس سے نیل تک فرمانروائی کی اور خلافتِ بغداد سے ... ہو گیا[1]

موسیو بیان نے بھی اس موضوع پر تحقیق کی ہے وہ فرماتے ہیں:-

"جزیرہ منقلیہ میں بھی چینی کے برتن ملے ہیں جن سے خیال کیا جاتا ہے کہ یہاں

بھی عربوں نے کارخانے بنائے تھے۔ لیکن جو نمونے پائے گئے ہیں وہ زیادہ تر ایرانی وضع کے ہیں اور ممکن ہے کہ تجارت کے ذریعہ سے یہاں آگئے ہوں۔ کلونی کے عجائب خانہ میں ایک بہت ہی خوبصورت مجموعہ چینی کے کام کا ہے جو صقلیہ کے عربوں کے وقت کا خیال کیا جاتا ہے۔ یورپ کے عجائب خانوں میں بہت سے چینی کے برتن ایسے ہیں جو اندلس کی تقلید میں بنے ہیں۔ ان کا نقل ہونا بہت آسانی سے معلوم ہو جاتا ہے کیونکہ ان میں عربی حروف اور گلکاریاں ملی جلی ہوئی ہیں۔ غیر ملک کے بنانے والوں نے ان عربی حروف کو محض آرائش سمجھ کر نقل کرنے میں ان کی صورت بگاڑ دی۔ عربستان اور سواحل مشرقی کے بڑے شہروں میں اس وقت بھی چین کے بنے ہوئے برتن پائے جاتے ہیں، جن پر عربی سونے کے حروف نیلی یا سفید زمین پر بنے ہوئے ہیں۔ یہ غالباً ان مسلمان کاریگروں کے بنائے ہوئے ہیں جو چین میں بستے ہیں کیونکہ دو کروڑ چین کے مسلمانوں میں غالباً اس کام کے کرنے والے بہت ہیں۔[۲]

ملاحظہ ہوں تصاویر نمبر۔ ۱۱، ۱۲، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۵،

ماخذ و حواشی

۱۔ Early Islamic pottery (Arthur lane) P. 23, 24

۲۔ تمدن عرب (موسیو لیبان) ص ۴۷۸

زراعت و حرفت

مسلمانوں نے صقلیہ کی زراعت کو حیرت انگیز ترقی دی، اگرچہ صقلیہ کی سرزمین اٹلی کی زمین شور کے لئے ہمیشہ غلّہ کی ایک منڈی بنی رہی لیکن اس زمانہ تک غلّہ کی اس منڈی میں اس قدر مال جمع ہوتا تھا۔ جہاں تک اس کے قدرتی ذرائع بہم پہنچا سکتے تھے۔ مسٹر اسکاٹ لکھتے ہیں:-

"جب تک شرقیین (مسلمان) صقلیہ پر قابض رہے اس وقت تک اس جزیرہ کی آبادی زیادہ تھی اور کاشت بھی اچھا اسلوب پر ہوتی تھی۔ مسلمانوں کی نہ تھکنے والی قوم کی محنت و مشقت نے وہاں کے قدرتی ذرائع کو انتہائی کمال پر پہنچا دیا اور تقریباً جتنے غلّے اور میوے کاشتکاروں کو معلوم تھے انہوں نے چپہ چپہ پر پیدا کرائے۔"

ابن حوقل لکھتا ہے:-

"اس جزیرے کی پوری زمین آباد اور مزروعہ ہے![۱]"

ادریسی نے تو یہاں کے چپہ چپہ کا ذکر کیا ہے۔ اگر ایسے مقامات کی فہرست مرتب کی جائے جہاں کی زرعی پیداوار اور خلاف معمول زیادہ تھی اور جن کا ذکر ادریسی نے تفصیل سے کیا ہے تو ان مقامات کی تعداد سو سے زیادہ نکلے گی۔

ماخذ — ۱۔ تاریخ صقلیہ : ۲۔ تاریخ صقلیہ

عہدِ فاطمی میں
علوم و فنون کی توسیع و ترقی

آغازِ سخن

محمد امی صلعم کی پکار جب ریگ زارِ عرب میں بلند ہوئی تو پوری قوم ناخواندہ جاہل اور علم سے نا آشنا تھی۔ لیکن اسلام قبول کرتے ہی وہ دانش وروں کو حکمت و معرفت کا سبق دینے لگی۔ اسلام وہ پہلا مذہب ہے جس کے داعی نے اور جس کی آسمانی کتاب ـــ قرآن ـــ نے اپنے ماننے والوں اور پیروؤں کو صاف، واضح اور غیر مشتبہ انداز میں علم، عقل، فکر اور دانش سے کام لینے کی تلقین کی اور اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ دیکھتے دیکھتے یہ قوم دنیا میں علم کی سب سے بڑی سرپرست اور مربی بن گئی۔ عرب علم کی شمع لے کر اپنے دیس سے نکلے اور انھوں نے ظلمت کدۂ یورپ کو اس شمع سے روشن اور منور کر دیا۔ عربوں پر انحطاط و ادبار، اور زوال و انحلال کے کئی دور آئے لیکن ان کی جلائی ہوئی علم کی یہ شمع اب تک روشن ہے اور ابد تک اس کی روشنی قائم رہے گی۔

اگر عربوں نے علم کی توسیع و ترقی میں حصّہ نہ لیا ہوتا تو آج سائنس کی محیرالعقول ایجادیں نہ ہوتیں۔ آج علوم و فنون کی یہ گرم بازاری نہ ہوتی۔ شاید یورپ آتنا ہی جاہل اور کندہ ناتراش ہوتا جتنا عربوں کی نمود سے پہلے تھا۔

خلفائے فاطمیئین بھی عرب تھے۔ اور انھوں نے اپنے پورے دو سو سالہ دورِ حکومت میں علم کی شمع نہ صرف روشن رکھی بلکہ اس کی روشنی تاریک سے تاریک گوشوں میں بھی پہنچا دی۔ جس کا اعتراف دوست تو دوست دشمن تک کرنے پر مجبور رہیں۔

سسلی کی راہ سے عربی ادب و فلسفہ یورپ میں خاص طور پر پہنچا جسے اٹلی کے ان دار العلوموں سے بڑی مدد ملی جو فریڈرک دوم کی سرپرستی میں قائم تھے۔ فریڈرک نے اسلامی علوم و فلسفہ کو یورپ میں رائج کرنے میں بڑی خدمت انجام دی ہے۔ انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا میں ہے:

"اس کا دربار جو پلرمو میں تھا وہ یورپ کے شاندار ترین دربار تھا۔ اور اس وقت کی تمام معلوم دنیا کے علماء اس میں آتے تھے۔ اس کی قدر "مشرکانہ" فلسفہ بعد کو جدید عقلیت (ریشنلزم) کی ابتدا خیال کیا جانے لگا۔ اس نے مدرسے اور یونیورسٹیاں قائم کیں۔ اور خود بھی سلیس زبان میں شاعری کرتا تھا۔"(1)

مسٹر اسکاٹ لکھتے ہیں:

"اس کے ہمہ گیر الطاف خسروانہ سے علم و سائنس بھی محروم نہ رہے آئندہ نسلِ انسانی پر اس کا یہ دوامی احسان ہے اور رہے گا۔ اور اس کے مسلمان اتالیقوں نے جو اثر اس کے قلب پر ڈال دیا اور جو مذاق اس میں پیدا کیا وہ کبھی اس سے الگ نہیں ہوا۔ اس کے دربار میں عرب اور یہودی علماء اکثر حاضر رہتے تھے۔ اس نے اپنے ملک میں مختلف زبانوں کے مطالعہ کا بہت شوق دلایا۔ علم کے تمام شائقین عربی، عبرانی، اور یونانی زبانوں میں باتکلف گفتگو کر سکتے تھے۔ اس زمانہ میں نیپلس اور سلرنو علم کے نہایت شاندار مرکز تھے۔"(2)

رابرٹ برنارٹ لکھتا ہے:

۔ تمدنِ اسلام کا اثر یورپ پر سب سے زیادہ فریڈرک دوم کے زمانہ میں پڑا جو حقیقت میں ازمنۂ متوسط کا سب سے بڑا عیسائی حکمران تھا۔ اگر یورپ کے براعظم کو وحشت اور جہالت کی گہرائیوں سے نکال کر شاہراہ ترقی و تمدن پر لانے کا سہرا کسی کے سر ہے تو وہ فریڈرک ہے جس نے اسلامی تمدن اختیار کیا اور پھر اس کو پھیلانے کی ان تھک کوشش کی۔

فریڈرک کے دربار میں مسلمان ماہرینِ علوم کا اجتماع رہتا تھا۔ وہ لوگ ریاضی اور علم نباتات کے متعلق ضروری معلومات پر بحث کرتے تھے۔ یہ دربار یورپ کے حکمرانوں کے درباروں سے بالکل مختلف تھا۔ ان کے یہاں جہالت اور توہمات کا دور دورہ تھا۔ فریڈرک نے نیپلز، مسینا وغیرہ میں یونیورسٹیاں قائم کیں۔ اور سلرنو میں ایک طبی مدرسہ قائم کیا جس میں مسلمانوں کے طریق علاج کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس نے یورپ میں ریاضی کے معلمین کی ہمت افزائی کی۔ یہود اور مسلمان علماء کو جمع کر کے ہر دستیاب ہونے والی عربی کتاب کا ترجمہ کرنے کا اہتمام کیا۔ اپنے ایک دوست میکائیل کو قرطبہ بھیج کر ابن رشد کی کتابیں فراہم کیں اور پھر ان کی نقلیں کرا کر انھیں اپنی سلطنت کے ہر مدرسہ میں درس و تدریس کے لیے بھیج دیا۔

فریڈرک کے خلاف عیسائی قوموں کی طرف سے بڑے بڑے خوفناک الزامات لگائے گئے ہیں۔ ان میں ایک بڑا الزام یہ تھا کہ وہ روزانہ غسل کرتا ہے۔ حتیٰ کہ اتوار کے روز بھی۔ اسلامی تمدن کو اختیار کر لینے کی بنا پر اس وسیع النظر بادشاہ کو بہت مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔[۱]

ماخذ

۱۔ اخبار الاندلس، ج ۳، ص ۷۳

۲۔ اخبار الاندلس، ج ۳، ص ۴۳، ۴۴

۳۔ روزنامۂ زمیندار، لاہور، ۱۲؍ نومبر ۱۹۲۶ء بحوالہ تاریخ نجد
ص ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶

فاطمی خلفاء کے کتب خانے

○

فاطمی خلفاء کو علم سے، علم کی نشر و اشاعت سے، اور علم کے تحفظ سے غیر معمولی اور بہت گہرا لگاؤ تھا۔ اس سلسلے میں انھوں نے گراں بہا اور ناقابلِ فراموش کارنامے انجام دیے ہیں۔ جن کا مؤرخین نے تحسین و سپاس کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

کتابوں سے اور کتب خانوں سے بھی فاطمی خلفاء کو بہت دلچسپی تھی۔ عوامی کتب خانوں کے علاوہ انھوں نے ذاتی کتب خانے بھی بڑے شاندار پیمانے پر قائم کیے تھے۔

ابن الاثیر کا بیان ہے کہ المہدی کو اپنے بزرگوں سے ایک کثیر تعداد کتابوں اور دستاویزوں کی ورثے میں ملی تھی۔ جب المہدی سجلماسہ کو جارہا تھا تو یہ سارا ذخیرۂ کتب چوری ہوگیا تھا لیکن اس کے بیٹے ابوالقاسم نے کچھ عرصہ بعد اسے دوبارہ حاصل کرلیا۔"[1]

قیاس یہ چاہتا ہے کہ یہ سارا ذخیرۂ کتب اس ساز و سامان کے ساتھ جو المعز شمالی افریقہ سے لایا قاہرہ منتقل ہوگیا۔ اگر یہ صحیح ہے تو پھر عظیم الشان فاطمی کتب خانے کی بنیاد یہی تھی۔

فاطمی خلفاء ہمہ وقت اس فکر میں رہتے تھے کہ ان کے محل کے
کتب خانے میں زمانہ بھر کی کتابیں جمع ہو جائیں۔ ان کی اس تڑپ ہی کا
نتیجہ ہے کہ ان کے کتب خانے میں بعض کتابوں کے غیر معمولی نسخے تھے
لیکن پھر بھی وہ دیگر نسخے خریدنے پر فیاضی سے آمادہ رہتے تھے۔ ...
لکھا ہے کہ اس کتب خانہ میں مصحف شریف کے دو ہزار چار سو نسخے
جن میں بعض نہایت مشہور خطاطوں نے لکھے تھے۔ ان کی جلدیں نہایت
خوش نما اور منقش تھیں۔"[2]

فاطمی اماموں نے اپنے قصر والیوان میں کتب خانے کا بھی انتظام کیا
قیام سلطنت کے اول دن ہی سے فاطمی امام اور ان کے دعاۃ مختلف
علوم کے نادر مخطوطات جمع کرتے رہے حتیٰ کہ مکتبۂ قصر، عالم اسلام کے
تمام کتب خانوں کا سرتاج تسلیم کیا گیا۔"[3]

وزیر یعقوب بن کلس کا کتب خانہ چالیس جدا جدا کتب خانوں پر مشتمل
تھا، جن میں سے ایک کتب خانہ میں صرف علوم قدیمہ یعنی فلسفہ وغیرہ
کی اٹھارہ ہزار کتابیں تھیں۔ مؤرخین نے دعوے کیا ہے کہ کل اسلامی
دنیا میں کوئی کتب خانہ اس کا ہمسر نہیں تھا۔ ابن ابی طے نے کتابوں کی
مجموعی تعداد چھ لاکھ ایک ہزار بیان کی ہے۔

ایک وقت امام عزیز کے سامنے "کتاب العین" کا ذکر آیا تو آپ
کے حکم سے داروغہ کتب نے کتاب مذکور کے قریب تینتیس نسخے پیش
کیے۔ جن میں سے ایک خود مصنف یعنی خلیل بن احمد بصری کے ہاتھ کا
لکھا ہوا تھا۔"[4] اس کتب خانہ میں ۱۲۰۰ نسخے تاریخ طبری کے تھے
"الجمہرہ لابن درید" کے ایک سو نسخے تھے۔ اگرچہ ہم صحیح تعداد کتب
کرنے سے قاصر ہیں تاہم کتابوں کی تعداد اس کتب خانہ میں ایک
بیس ہزار سے تو بہر حال زیادہ ہوگی۔ کیونکہ عہد فاطمی میں بار بار ...

[ہو]نے کے باوجود صلاح الدین نے فتح مصر کے وقت اپنے وزیر الفاضل [کو ا]یک لاکھ بیس ہزار کتب دے دینے کے بعد جب بقیہ کتابوں کو نیلام کے ذریعہ جو ہفتہ میں دو بار ہوتا تھا فروخت کرنا شروع کیا تو اسے کئی سال لگے۔ کتابوں کی تعداد اور بھی زیادہ بڑھ جاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ عہد مستنصری کے فوجی فساد میں کتب خانہ کی بربادی کے بعد بھی ابن [م]یسر کے قول کے مطابق امام آمر کے وزیر افضل بن بدر الجمالی کے پاس پانچ لاکھ مجلدات تھیں (۷)۔"

[م]اخذ

۱۔ ابن اثیر، ج ۸، ص ۲۹
۲۔ الخطط (مقریزی) ج ۱، ص ۴۰۸
۳۔ الفاطمیون فی مصر، (حسن ابراہیم)، ص ۸۱
۴۔ الخطط (مقریزی) ج ۲، ص ۲۵۳
۵۔ الخطط (مقریزی) ج ۲، ص ۲۵۵
۶۔ کتاب الروضتین لابی شامہ، ص ۲۸۸
۷۔ اخبار مصر، ۵۷، بحوالہ "عہد فاطمی میں علم و ادب" ص ۵۰

عہدِ فاطمی کے عام کتب خانے

قصرِ شاہی کے کتب خانوں کے علاوہ فاطمی خلفاء نے عام کتب خانے بھی بڑی تعداد میں قائم کیے تھے۔ اور ان کی سرپرستی کی تھی۔ ان کتب خانوں میں مطالعہ اور تحقیق کا کام کرنے والوں کو ہر طرح کی ضروری سہولتیں میسر تھیں۔

کتب خانہ ہائے عوام کی عمارات کے بنانے میں بہت ہوشیاری سے کام لیا جاتا تھا۔ بعض کتب خانوں میں جو شیراز، قرطبہ اور قاہرہ میں واقع تھے مختلف کاموں کے لیے جدا جدا کمرے تھے۔ گیلریاں الگ تھیں جہاں کتابوں کی الماریاں رکھی جاتی تھیں۔ مطالعہ کرنے والوں کے لیے کمرے الگ تھے۔ مسودات کی نقلیں کرنے والوں کے کمرے الگ تھے۔ ادبی اجتماعات کے لیے کمرے جدا تھے اور بعض جگہ جشنِ موسیقی کے لیے کمرے الگ تھے۔ تمام کمرے فرش فروش سے مزین رہتے تھے۔ فرش پر چٹائیاں اور قالین بچھائے جاتے تھے۔ جہاں مطالعہ کرنے والے مشرقی طور پر آلتی پالتی مار کر بیٹھتے تھے اور لکھتے پڑھتے تھے۔ کھڑکیوں اور دروازوں پر پردے لٹکائے جاتے تھے۔ داخلی

دروازوں پر خاص طور پر بھاری پردہ لٹکایا جاتا تھا تاکہ سرد ہوا کی روک تھام ہو سکے۔[1]

عظیم الشان فاطمی کتب خانے کی عمارت اس قدر وسیع تھی کہ اس میں چالیس کمرے تھے، اور ہر کمرے میں اٹھارہ ہزار کتابوں کے رکھنے کی گنجائش تھی۔[2]

مصر میں فاطمی کتب خانے کے متعدد کمرے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں اس کتب خانے کی کوئی مکمل فہرست نہ تھی۔ بجائے اس کے ہر کمرے کے دروازہ پر اس کمرہ کی کتابوں کی فہرست لگی رہتی تھی۔[3] لیکن ابوالقاسم الجرجانی وزیر نے ۴۳۵ھ میں حکم نافذ کیا کہ کتب خانے کی ایک پوری فہرست تیار کی جائے۔ اس کام پر القاضی ابوعبداللہ القضاعی اور ابوخلف الورّاق کا تقرر ہوا۔[4]

مہتمم کتب خانہ اپنے کتب خانے کی انتظامی اور علمی معاملات کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ وہ نئی کتابیں مہیا کرتا تھا۔ فہرستوں کی تیاری اس کی نگرانی میں ہوتی تھی، اور مطالعہ کرنے والوں کو ہر قسم کی سہولت اور مشورہ دیتا تھا۔ اگر ضرورت ہو تو کتاب کی جلدبندی اور مرمت کے احکامات نافذ کرتا تھا۔ کتابیں مستعار دیتے وقت اس کی منظوری کی ضرورت ہوتی تھی اور ایسے ہی لوگوں کو کتاب دی جاتی تھی جو اس سے مستفید ہو سکیں۔ اور اگر ایک کتاب کے کئی مطالبے ہوں تو غریب آدمی کو ترجیح دی جاتی تھی کیونکہ پیسے والا آدمی تو کتاب خرید بھی سکتا تھا۔[5]

ان تمام فرائض کے لیے ایک مہتمم کافی ہوتا تھا۔ لیکن بڑے پبلک کتب خانوں میں مددگار مہتمم بھی مقرر کیے جاتے تھے۔[6]

جلدبندی نہایت معمولی طریقہ پر شروع ہوئی تھی لیکن بہت جلد ترقی کرکے اس نے ایک فن کی صورت اختیار کر لی۔ اس فن میں اور زیادہ ترقی

ہوئی اور چمڑے کی جلدیں نہایت خوش نما اور منقش بنائی جانے لگیں۔[۸۷]

عنایت اللہ کا بیان ہے کہ جلدیں نہایت نفاست سے چمڑے کی بنائی جاتی تھیں۔ سب سے پرانی اسلامی جلدیں مصریوں کی بنائی ہوئی ہیں اور وہ غالباً آٹھویں یا نویں صدی عیسوی کی ہیں۔ جب اس فن کو اور ترقی ہوئی تو مسلمان جلد سازوں کے لیے سنہری اور سادہ ٹھپہ لگانا اور کناروں پر نقش و نگار بنانا معمولی کام ہوگیا۔[۸۸]

الحاکم کے کتب خانے میں سالانہ میزانیہ سے متعلق المقریزی سے روایت ہے کہ اس کے اخراجات کی تفصیل یہ تھی:

کاغذ برائے نقل نویساں	۹۰ دینار
مہتمم کتب خانہ کی تنخواہ	۴۸ 〃
خدمت گار کی تنخواہ	۱۵ 〃
مرمت کتب	۱۲ 〃
کاغذ، قلم و سیاہی جو مفت دیا جاتا تھا	۱۲ 〃
چٹائیاں	۱۰ 〃
پانی	۱۰ 〃
موسم سرما کے لیے اونی قالین	۵ 〃
موسم سرما کے لیے گدّے	۴ 〃
دروازوں کے پردوں کی مرمت[۹۱]	۱ 〃

کتب خانوں کے اندر یا باہر علمی و ادبی اور تحقیقی مجالس کا انتظام بھی تھا جہاں مختلف اہم موضوعات پر گفتگو اور تبادلۂ خیال کا سلسلہ اہل علم کے مابین جاری رہتا تھا۔

ابن کلس نے ادبی نشستوں کے لیے منگل کا دن مقرر کیا تھا۔ جہاں فقیہ، متکلمین، اور منطقی جمع ہوا کرتے تھے اور ان اہل علم کے درمیان

بحث مباحثہ ہوا کرتا تھا۔[۱۰]

اسی قسم کی ایک علمی مجلس مناظرہ الحاکم نے ۴۰۳ھ میں منعقد کی جہاں علمائے علم الحساب، منطق، فقہ، طب و دیگر علوم مدعو کیے گئے۔ وہاں انھوں نے بہت سے مسائل بحث و مباحثہ کے بعد طے کیے اور جلسہ کے اختتام پر خلیفہ نے ان کو خلعت اور انعامات سے نوازا۔[۱۱]

ملک الصالح طلائع بن زریک کے دربار میں اس عہد کے بیشتر علماء جمع ہو گئے تھے جن کے تذکرہ میں عمارہ الیمنی کا بیان ہے کہ "ان اہل علم میں سے ہر شخص نہایت اعلیٰ معیار کا عالم تھا اور بڑی با وقعت شخصیت کا مالک تھا۔ میں نے ان کے طور طریقے سیکھ لیے اور ان کی صحبت سے فائدہ اٹھایا حتیٰ کہ وہ مجھے اپنے جلسوں میں شریک کرنے لگے۔ یہ جلسے اکثر منعقد ہوا کرتے تھے اور اکثر ملک الصالح بھی اپنے اشعار سنایا کرتا تھا۔"[۱۲]

مصادر

۱- Islamic Culture (1948) P-227

۲- الخطط (مقریزی) ج ۱، ص ۴۰۸

۳- انسائیکلوپیڈیا آف اسلام - ج ۲، ص ۱۰۴۶

۴- اخبار الحکماء (القفطی) ص ۴۰۴

۵- مفید النعم (سبکی) ص ۱۵۹

۶- الخطط (مقریزی) ج ۱، ص ۴۵۸

۷- Islamic Culture (۱۹۳۵) P-134

۸- Islamic Culture (1938) P-168

۹- الخطط (مقریزی) ج ۱، ص ۴۵۹

۱۰- الخطط (مقریزی) ج ۲، ص ۳۴۱

۱۱- الفاطمیون فی مصر، (ڈاکٹر حسن ابراہیم) ص ۱۳۷ - النجوم الزاہرہ (ابن تغری) ج ۵، ص ۳۱۳-

جامع ازہر

جب قاہرہ کی بنیاد ڈال کر دولت و حکومت کے سیاسی تسلط کو مستحکم کر لیا گیا اور دعوت کا کام شروع کیا گیا تو فاطمیوں نے دعوت کی بنیاد کو پختہ بنانے کے لیے جامع ازہر کی بنا رکھی۔" ۳۶۱ھ میں یہ مکمل ہوئی۔ امام معز کے بعد ہر امام نے اس جامع پر نظر کرم رکھی اور اس میں تعمیری اضافے کرتے گئے۔ امام عزیز نے اس مسجد کو جامع بنا دیا۔ اور اس کے پڑوس میں فقیہوں کے لیے" دار الجماعت "تعمیر کروایا جس میں وہ نماز ظہر کے بعد جمع ہوتے اور عصر تک علمی مذاکرات کیا کرتے تھے۔ امام عزیز کے حکم سے وزیر سید نا یعقوب بن کلس نے فقیہوں کے لیے وظیفہ اور آذوقہ بھی مقرر کیا تھا۔ اس میں علمی مشاغل کو فروغ دینے کے لیے دور دور مقامات سے علمار و فقہار مدعو کیے گئے تھے۔ اور ان کی معقول تنخواہیں مقرر تھیں۔ فقہ اور وعظ و نصیحت کی مجلسیں منعقد ہوتی تھیں۔ جن سے استفادہ کرنے کے لیے دور دور سے طلبار کی کثیر تعداد آیا کرتی تھی۔ مختلف علوم کے لیے طلبہ حلقہ بنا کر فرش پر استاد کے ارد گرد بیٹھ جایا کرتے تھے۔ داعی الدعاۃ عورتوں کو بھی تاویل پڑھایا کرتے تھے اور

ان کا علیحدہ حلقہ ہوتا تھا۔[۲] اسی مسجد میں قاضی عبدالعزیز بن محمد بن نعمان اپنے دادا سیدنا القاضی النعمان کی کتاب "اختلاف اصول المذاہب" کا درس دیا کرتے تھے۔[۳]

قائد جوہر نے اس میں ایک نفیس کتب خانہ بھی قائم کیا تھا۔ جس کی شہرت کچھ دنوں بعد تمام آفاق میں پھیلی۔ امام حاکم نے جب دار الحکمۃ کی کتابیں جامع ازہر، جامع حاکم اور جامع مقس میں منتقل کرنے کا حکم صادر فرمایا تو تقریباً نصف کتابیں ازہر کے حصہ میں آئیں۔[۵]

جامع ازہر صرف علوم دعوت اور فاطمی علماء ہی کے لیے مخصوص نہیں تھی بلکہ اس میں شافعی اور حنفی وغیرہ مسلک کے عالموں کے بھی حلقے ہوا کرتے تھے۔ فاطمیوں نے علم و حکمت کی سرپرستی میں کبھی تعصب سے کام نہیں لیا۔ وہ علمائے اہل سنت اور اہل تشیع کے ساتھ بڑی فراخدلی سے پیش آتے تھے۔[۶] کئی بار اس جامع میں فاطمیین کے خلاف عقائد رکھنے والے فقیہوں نے اپنے عقیدہ و مسلک کے مطابق فیصلے دیے ہیں۔ امام حاکم نے مالکی مذہب کی تعلیم کے لیے دو فقیہہ بلوائے تھے۔[۷] اور ان کے بعد بھی دیگر اماموں کے عہد میں اکثر دیگر مذاہب کے فقہاء اور علماء آتے رہے۔ عبدالسلام بن محمد بن بندار ابو یوسف القزوینی "شیخ المعتزلہ" مصر آئے اور چالیس سال تک وہیں مقیم رہے۔

بلاشبہ جامع ازہر فاطمیوں کا سب سے بڑا اور لازوال کارنامہ ہے۔ یہ آج تک قائم ہے اور جب تک اس دنیا کے پردے پر مصر موجود ہے قائم رہے گا!

ڈاکٹر حسن ابراہیم نے بالکل سچ لکھا ہے:

"فاطمیوں نے جامع ازہر کی شکل میں مصر کے لیے ایک گراں قدر میراث چھوڑی ہے۔ اس سے ان کی ان کوششوں کا اندازہ کیا جا سکتا ہے

جو انھوں نے علوم و فنون کی نشر و اشاعت میں کی تھیں[۸]۔

لین پول نے ازہر سے متعلق اپنے تاثرات اس طرح بیان کیے ہیں:

"یہاں آج بھی بے شمار طلبا، اسلامی دنیا کے تمام اطراف سے آکر جمع ہوتے ہیں۔ گھانا سے لے کر ملایا کی ریاستوں تک سے طلبا آتے ہیں اور ہر ملک کے طلبا، کے لیے مخصوص رواق ہے۔ جامع ازہر میں یہ سب طلبا نصاب تعلیم کے مختلف شعبوں میں فاضل شیوخ سے تعلیم حاصل کرتے ہیں۔

ہر ملک کے نام پر اور مصر کے ہر صوبہ کے نام پر ازہر میں ایک رواق قائم تھا جہاں طلبا، نہایت آزادی سے اور بعض اوقات شیخ رواق کی نگرانی میں رہا کرتے تھے۔ طعام کے علاوہ مختلف اوقات میں انھیں شیرینی بھی دی جاتی تھی[۹]۔" ابن جبیر بحیثیت ایک عینی شاہد ان تمام سہولتوں کو جو مصر میں طلبا کو حاصل تھیں اس طرح بیان کرتا ہے:

" ہر طالب علم کے لیے ایک قیام گاہ ہے۔ استاد اس کے منتخب کردہ مضمون میں اسے تعلیم دیتا ہے۔ اور اس کی تمام ضروریات کے لیے وظیفہ مقرر ہے[۱۰]۔"

مصادر

۱- الخطط (مقریزی) ج ۴، ص ۴۹

۲- صبح الاعشیٰ (القلقشندی) ج ۳، ص ۳۶۶

۳- الخطط (مقریزی) ج ۲، ص ۲۲۶

۴- رفع الاصر، ص ۸۲ بحوالہ "عہد فاطمی میں علم و ادب" ص ۴۲

۵- الفاطمیون فی مصر، ص ۱۲۸

۶- عہد فاطمی میں علم و ادب، ص ۴۲

۷- النجوم الزاہرہ، ج ۴، ص ۱۷۸ بحوالہ "عہد فاطمی میں علم و ادب" ص ۴۳

۸- الفاطمیون فی مصر (ڈاکٹر حسن ابراہیم) ص ۳۱۵

۹- الخطط (مقریزی) ج ۲، ص ۲۷۶ ۱۰- الرحلہ (ابن جبیر) ص ۴۲

دار العلم یا دار الحکمت

فاطمی عہد میں دار العلم بھی علمی مرکز تھا۔ اسے امام حاکم نے ۳۵۵ ھ میں تعمیر کروایا اور اس میں مختلف علوم و فنون کی کتابیں رکھیں۔ اگرچہ تمام ممالک اسلامیہ میں کثرت سے جابجا کتب خانے قائم ہو چکے تھے لیکن تیسری صدی بلکہ چوتھی صدی ہجری کے آخر تک کسی پبلک کتب خانہ کا پتہ نہیں چلتا۔ سب سے پہلے جس نے اس عمدہ طریقہ کی بنیاد ڈالی وہ امام حاکم ہی تھے۔[۱] انھوں نے اس عظیم الشان کتب خانہ کا افتتاح کر کے بے شمار کتابیں عام لوگوں کے مطالعہ کے لیے وقف کر دیں۔ یہ کتب خانہ بڑی شان و شوکت سے کھولا گیا۔[۲]

فاطمی خلیفہ الحاکم بامر اللہ نے قاہرہ میں یوم شنبہ ۱۰ ر جمادی الاوّل ۳۹۵ھ کو دار العلم یا دار الحکمۃ کا افتتاح کیا تھا۔ افتتاح سے قبل بڑی تیاریاں کی گئیں کہ اس کے سامنے دورِ مامون الرشید کا دار الحکمۃ ماند پڑ گئے۔ تمام عمارت کو سجایا گیا اور اعلیٰ قسم کا خوش نما فرنیچر مہیا کیا گیا۔ دروازوں اور غلام گردشوں پر قیمتی پردے لٹکائے گئے اور ضروری عملہ کا انتخاب کیا گیا۔ شاہی محل میں جس قدر کتابیں تھیں انھیں دار العلم

میں منتقل کرنے کے احکام نافذ کیے گئے۔ اور دارالعلم میں ایسا ذخیرۂ کتب جمع ہوگیا جو بادشاہوں ہی کے پاس ہو سکتا تھا۔ مختلف مضامین پر کتابیں جمع ہوگئیں جن میں سے بیشتر مصنفین ہی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھیں۔ یہاں درس و تدریس کے لیے حفاظ، ہیئت داں، نحوی، ماہرین علم اللسان اور اطبا مقرر کیے گئے۔ علاوہ ازیں سب بے حد آسانیاں مہیا کی گئیں۔ مثلاً قلم، کاغذ، دوات مفت مہیا کیا جاتا تھا۔ بلا تخصیص ہر شخص کو کتب خانے میں آنے کی اجازت تھی۔ چنانچہ طلبا کا ایک ہجوم رہا کرتا تھا۔ کچھ درس میں شرکت کے لیے آتے تھے اور کچھ کتابوں کی نقلیں کرنے کے لیے۔ ابوشامہ اور المقریزی متفق ہیں کہ یہ کتب خانہ عجائبات عالم میں سے تھا اور یہ کہ قرون وسطیٰ کے اسلامی کتب خانوں میں بے نظیر تھا۔[۴۰]

یہ بیش بہا کتب خانہ اس وقت تک قائم رہا جب المستنصر کے دور میں خانہ جنگی شروع ہوئی۔ اس جنگ کے دوران میں وحشی ترکوں نے دارالعلم کو لوٹ لیا اور نہایت بیش بہا ذخیرہ ہائے فنون کو تباہ کر دیا۔ اور انتہا یہ کہ اس بے مثال کتب خانے کو بالکل برباد کر دیا۔ نایاب مسودات سے آگ سلگائی جاتی تھی۔ کتابوں کی جلدوں سے سپاہیوں کے جوتوں کی مرمّت کی جاتی تھی۔ اور بے شمار کتابیں پھاڑ پھاڑ کر باہر سے پھینک دی گئیں۔ جن کے ڈھیر لگ گئے تھے۔ جو "طلال الکتب" کے نام سے مشہور ہو گئے تھے۔"[۴۱]

جب بدر الجمالی کو مصر کے معاملات کی سربراہی حاصل ہوئی تو اس نے حتی الوسع کتابیں دوبارہ جمع کرنے کی کوشش کی اور جس قدر کتابیں مل سکیں ان سے دوبارہ کتب خانہ قائم کر دیا۔ یہ کتب خانہ فاطمی محلات میں اس وقت تک قائم رہا جب صلاح الدین نے اس خاندان کو شکست

دیا اور کتب خانے کو ختم کر دیا۔ بہت سی کتابوں کو برباد کر دیا، بعض کو نیلام کر دیا اور باقی کتابیں اس نے اپنے معتمدین القاضی الفاضل اور عماد الدین اصفہانی کو دے ڈالیں۔(۵)

دار العلم میں اکثر مناظرے ہوا کرتے تھے جو عموماً حجت اور نزاع پر ختم ہوتے تھے۔(۶)

دار الحکمت زمانے کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ ترقی و تنزل کی راہوں سے گزرنے کے باوجود اوائل چھٹی صدی تک قائم رہا۔ پھر جب الملک الافضل کو پتہ چلا کہ دار الحکمۃ کو بعض لوگ مخصوص مقاصد و غرض کے لیے استعمال کر رہے ہیں تو اس نے اس کو فوراً بند کر دینے کے احکامات جاری کر دیئے۔(۷) ۵۱۷ھ میں المامون البطائحی نے خلیفہ کے حکم سے دار العلم پھر کھول دیا۔(۸) چنانچہ پھر اسی زور شور سے کام شروع ہو گیا جیسا کہ پہلے تھا۔ اور زوال خاندان فاطمی تک یہی کیفیت رہی۔ صلاح الدین نے اسے ختم کر کے اس کی جگہ ایک شافعی مدرسہ قائم کیا۔(۹)

حواشی

۱۔ عہد فاطمی میں علم و ادب، ص ۴۵

۲۔ رسائل شبلی (اسلامی کتب خانے)

۳۔ الخطط (مقریزی)، ج ۱، ص ۴۰۹

۴۔ Lane Poole History of Egypt p.149

۵۔ الخطط، ج ۱، ص ۴۰۹

۶۔ تاریخ التمدن الاسلامی (جرجی زیدان)، ج ۳، ص ۲۱

۷۔ الخطط (مقریزی)، ج ۱، ص ۴۵۹

۸۔ الخطط (مقریزی)، ج ۱، ص [illegible]

۹۔ العبر (ابن خلدون) [illegible]

علومِ فلسفہ وریاضی وسائنس

فاطمی امام فلسفہ وسائنس کے بڑے مربّی تھے۔ انھوں نے کالج کتب خانے اور دارالحکمت کو نہ صرف کتابوں سے سجایا۔ بلکہ آلاتِ سائنس سے بھی معمور کردیا۔ دو لاکھ ستاون ہزار دینار جو کالجوں کی سالانہ آمدنی تھی وہ آلاتِ سائنس پر صرف ہوتی تھی۔ علم ہیئت کو ترقی دینے کے لیے رصدگاہیں بنائی گئیں اور سائنس وفلسفہ کے بڑے بڑے ماہر و کامل استاد ایشیا اور اندلس سے بلائے گئے (۱)

امام حاکم کو نجوم کا سب سے زیادہ شوق تھا۔ انھوں نے جبل مقطم پر ایک رصدگاہ تعمیر کروائی۔ اور ابوالحسن علی بن یونس کو زیج تیار کرنے کا حکم دیا۔

ابن السنبذی علم اصطرلاب کا بڑا ماہر تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ ۴۳۵ھ میں جب وزیر ابوالقاسم علی بن احمد الجرجرائی نے کتب خانہ کا جائزہ لیا تو قاضی ابوعبداللہ القضاعی اور ابن خلف الورّاق کو حکم دیا کہ کتابوں کی فہرست تیار کریں اور جو جلدیں خراب ہوگئی ہوں ان کی مرمت کرائیں۔ میں بھی ان دونوں کے ہمراہ کتب خانہ گیا۔ وہاں صرف

نجوم، ہندسہ اور فلسفہ کی کتابوں کی تعداد چھ ہزار پانچ سو تھی۔ اور ایک جگہ دو کرّے تھے۔ جن میں سے ایک تانبے کا تھا۔ جو بطلیموس کے ہاتھ کا بنا ہوا تھا۔ اور دوسرا چاندی کا تھا۔ اس کا وزن تین ہزار درہم تھا اور اسے تین ہزار دینار میں خرید اگیا تھا۔ ابن السندی نے ۴۲۵ھ میں وفات پائی"[۲]

ابوالحسن علی بن عبدالرحمٰن بن احمد بن یونس علم ہیئت کا ماہر خصوصی تھا۔ اس نے اپنی تمام عمر اسی فن کے مسائل کی تحقیق میں گزار دی۔

قاہرہ میں گیارھویں صدی عیسوی (پانچویں صدی ہجری) میں ایک ایسا ریاضی دان اور ماہر طبیعیات نظر آتا ہے جو سارے قرون وسطیٰ میں اپنے فن میں ثانی نہیں رکھتا تھا۔ وہ ہے ابوعلی محمد بن الحسن بن الہیثم"[۳] وہ بصرہ کا باشندہ تھا۔ اور وہاں کسی سرکاری دفتر کا مہتمم تھا۔ وہاں سے اس نے شام کا سفر کیا اور کچھ عرصہ تک رہنے کے بعد قاہرہ امام حاکم کی خدمت میں چلا گیا جہاں وہ بعض محکموں کا متولی رہا اور امام کی وفات کے بعد جامع ازہر کے پاس ایک مکان میں گوشہ نشینی اختیار کرلی اور ۴۳۰ھ میں وفات پا گیا۔

ابن الہیثم نے ایک خاص کتاب تالیف کی کہ جو شیشے آتشی ہوتے ہیں ان میں نگاہ سیدھی رہتی ہے اور عکس فگن ہوا کرتی ہے"[۴]

اسی نے سب سے پہلے یہ معلوم کیا کہ اجرامِ سماوی جب افق کے قریب آتے ہیں تو ان کا جرم بڑھ جاتا ہے۔ لارڈ ایکن اس انکشاف کو بطلیموس سے منسوب کرتا ہے۔ حالانکہ یہ اس فاطمی عالم کا ایجاد کردہ نظریہ ہے۔

اسے ریاضی اور ہندسہ میں انتہائی کمال حاصل تھا۔ اس نے مجسطی کی تفسیر کی اور ایک دوسری کتاب ان تعریفات کی لکھی جو اقلیدس کے اوّل

مبادی میں ذکر کی گئی تھیں۔

"المعلومات الھندسہ" بھی اسی کا رسالہ ہے[۶]۔ ہندسہ میں ان کتابوں کے قلمی نسخے پیرس میں موجود ہیں جن کو مستشرق سیدیو نے ۱۸۳۴ء میں دریافت کیا تھا۔ اس کی بعض اور کتابیں آکسفورڈ، بوڈلین اور لیڈن کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔ یہ فلسفہ کا بھی ماہر تھا۔

قفطی نے ابن الہیثم کی ۶۷ تصنیفات بتائی ہیں اور ابن ابی صیبعہ نے اس کی تصنیفات کی تعداد تقریباً دو سو لکھی ہے۔ اس نے ہندسہ، طبیعیات، فلکیات، حساب، جبر، طب، منطق، فلسفہ اور اخلاق پر کئی کتابیں اور رسائل لکھے تھے۔ اسے بیہقی بطلیموس ثانی کہتا ہے[۷]۔

مصادر

۱۔ تاریخ عمدۃ الکلام، ص ۱۲۶، بحوالہ 'عہد فاطمی میں علم و ادب' ص ۱۴۱

۲۔ عیون الاخبار، ج ۶، ص ۱۷۱

۳۔ 'تاریخ عرب' (موسیو سدیو)، ص ۳۹۸

۴۔ 'تاریخ عرب' (موسیو سدیو)، ص ۳۹۶

۵۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، ص ۷۸۵، ج ۱، بارھواں ایڈیشن

۶۔ 'تاریخ عرب'، ص ۳۸۵

۷۔ 'تاریخ عرب'، ص ۴۰۰

اخوان الصفا

مجموعۂ معقولات و منقولات

رسائل اخوان الصفا پر علمی حلقوں میں بہت کچھ بحث و گفتگو ہو چکی ہے۔ اس باب میں خالص اسماعیلی نقطۂ نظر کیا ہے؟ یہ بھی معلوم کیجیے۔ یہ بات تو بغیر اختلاف و نزاع کے سب مانتے ہیں کہ یہ رسالے اسماعیلی قلم سے نکلے ہیں۔

"امام احمد المستور کا شہرۂ آفاق دینی فلسفیانہ شاہکار "رسائل اخوان الصفا" کی صورت میں آج تک موجود ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ خلیفہ مامون عباسی کے زمانہ میں فلسفۂ یونان نے اس قدر فروغ حاصل کیا کہ جس سے عقائد میں ایسی دور از کار بحثیں پیدا ہو گئیں جن سے شریعت اسلام پر بہت برا اثر پڑا اور لوگ مذہب کے بہ نسبت فلسفہ کی طرف زیادہ راغب ہونے لگے۔ فرزند رسولؐ نے اس خطرہ کا احساس کرتے ہی علوم متداولہ اور فلسفہ سے اسلام کے اصول، توحید، رسالت، نبوّت، امامت، معاد، بعث اور وجود نفس وغیرہ کو ثابت کیا۔ ان رسائل کے مصنف کی غرض علوم متداولہ بیان کرنے کی نہیں تھی بلکہ ان کی مدد سے شریعت کے

اصولوں کو ثابت کرنا تھا۔ ان رسائل کی تصنیف کی غرض خود امام ہی بیان کرتے ہیں:

"لوگوں نے شریعت کو تبدیل کر دیا ہے۔ ہمارا فریضہ یہ ہے کہ ہم اسے پاک کریں اور لوگوں کو یہ بتلائیں کہ شریعت در حقیقت حکمت اور فلسفہ پر مبنی ہے۔ اس لیے ہم نے علوم متداولہ کے ذریعہ وجود نفس اور آخرت کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہر فن کے چند ابتدائی مسائل بیان کیے ہیں تاکہ تمام اہل فنون ان کے ذریعہ شریعت سے واقف ہوں۔ ہمارے رسائل چار اجزا پر مشتمل ہیں۔ ہر جز میں متعدد رسائل ہیں۔ ان کی کل تعداد باون ہے۔ پھر ان تمام رسالوں کا خلاصہ ایک الگ رسالہ میں لکھا گیا ہے جو ترپنواں رسالہ ہے۔ اور جس کا نام ہم نے جامع رکھا ہے۔ اس میں ہم نے اپنے مقاصد پر روشنی ڈالی ہے۔ ہمارے علوم چار قسم کی کتابوں سے ہیں جو کتب حکماء اور فلاسفہ، کتب انبیاء، کتب الطبیعیہ، اور کتب الٰہیہ ہیں۔"

ثبوت نفس، اس کی مختلف قوتیں اور اس کے گوناگوں افعال کے بیان میں یہ رسائل ایک ایسی بہترین کتاب ہیں جس کی نظیر نہیں۔ آخرت کی طرف شوق دلانے والی نصیحتیں جس موثر پیرایہ میں کی گئی ہیں وہ قابل تعریف ہے۔ دوسری خوبی بقول ڈاکٹر طٰہٰ حسین یہ ہے کہ ایسے مشکل فلسفیانہ مسائل نہایت فصیح عبارت اور سلیس و عام فہم انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔
مولانا سید ابوظفر ندوی عہد حاضر کے ژرف نگاہ مؤرخ گزرے ہیں۔ انھوں نے بھی ایک کتاب میں اس موضوع پر اظہار خیال کیا ہے۔ ضروری ہے کہ وہ بھی پیش نظر رہے:

اپنے والد کے انتقال کے بعد سیدنا امام احمد منصوص ہوئے۔ آپ
جو اپنے وقت کے بہترین فاضل تھے اس لیے قدرتی طور پر اشاعتِ علوم
کی طرف زیادہ مائل تھے۔ فرقہ اسماعیلیہ میں مشہور ہے کہ "رسائل اخوان
الصفا" آپ ہی نے تحریر فرمائے ہیں۔ جس کے آخری رسالہ کا نام "الجامعہ"
ہے۔ جس میں (۵۲) باون رسالوں کا خلاصہ درج ہے۔ اور یہ کل ۵۱ رسائل
شائع ہو چکے ہیں مگر قلمی اس وقت جناب داعی مطلق سیدنا ابو محمد طاہر
سیف الدین صاحب کے کتب خانہ سورت میں محفوظ ہیں"(۲)۔

ڈاکٹر زاہد حسین نے جو اسماعیلی مذہب کے ایک فرد تھے "اخوان الصفا"
کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے:

"متعدد رسالوں میں اخوان الصفا نے یہ کہا ہے کہ لوگ دین سے پھر
گئے ہیں۔ شریعت کو انھوں نے چھوڑ دیا ہے۔ اہل حق نہیں رہے اور
باطل کا غلبہ ہو گیا ہے۔ فتنے جاگ اٹھے ہیں اور فسادات پھیل گئے
خاص کر "رسالۃ الحیوانات" کی تاویل میں یہ بیان کیا ہے کہ
مومنین پر ظلم ہو رہا ہے۔ یہ بے چارے اس طرح اپنے دشمنوں کے قبضے
میں ہیں جس طرح حیوانات محکوم انسان کے ہاتھ میں مقید ہیں۔ مستقبل قریب
میں خدا تعالیٰ ان کی تکلیف دور کر دے گا۔ ان کی دعا سنے گا اور ان کی
مدد کرے گا۔ اخوان الصفا کی نیند طویل ہو چکی اب ان کا سونے والا ہوشیار
ہوگا۔ اور زمین کو عدل و انصاف سے منور کرے گا جیسا کہ وہ جور و ظلم سے
بھر گئی ہے اور مومنین کو عبودیت اور ذلت کی قید سے چھڑائے گا۔
حق کا کلمہ بلند ہو گا اور اخوان الصفا کی دعوت ظاہر ہو گی۔ اس وقت
خدا تعالیٰ زمین کو جاہلیت کی نجاست سے پاک کرے گا اور ان پھاڑ
کھانے والے درندوں کو ہلاک کرے گا جو ایسے بہائم پر مسلط ہو گئے ہیں
جن کے پاس نہ دانت ہیں نہ چنگل۔

اور ایک رسالے میں یہ ہے کہ افلاک کی گردش بدل گئی ہے۔ اہل
کی مدت ختم کے قریب ہے۔ اہل خبر کا دور شروع ہونے والا ہے۔
ایک اور مقام پر تو اپنی پیشین گوئی کی تائید میں یہ کہا ہے کہ
ظہور کا سال بلکہ مہینہ بھی بتا سکتے ہیں۔ تم ہمارے بھائیوں کو خوشخبری
دو کہ اہل خیر کا زمانہ قریب ہے۔ اور کشف بہت جلد شروع ہونے
ہے ہم اس کی خوش خبری دیتے ہیں۔"[۱۴]

ماخذ

۱- عہد فاطمی میں علم و ادب، ص ۶۲، ۶۳، ۶۴
۲- شجرۂ نسب: احمد بن عبداللہ بن محمد بن اسماعیل بن امام جعفر صادق
۳- عقد الجواہر فی احوال البواہر، ص ۱۵
۴- ہمارا اسماعیلی مذہب، ص ۶۲

طب

○

تاریخ صقلیہ میں مرقوم ہے:

"سلانوں کے مدرسہ طبیہ سے ان خدمات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ
سلمانان صقلیہ کے ہاتھوں فن طب کی انجام پائی تھیں۔ مسلمانان صقلیہ
دلس کے ذریعہ یورپ کے جدید علم طب میں جو اضافے ہوئے ہیں مسٹر
وٹ نے انھیں ایک جگہ بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں:"

"تمام یورپ مسلمانانِ اندلس و صقلیہ کا شکر گزار ہے کہ انھوں نے
وات میں کچلہ و املتاس، حب الملوک، املی، مرہ، صندل، کباب
ریوند چینی اور کافور؛ اور مرکبات میں جلاب الکبیر، شربت اور
خوشبودار مصالحوں میں قرنفل، جوزبوا، زنجبیل اور الائچی سے
شناسا... یہ چیزیں یورپ کے بازاروں میں اب بھی اپنے عربی ناموں
سے موسوم چلی آتی ہیں۔ صقلیہ کے قوانین اس معاملہ در دواخانوں
کی دیکھ بھال اور دوا سازی میں احتیاطی تدابیر اختیار کرنے میں اور
سخت تھے۔ ہر دوا ساز کو اپنی دوا سازی کی قابلیت کا سخت امتحان
دینا پڑتا تھا۔ اطباء کے سامنے ہو کر اس کو قسمیں کھا کر یہ اقرار کرنا

پڑتا تھا۔ اگر کوئی دوا فروش مقررہ درجہ سے کمتر درجہ کی دوائیں
کرے گا تو وہ اس کی اطلاع اطبا اور حکومت کو دے گا۔ بددیانتی
اور فریب کی روک تھام کے لیے تو یہ تدابیر اختیار کی جاتی تھیں
عوام کے فائدہ کے لیے دواؤں کا نرخنامہ ہر دکان پر رکھا رہتا
دہ دکاندار زیادہ قیمت نہ لے سکیں۔ ان قواعد کی جو کوئی خلاف
کرتا تھا اس کو سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔ انہی قواعد کو
فریڈرک دوم نے اپنے ملک میں نافذ رکھا، اور انہی قوانین کی
سلرنو اور نیپلس کے مدارس طبیہ کو کامیابی ہوئی اور صقلیہ نے تمام
میں فن طب میں شہرت تامہ حاصل کی"[1]۔

اسی طرح موسیولیبان لکھتے ہیں :

"عربوں کی طبی ترقی زیادہ تر فن جراحی، علاجات امراض، قرابادین
اور ادویات میں ہے۔ انھوں نے بہت سے طریق علاج ایجاد کیے
قرابادین میں انھوں نے بہت سی دوائیں بڑھائی ہیں۔ دواؤں کے
گے وہ طریقے بھی انہی نے نکالے ہیں جو اب اتنے زمانہ کے بعد نئی ایجاد
کے نام سے مشہور کیے جاتے ہیں . . . . . فن جراحی کی بھی
ترقی عربوں ہی سے ہوئی۔ اور زمانہ حال تک ان ہی کی تصنیفات
یورپ کے مدارس طبیہ کا دارو مدار رہا ہے"[2]۔

عصر فاطمی میں کئی نامی گرامی اطبا ہوئے جنھوں نے اپنے
و مناظرات اور تصنیفات و تالیفات کے ذریعہ طب کی نشر و اشاعت
کی۔ دیگر عالموں اور فاضلوں کی طرح طبیبوں پر بھی اماموں نے نوازش
اور اپنی حکومت میں ان کو اعلیٰ عہدوں پر مامور کیا۔

امام مہدی کا طبیب خاص ابو یعقوب ایک فاضل یہودی
بن عمران عرف "سم الساعۃ" کا شاگرد تھا۔ وہ طب کے علاوہ

بں بھی ماہر تھا۔ اس نے سو سال سے اوپر عمر پائی۔ مگر اس طویل عمر میں اس نے زیادہ انتشار کیا اور نہ مال و دولت جمع کی۔(۱)

امام معز کے عہد کا مشہور یہودی طبیب موسیٰ تھا۔ امام نے اس کے دونوں بیٹوں اسحاق اور سلیمان کو طبابت کے اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا تھا۔ وہ فن ... کو پیا ... میں ممتاز مصنف، مفردات و مرکبات کا ماہر اور ترکیب ادویہ میں یکتا تھا۔(۴)

عہد معز میں ایک اور طبیب سعید بن بطریق نامی گذرا ہے جو اسکندریہ کے ... کا بطریق بھی تھا۔ اس نے فن طب کی ایک تاریخ لکھی تھی جس کا عربی اور لاطینی نسخہ ۱۶۵۴ء میں آکسفورڈ سے شائع ہوا۔(۵)

طبیب محمد بن احمد بن سعید التمیمی بیت المقدس سے امام معز کے عہد میں مصر آیا۔ اور خواص عقاقیر و تراکیب ادویہ میں بڑی شہرت حاصل کی۔

طبیب منصور ابن مقشر نصرانی تھا۔ اس نے طب میں اس قدر کمال حاصل کیا کہ امام عزیز کا طبیب خاص ہو گیا۔

عمر بن علی الموصلی امام حاکم کے عہد کا باکمال طبیب تھا۔ اس نے ایک کتاب "دواء المنتخب فی علاج العین" لکھی۔

ابوالحسن علی بن رضوان جیزہ میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ تنور ساز تھا۔ پہلے اس نے ایک تنگدست اور مفلس باپ کی اولاد کی طرح پرورش پائی لیکن چونکہ قدرت نے اس کو علم و کمال کے حصول کا شوق عطا کیا تھا۔ پہلے دس سال کی عمر میں طب اور فلسفہ کا مطالعہ کیا۔ بتیس سال کی عمر میں اسے اتنی شہرت ہوئی کہ امام حاکم نے اسے "افسر الاطباء" مقرر کیا۔(۶) اس کی تصانیف ایک سو سے زائد ہیں جن میں اس کی بقراط اور جالینوس کی بعض تصنیفات کی شرحیں بطلیموس کی کتاب "صد کال" کی شرح اور جالینوس کی کتاب "الفرق" کی شرح نہایت قابل قدر ہیں۔ مؤخر الذکر کتاب لاطینی زبان میں ترجمہ

ہو چکی ہے۔"

اسرائیلی طبیب افرائیم بن الزفان امام حاکم کے عہد کے افسر الاطباء ابن رضوان کا مشہور شاگرد تھا۔ اسے کتابیں جمع کرنے اور ان کی نقل کروانے کا بڑا شوق تھا۔ اس کے خزانہ کتب میں طب کے علاوہ دوسرے علوم کی بھی کتابیں تھیں۔ . . . . اس نے وزیر کے لیے بقراط کی "کتاب الایمان" کی شرح لکھی۔

مصادر

۱۔ اخبار الاندلس (اسکاٹ) ج ۳، ص ۱۴۵
۲۔ تمدن عرب، ص ۵۴، ۵۵۴
۳۔ طبقات الاطباء، ج ۲، ص ۳۶
۴۔ طبقات الاطباء، ج ۲، ص ۲۱۰
۵۔ A short History of the Fatimid Khalifate, p.230
۶۔ عیون الانباء، ج ۲، ص ۱۴۱
۷۔ طبقات الامم، ص ۱۲۳

فلکیات

○

وہ کون سا علم تھا جسے عربوں نے تجدید و احیار سے سرفراز نہیں کیا ؟ جسے انھوں نے بامِ عروج پر نہیں پہنچایا ؟ جسے اتنی ترقی نہیں دی کہ بالآخر اس کے موجد کہلانے لگے ؟ ان کے علمی ایجادات بھی اپنا ایک مقام رکھتے ہیں۔ اب ہم فلکیات سے متعلق عربوں کے کارناموں کا مختصر سا ذکر کریں گے۔

عرب کا ملک ریگستانی و سنگستانی ہے۔ گرمیوں میں شدت اور بادِ سموم کی لپٹ کی وجہ سے وہ راتوں کو سفر طے کرتے تھے۔ جب ستاروں کے سوا ان کا کوئی رفیقِ سفر نہیں ہوتا تھا۔ ریگستانی ملک ہونے کے سبب فضا بھی صاف رہتی تھی۔ اس بے نام و نشان صحرا میں ان کو سمت کا نشان ستاروں سے ملتا تھا۔ اسلام کے پہلے سے وہ ستاروں کا نام ملکوں کے انتساب سے لیتے تھے جیسے سہیل یمانی، شعریٰ شامیہ، ستاروں کے بڑے بڑے جھنڈ اور ممتاز ستارے مثلاً قطبین، سہیل، فرقدین، شعریٰ، بنات النعش، ثریا وغیرہ کو وہ شعرون میں اوقات اور سمتوں کی تعیین کے موقع پر استعمال کرتے تھے۔ یہی صورت انھوں نے سمندروں کے سفروں میں قائم رکھی۔ مختلف ملکوں کی سمتوں کو وہ ستاروں کے ذریعہ سے پہچان لیتے تھے۔ مزروقی کی کتاب ' الازمنہ والامکنہ ' -

میں عربوں کے علم نجوم کے بکثرت معلومات ہیں -

ابتداءً تو یہ معلومات جاہلیت کے خیال اور تجربوں پر مبنی تھے بعد کو
جب علم ہیئت و نجوم میں عربوں نے علمی حیثیت سے ترقی کی تو بحری سفر
میں انھوں نے ان علوم سے کام لیا۔ چنانچہ چوتھی صدی ہجری کے وسط میں
مقدسی عرب جہازوں کے مختلف عملہ کے جہاں نام لیتا ہے وہاں وہ "ریاضین
کا نام لیتا ہے"[1] جس سے اندازہ ہوگا کہ دسویں صدی عیسوی ہی میں عربوں
جہازرانی علمی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ یہ ریاضی داں طول البلد، عرض البلد
ستاروں کی شناخت کر کے سمت کا پتہ لگاتے تھے۔"[2]

بہرحال تحریری ثبوت کی حیثیت سے عرب جہازرانوں کی تاریخ میں قطب
ذکر سب سے پہلے ادریسی المتوفی ۵۴۹ھ کے جغرافیہ میں ملتا ہے۔ کتاب کا یہ
میں نے خود نہیں دیکھا ہے۔ بوشر (Bouchereau) اور موسیو لیبان نے اس کا
حوالہ دیا ہے۔ لیبان کہتا ہے:

"لیکن جو امر اسنادی ہے وہ یہ ہے کہ اہل یورپ کو عربوں ہی کے
ذریعہ سے قطب نما کا علم ہوا۔ وہ عرب ہی تھے جو چین سے تعلقات
رکھتے تھے، اور وہی اس ایجاد کو یورپ میں لا سکے تھے۔ اہل یورپ
نے اس کے استعمال کو بہت دنوں میں سمجھا کیونکہ انھوں نے تیرھویں
صدی عیسوی سے پہلے قطب نما کو استعمال نہیں کیا حالانکہ ادریسی جو
بارھویں صدی عیسوی کے وسط میں لکھتا ہے، بیان کرتا ہے
کہ عربوں میں اس کا استعمال عام تھا۔"

(ادریسی ۳۹۳ھ (۱۱۰۰ء) میں اندلس میں پیدا ہوا - اور اس نے
یہ کتاب سسلی میں ۴۲۸ھ مطابق ۱۱۰۲ میں لکھی -

مصادر

۱۔ احسن التقاسیم مقدسی مطبوعہ لیڈن، ص ۱۰
۲۔ عربوں کی جہازرانی (علامہ سید سلیمان ندوی) ص ۱۲۴
۳۔ عربوں کی جہازرانی (علامہ سید سلیمان ندوی) ص ۱۲۶

تقویم فاطمی اور نظامِ صوم

فاطمیوں نے اپنے دورِ حکومت میں قمری سال کو حساب لگا کر اتنا ہی سال
اور بر وقت بنا لیا تھا جتنا شمسی سال ہوتا ہے۔ اس نظام کے ماتحت رمضان
کے لیے رویتِ ہلال کی ضرورت نہیں تھی۔ تاریخ مقررہ پر آغاز ماہ رمضان
ہوتا تھا اور تاریخ اور وقتِ مقررہ پر بغیر اختلاف و فساد کے عید منائی
جاتی تھی۔ اسماعیلی حضرات آج تک اس نظام پر عامل ہیں۔

ہم یہاں پر ایک خاص رسالے کا ذکر کیے بغیر نہیں رہ سکتے جو "الرسالہ
فی اللازمۃ فی صوم شہر رمضان وحلیتہ" کے نام سے مشہور ہے۔
رسالے میں حمید الدین کرمانی نے جو باب الابواب تھے عقلی اور نقلی دلائل سے
رویتِ ہلال کے عقیدہ کو غلط ثابت کیا ہے۔ اور قرآن و حدیث کی روشنی
میں رمضان المبارک کے روزوں کی کل تعداد تیس ثابت کی ہے۔

اقتباس از رسالہ لازمہ مصنفہ علامہ احمد بن عبد اللہ حمید الدین
کرمانی باب الابواب خلیفہ فاطمی حاکم بامر اللہ :-

"خداوند تعالےٰ نے قرآن مجید کی اس آیت کے ذریعہ اپنے بندوں پر
روزہ فرض کیا ہے کہ تم پر گنتی کے روزے فرض کیے گئے ہیں جس طرح تم سے

لوگوں پر فرض تھے تاکہ شاید تم متقی اور پرہیزگار بن جاؤ۔ پیغمبر صلعم نے ارشاد فرمایا ہے کہ شعبان میرا مہینہ ہے اور رمضان اللہ کا جس کا روزہ رکھنا فرض ہے۔ ائمہ طاہرین کا ارشاد ہے کہ رمضان کا روزہ ہر مسلمان پر فرض ہے۔ خداوند تعالیٰ نے جب رمضان کا روزہ اپنے بندوں پر فرض کیا تھا تو اس وقت ان کو پیغمبر اسلام صلعم نے وقت کی معرفت اور تعین و حد بندی سے بے خبر نہیں رکھا تھا جس طرح ان کو دیگر فرائض سے بے خبر نہیں رکھا گیا تھا۔ مثلاً جب خدا نے نماز فرض کی تو نبی صلعم نے امت کو اس کی تعداد اور اوقات سے بے خبر نہیں رکھا اور زکوٰۃ فرض کی تو اصل ملکیت میں زکوٰۃ کی مقدار سے بے خبر نہیں رکھا۔ ہمارا یہ کہنا ہے کہ خداوند کریم نے تمام اشیاء کو جوڑدار (جفت جفت) پیدا کیا ہے تاکہ اس کی ذات وحدانیت میں یکتا اور منفرد رہے کوئی شے اس کی ذات میں شریک نہ ہو سکے۔

ہم نے تمام اشیاء کو جوڑدار اور مختلف صورتوں میں دیکھا ہے۔ مثلاً جوہر و عرض، آسمان و زمین، خشکی و تری، پہاڑ اور ہموار زمین، جسم و روح، ظاہر و باطن، دنیا و آخرت، مرد و عورت وغیرہ۔ جس کا سلسلہ طویل ہے۔ ہم نے یہ بھی دیکھا ہے کہ پیغمبر اسلام صلعم نے اپنی شریعت کا پایہ جوڑے کی کیفیت پر قائم رکھا ہے۔ وہ اس طرح کہ آپ نے احکام و فرائض کو ان کے ہم مثل احکام و فرائض سے جوڑ دیا۔ مثلاً نماز کو زکوٰۃ کے ساتھ، اذان کو اقامت کے ساتھ اور حج کو عمرہ کے ساتھ، رکوع کو سجود کے ساتھ، کلمۂ شہادت لا الہ الا اللہ کو محمد رسول اللہ کے ساتھ جوڑ دیا ہے۔ پس ہمارا یہ کہنا ہے کہ رؤیت بھی دو قسم کی ہے۔ جس کا ایک دوسرے سے اتصال و ارتباط ہے۔ یعنی رؤیت طبعی (جسمانی)، رؤیت نفسانی (روحانی)۔ پس رؤیت طبعی اشیاء میں سے اسی چیز کا ادراک کرتی ہے جو جسمانی ہے اور حد و زمان کے دائرے میں ہے جیسے رنگ و صور۔ اور رؤیت نفسانیہ جس کا تعلق قلب اور علم سے

ساتھ ہے وہ اس چیز کا بڑی جلدی ادراک کرتی ہے جس کا رؤیت طبعیہ ادراک
نہیں کرسکتی۔ مثلاً وہ اشیاء مستورہ جو ظاہری آنکھ سے نہیں دیکھی جا سکتیں
نتیجہ یہ معلوم ہوا کہ رؤیت نفسانیہ جس کا تعلق دل اور علم سے ہے رؤیت ظاہرہ
سے کہیں زیادہ اعلیٰ اور بلحاظ ادراک لطیف تر ہے کیونکہ رؤیت نفسانیہ کا
اثر اور اس کی پہنچ اشیاء کی معرفت اور حقائق تک ہوتی ہے کیونکہ یہ رؤیت
ظاہری کی طرح نہیں ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص کسی تالاب سے ایک
قطرۂ آب اٹھائے تو رؤیت نفسانیہ یہ فیصلہ کرے گی کہ اس پانی کی
مقدار بمقدار قطرہ کم ہوگئی ہے۔ رؤیت نفسانیہ کا یہ فیصلہ درست ہے
حالانکہ یہ کمی بظاہر چشم و بصارت کو محسوس نہیں ہوتی۔ اب کہ یہ معلوم ہوچکا
ہے کہ رؤیت نفسانیہ بلحاظ ادراک بہت زیادہ لطیف ہے تو پھر اسی رؤیت
نفسانیہ کے مطابق خداوند تعالےٰ کے فرائض پر عمل کرنا زیادہ ضروری اور
اولیٰ تر ہے بہ نسبت اس کے غیر کے۔ کیونکہ کسی افضل کے موجود ہوتے ہوئے
غیر افضل پر جمے رہنا جہالت اور نادانی ہے۔ اگر ایک شخص کو دل سے معلوم
ہوجائے کہ نماز کا وقت ہوگیا ہے تو اس پر نماز پڑھنا لازم ہے اگرچہ اذان
اذان کی سماعت سے اس کے گوش ناآشنا رہے ہوں۔ پس اہل دعوت
(فاطمیہ) رؤیت نفسانیہ کے مطابق جس میں خطا کا احتمال نہیں ہے حساب
سے روزہ رکھنے میں وقت وحجت پر عمل پیرا ہیں۔

جب چاند مہینہ کے آخر میں اجتماع کی طرف کوچ کرتا ہے اور ہر ماہ
شروع میں سورج سے الگ ہوجاتا ہے تو اس وقت چاند کی روشنی کا نظر نہ
آنا سورج کی روشنی کے سبب ہوتا ہے جو بصر کو ادراک سے روکتی ہے تو
اس صورت میں سورج کی روشنی کا چاند کے دیکھنے سے مانع ہونا ان دیگر اسباب
کی طرح ہے جو نگاہ کو رؤیت اور علم سے باز رکھتے ہیں۔ مثلاً بادل، غبار، دھواں
اور پہاڑ۔ یہ بھی جانتے ہیں کہ ستارے دن میں آفتاب کی روشنی کے سبب نظر

نہیں آتے۔ اور وہ اس کی روشنی میں چھپ جاتے ہیں۔ لیکن جب سورج کو گہن لگ جاتا ہے تو لبصر کو اس کی رؤیت ہو جاتی ہے۔ ایسا ہی آفتاب کو گہن لگ جانے کی وجہ سے ہوتا ہے جس کے سبب اس کی چمک ماند پڑ جاتی ہے۔ جب یہ بات مسلّم ہو چکی ہے کہ اگر سورج کی روشنی اور اس کی کرنیں حائل نہ ہوں تو چاند کی روشنی سورج کے مفارقت کے وقت دیکھی جا سکتی ہے کیونکہ یہ روشنی منع رؤیت میں دیگر موانع بصر کی طرح ہے جیسے بادل اور ہوا کی کثافت۔ اب جب کہ نگاہ سورج کی چمک کے باعث رؤیت ہلال سے قاصر ہے باوجود اس کے کہ چاند سورج سے الگ ہو چکا ہے تو ہمارا الیقین از روئے علم اس کی حقیقی رؤیت سے ممنوع نہیں ہے اس لیے اس رؤیت علمی کے باعث روزہ لازم ہو گیا کیونکہ یہ رؤیت افضل ہے۔

اگر کوئی کہنے والا یہ کہے کہ تمہارے بیان اور دلائل کے مطابق روزہ رؤیت نفسانیہ کی وجہ سے لازم ہو جاتا ہے تو رسولِ خدا کے اس قول کا کیا معنی ہوئے کہ اگر بادل چھا جائے تو تیس ۳۰ دن کے روزے شمار کرو؟ یہ تو محض عینی مشاہدہ ہی ہے تو ہم کہیں گے اگرچہ ہم نے اپنے پیش کردہ شواہد و بیان کی روشنی میں رؤیت نفسانیہ کو ثابت کیا ہے جو فرالنقش بہ عمل کے لیے زیادہ افضل و سزاوار ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم نے رؤیت عینی کا انکار کر دیا ہے۔ اس لیے کہ یہی دونوں رؤیتیں تو فرالنقش کی دلیل میں دو اصل بنیاد ہیں۔ ان میں سے ایک دوسرے سے زیادہ افضل ہے اور افضل ان خواص کے لیے مخصوص ہے جو دوسروں پر بہ لحاظ علم فوقیت رکھتے ہیں۔ وہ خواص اہل علم ہیں۔ دوسرا عوام کے لیے مخصوص ہے جن کی جہالت کے سبب ان پر اہل علم کی اتباع لازم ہے۔ کیونکہ وہ لوگ فہم و بصیرت سے خالی ہیں۔ نیز یہ صحیح نہیں ہے کہ اس سے آپ کی مراد عین مشاہدہ تھی اس لیے کہ بادل وغیرہ جیسے موانع کے نہ ہونے کے باوجود رؤیت کے

مطابق روزہ کے ایام ہمیشہ تیس دن ہی نہیں ہوتے بلکہ کبھی کبھی انتیس بھی
ہوتے ہیں۔ جب صورتِ حال یہ ہے تو پیغمبر اسلام صلعم کا اپنی امت کو اوام
الٰہی میں سے کسی بھی شک آور امر یں مشتبہ قاعدہ پر مامور کرنا صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ
اس کی وجہ سے فریضہ میں زیادتی یا کمی کا سوال پیدا ہوگا، اور آپ کی امت
فرض کی ادائیگی میں بھٹک جائے گی۔ یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ آپ اپنی امت کو بر
چھائے ہوئے رمضان کے مہینوں میں سے کسی مہینہ میں ایک زیادہ روزہ
ام کریں کہ بدلی نہ ہو تو سمجھا جائے کہ اس دن کا روزہ وافطار حرام تھا کیونکہ ر
خدا کی عبادت ہے اور ایسے دین کا جزو ہے جس کی زمام خدا کے ہاتھ میں ہے
بندوں کو اس میں اخلاص کا حکم دیا گیا ہے۔ خداوند تعالے کا ارشاد ہے
کو تو صرف یہی حکم دیا گیا ہے کہ خدا کی پُرخلوص عبادت کریں۔ معلوم ہوا کہ خو
شک وشبہ کے مغائر ہے۔ شک وشبہ نے ہی اس قاعدہ میں خلل پیدا کر دیا
اس لیے ہمارا یہ اعتقاد ہے کہ پیغمبر صلعم نے خدا کی عبادت میں کسی کو بھی مشکوک
امور کی طرف نہیں بلایا۔ جب یہ بات مسلّم ہے کہ رسول خدا صلعم نے شک
شبہ کی دعوت نہیں دی ہے تو بہت زیادہ ناقص اور کمتر کو چھوڑ کر اکمل و تمام
پر لازم رہنا اس جواز کے ساتھ کہ مہینوں کے ایام رؤیت نظری کے مطابق
ہوتے ہیں اور اس میں شک وشبہ واقع ہوتا ہے محض رؤیت نفسانیہ پر دلالت
کے لیے ہے۔ جس کے اعداد زیادہ اور کم نہیں ہوتے خداوند تعالے نے تعداد
کو مکمل کرنے کی طرف جو دعوت دی ہے اس کو وہ عمل میں لانے کی ترغیب دی
ہے۔ خداوند تعالے کا ارشاد ہے کہ تم کو تعداد مکمل کرنا چاہیئے۔

اب اس نظام کا حساب بھی سمجھ لینا چاہیئے۔

حضرت سیدنا امام جعفر صادق سے کبیسہ کے متعلق جو روایت ہے
کا تعلق زیادہ تر ابجد کے اعداد سے ہے۔

ا	ب	ج	د	ہ	و	ز	ح	ط	ی
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹	۱۰

ل	م	ن	س	ع	ف	ص	ق
۳۰	۴۰	۵۰	۶۰	۷۰	۸۰	۹۰	۱۰۰
ر	ش	ت	ث	خ	ذ	ض	ظ
۲۰۰	۳۰۰	۴۰۰	۵۰۰	۶۰۰	۷۰۰	۸۰۰	۹۰۰
غ							
۱۰۰۰							

مندرجہ ذیل سات حروف کو قرن کبیر کہتے ہیں

ز	ہ	ج	ا	و	د	ب
[illegible]	۵	۳	۱	۶	۴	۲

مندرجہ ذیل حروف قرن صغیر کہلاتے ہیں جن میں سے ہر ایک حرف ایک ایک برس سمجھا جاتا ہے۔ یہ کل تئیس ہیں:

ہَ بُ ۔ ذَدَاُ ۔ وَجَ زُ ۔ ھَ بُ ۔ زَ دَاُ ۔
دَجَ زُ ۔ ھَ بُ وُ وَ اُ وَ ۔

مندرجہ ذیل حروف بارہ ماہ کے مشہور ہیں۔ ایک ایک حرف سے ایک ماہ مراد لیتے ہیں

محرم	صفر	ربیع الاوّل	ربیع الثانی	جمادی الاوّل
۷	۲	۳	۵	۸
ز	ب	ج	۶	ف

جمادی الثانی	رجب	شعبان	رمضان
۱	۲	۴	۵
	ب	د	ھ

شوال	ذی قعدہ	ذوالحجہ
ز	ا	ج
۷	۲	۳

کبیسہ کا قاعدہ یہ ہے:

اب دیکھو کہ قرن صغیر کے کون کون حروف پر سکون ہے۔ جس پر سکون دیکھو اس حرف کا سال کبیسہ کا سال ہوگا۔ اس سال کا ذوالحجہ کا مہینہ کامل یعنی تیس دن کا ہوگا۔ اور اس طرح ہر تیس (۳۰) برس میں گیارہ برس کبیسہ کے سال ہوں گے۔

یعنی سنہ ہجری کے ہر تیس (۳۰) برس میں مندرجہ ذیل کبیسہ کے ہوں گے۔ دوسرا۔ پانچواں۔ آٹھواں۔ دسواں۔ تیرھواں۔ سولھواں۔ انیسواں۔ اکیسواں۔ چوبیسواں۔ ستائیسواں۔ انتیسواں۔ یہ کل گیارہ ہوئے۔

پس اگر کوئی شخص ۱۲۹۰ھ کے محرم کی پہلی معلوم کرنا چاہے تو قرن کبیر کا حرف جو "ز" ہے اس کے عدد سات ہیں اور قرن صغیر کا حرف "د" ہے جس کے عدد چھ ہیں۔ اور محرم کا حرف "ز" ہے جس کے عدد سات ہیں۔ ان کا مجموعہ (۲۰) ہوا۔ ان میں سے سات اور پھر سات نکال لیے جائیں تو صرف چھ رہ جاتے ہیں۔ ان کو اسی طور سے گنو تو بارہ سو نوے ۱۲۹۰ھ سال کے محرم کی پہلی تاریخ جمعہ آتا ہے۔ اس طرح جس ماہ کی پہلی تاریخ نکالنا ہو اس ماہ کے حروف لے کر جمع کریں اور پھر سات سات نکالیں اور جو باقی رہے اس کو اسی طور سے گنیں۔ جب تک گنتی پہنچے، وہی دن مہینہ کی پہلی تاریخ ہوگی۔

اصل بات یہ ہے کہ اسلامی قمری مہینوں کے حساب سے (۳۵۴ + ۵/۱۱ + ۱/۳) تین سو چوّن دن، پانچ دقیقہ، چھ ثانیہ ہوتا ہے۔ تو یہ کسر ہر سال بڑھتے بڑھتے دنوں اور مہینوں تک پہنچ جاتی ہے۔ ہندوؤں نے اس کی ترکیب یہ کی ہے کہ جب ایک ماہ ہو جاتا ہے تو جس سال کے جس ماہ میں یہ زیادتی ہو تو اس ماہ کو ڈبل کر دیتے ہیں۔ مثلاً

سمت ۱۹۱۲ کے ماہ پوس میں ہوا تو اس سال دو پوس ہو جائیں گے۔ اسی طرح کسی سال دو ماگھ، اور کبھی دو جیٹھ اور کبھی دو بیساکھ آئیں گے۔ گر

ماعیلیوں نے اس کی دوسری ترکیب نکالی ہے۔ یعنی اس کسر کے ماہ تک
نے کی نوبت ہی نہیں آتی کیونکہ جوں ہی چوتن دن ہوئے کہ اس ماہ کو کامل یعنی
پورے تیس دن کے کر دیے۔ اسی طریقہ سے جس سال کبیسہ ہو گا اس سال
کے دن (۳۵۵) ہو جائیں گے۔ اس طرح جمع ہوتے ہوتے تیس سال میں
گیارہ دن بڑھ جاتے ہیں تو اس تیس سال میں ۱۹ برس بغیر کبیسہ اور گیارہ
برس میں کبیسہ پڑے گا۔ چنانچہ مقریزی نے لکھا ہے کہ مومنین نے ذوالحجہ
کے ماہ کو کامل یعنی تیس دن کا کر دیا۔ حالانکہ اگر کبیسہ نہ ہو تو یہ ماہ ہمیشہ
ناقص ہوتا ہے۔[۳]

کسی سنہ کو ۳۰ سے تقسیم دیجیے باقی جو عدد بچتا ہے اگر وہ ـــــ ۵،
۱۰، ۱۳، ۱۶، ۱۹، ۲۱، ۲۴، ۲۷، ۲۹، میں سے کوئی عدد ہو تو یہ
سنہ کبیسہ ہو گا۔ ورنہ معمولی سال۔

مصادر

۱۔ نظام الصوم عند الفاطمیین، ص ۱۹
۲۔ صحیفۃ الصلوٰۃ، مطبوعہ بمبئی، ص
۳۔ عقد الجواہر فی احوال البواہر، ص ۳۱۴

کبیسہ کا قاعدہ یہ ہے:

اب دیکھو کہ قرن صغیر کے کون کون حروف پر سکون ہے۔ جس پر سکون دیکھو اس حرف کا سال کبیسہ کا سال ہوگا۔ اس سال کا ذوالحجہ کا مہینہ کامل یعنی تیس دن کا ہوگا۔ اور اس طرح ہر تیس (۳۰) برس میں گیارہ برس کبیسہ کے سال ہوں گے۔

یعنی سنہ ہجری کے ہر تیس (۳۰) برس میں مندرجہ ذیل کبیسہ کے ہوں گے۔ دوسرا۔ پانچواں۔ آٹھواں۔ دسواں۔ تیرھواں۔ سولھواں۔ انیسواں۔ اکیسواں۔ چوبیسواں۔ ستائیسواں۔ انتیسواں۔ یہ کل گیارہ ہوئے۔

پس اگر کوئی شخص ۱۲۹۰ھ کے محرم کی پہلی معلوم کرنا چاہے تو قرن کبیر کا حرف جو "ز" ہے اس کے عدد سات ہیں اور قرن صغیر کا حرف "و" ہے جس کے عدد چھ ہیں۔ اور محرم کا حرف "ز" ہے جس کے عدد سات ہیں۔ ان کا مجموعہ (۲۰) ہوا۔ ان میں سے سات اور پھر سات نکال لیے جائیں تو حرف چھ رہ جاتے ہیں۔ ان کو اسی طور سے گنو تو بارہ سو نوے ۱۲۹۰ھ سال کے محرم کی پہلی تاریخ جمعہ آتا ہے۔ اس طرح جس ماہ کی پہلی تاریخ نکالنا ہو اس ماہ کے حروف لے کر جمع کریں اور پھر سات سات نکالیں اور جو باقی رہے اس کو اس طور سے گنیں۔ جب تک گنتی پہنچے، وہی دن مہینہ کی پہلی تاریخ ہوگی۔

اصل بات یہ ہے کہ اسلامی قمری مہینوں کے حساب سے (۳۵۴) تین سو چون دن، پانچ دقیقہ، چھ ثانیہ ہوتا ہے۔ تو یہ کسر ہر سال بڑھتے بڑھتے دنوں اور مہینوں تک پہنچ جاتی ہے۔ ہندوؤں نے اس کی ترکیب یہ کی ہے کہ جب ایک ماہ ہو جاتا ہے تو جس سال کے جس ماہ میں یہ زیادتی ہو تو اس ماہ کو ڈبل کر دیتے ہیں۔ مثلاً سمت ۱۹۱۴ کے ماہ پوس میں ہوا تو اس سال دو پوس ہو جائیں گے۔ اسی طرح کسی سال دو ماگھ، اور کبھی دو جیت اور کبھی دو بیساکھ آئیں گے اور

ماعیلیوں نے اس کی دوسری ترکیب نکالی ہے۔ یعنی اس کسر کے ماہ تک
نے کی نوبت ہی نہیں آتی کیونکہ جوں ہی چوتن دن ہوئے کہ اس ماہ کو کامل یعنی
پورے تیس دن کے کر دیے۔ اسی طریقہ سے جس سال کبیسہ ہوگا اس سال
کے دن (۳۵۵) ہو جائیں گے۔ اس طرح جمع ہوتے ہوتے تیس سال میں
گیارہ دن بڑھ جاتے ہیں تو اس تیس سال میں ۱۹ برس بغیر کبیسہ اور گیارہ
برس میں کبیسہ پڑے گا۔ چنانچہ مقریزی نے لکھا ہے کہ مؤمنین نے ذوالحجہ
کے ماہ کو کامل یعنی تیس دن کا کر دیا۔ حالانکہ اگر کبیسہ نہ ہو تو یہ ماہ ہمیشہ
ناقص ہوتا ہے۔[3]

کسی سنہ کو ۳۰ سے تقسیم دیجیے باقی جو عدد بچتا ہے اگر وہ —— ۵،
۱۰، ۱۳، ۱۶، ۱۹، ۲۱، ۲۴، ۲۷، ۲۹، میں سے کوئی عدد ہو تو یہ
سنہ کبیسہ ہوگا۔ ورنہ معمولی سال۔

مصادر

۱۔ نظام الصوم عند الفاطمیین، ص ۱۹

۲۔ صحیفۃ الصلوٰۃ، مطبوعہ بمبئی، ص

۳۔ عقد الجواہر فی احوال البواہر، ص ۳۱۴۱

جغرافیہ

موسیولیبان تمدن عرب میں لکھتے ہیں:

"بطلیموس نے شہروں کے جو مقامات دریافت کیے تھے ان میں بڑی غلطی تھی۔ مثلاً بحر متوسط (بحر روم) ہی کے طول میں اس نے چار سو فرسخ کی غلطی کی تھی۔ عربوں نے جو کچھ ترقی جغرافیہ میں کی اس کے ثبوت کے لیے اس قدر کافی ہو گا کہ ان کے تحقیق کیے ہوئے مقامات و امکنہ کا مقابلہ یونانیوں کے ساتھ کیا جائے۔ اس مقابلہ سے ثابت ہو گا کہ عربوں کے تحقیق کیے ہوئے عرض البلدوں میں صرف کچھ دقیقوں کا فرق ہے۔ برخلاف اس کے یونانیوں نے درجوں کی غلطیاں کی ہیں۔ طول البلد کی تحقیق میں جو ایسے زمانہ میں جب کہ نہ درست گھڑیاں تھیں، نہ چاند کی حرکت کی صحیح جدولیں، نہایت مشکل تھی۔ انھوں نے البتہ زیادہ غلطی کی ہے۔ تاہم دو درجے سے زیادہ غلطی نہیں ہوئی ہے جو یونانیوں سے بمدارج کم ہے۔ مثلاً طنجہ کے طول البلد کو اسکندریہ سے حساب کر کے بطلیموس نے ۵۳ درجہ اور ۳۰ دقیقہ لکھا۔ حالانکہ واقعی طول البلد ۳۵ درجہ اور ۴۱ دقیقہ ہے۔ یعنی بطلیموس کی تحقیق میں تقریباً ۱۸ درجہ کی غلطی ہے

بوں کے نقشوں میں بحر متوسط (بحر روم) کے طول میں طنجہ سے طرابلس
ک کل ایک درجہ کی غلطی ہے۔ برخلاف اس کے بطلیموس کے نقشے میں
س کو ۱۹ درجے زیادہ لمبا قرار دیا ہے جس کی وجہ سے تقریباً چار سو
رسخ کی غلطی واقع ہوئی ہے۔

اس طرح بحر قلزم (بحر احمر) کی جو پیمائش ابن خلدون نے نقل کی ہے
۱۳۰۰ میل ہے۔ اور آج کل کے جدید نقشوں میں اس کی مسافت
۱۲۱۰ میل دکھائی گئی ہے۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ عربوں کی تحقیقات
جدید تحقیق سے کس قدر قریب تر ہے"۔(۱)

مصادر

۱۔ عربوں کی جہاز رانی (علامہ سید سلیمان ندوی)، ص ۹۸، ۱۰۱

تفسیر، حدیث، قرآن

دیگر بلاد اسلامیہ کی طرح اسلام کی تبلیغ کے وقت سے مصر میں قرآن وتفسیر کا اہتمام رہا۔ مگر عصر فاطمی میں ان پر مخصوص توجہ مبذول کی گئی جو ان علوم کی نمایاں ترقی کا باعث ہوئی۔ ہر محفل ومجلس کی ابتداء واختتام پر قرأت لازمی قرار دی گئی تھی۔ اور قاریوں کو انعام واکرام سے نوازا جاتا تھا۔ اس لیے دن بدن قاریوں کی تعداد بڑھنے لگی اور لوگ فن قرأت میں کمال حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ اکثر قاریوں کو حضرت امامی سے وظیفہ ملا کرتا تھا۔ فاطمئین گو قرآن کی باطنی تاویل کے قائل تھے مگر تاہم انھوں نے ظاہری تفسیر پر بھی غایت درجہ توجہ دی۔ اور مفسرین کی عزت وتکریم میں کوئی دقیقہ فردگذاشت نہ گیا۔ جامعات اور مساجد میں تفسیر وقرأت کی تعلیم وتدریس کے لیے تمام آسانیاں مہیا تھیں اور ان علوم کے شائق طلباء کی بڑی ہمت افزائی کی جاتی تھی۔

قرآن کریم کی تلاوت کرنا ائمہ کا وظیفہ تھا اور وہ اس شان سے پڑھا کرتے تھے کہ ان کی قرأت ہی اہل بیت کی قرأت کہی جانے لگی۔ ائمہ کرام کی طرح ان کے دعاۃ بھی حافظ قرآن تھے۔ سیدنا القاضی النعمان نے ہمیشہ اپنی تصنیفات کی ابتداء کلام مجید سے کی اور جا بجا آیات ربانی

استدلال کیا۔ یہی طریقہ تمام علماء کا رہا ہے۔ سیدنا مؤید شیرازی نے نہ صرف
"مجالس" میں قدم قدم پر قرآنی آیتوں کا حوالہ دیا ہے بلکہ اپنی خود نوشتہ
...ت میں بھی جگہ جگہ ان کی تضمین کی ہے۔ ابن منجب الصیرفی نے اپنی کتاب
"دیوان الرسائل" میں رئیس دیوان انشاء کے لیے جن شرطوں کا لازمی ہونا
بیان کیا ہے ان میں سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ وہ قرآن عزیز کا حافظ ہو۔
اس کے معانی و تفسیر کا ماہر ہو۔ باطن پر زور دینے کے باوجود بھی فاطمیوں
نے ظاہری علوم کی ترقی میں نمایاں حصہ لیا، اور تفسیری ادب میں قابل تعریف
...ذکر گئے۔ "اساس التاویل" اور "تاویل الدعائم" میں تاویل سے پہلے
...ں کی تفسیری توضیحات ہیں۔ "المجالس المستنصریہ" میں بھی تفسیری نکات کی کمی
...۔ "المجالس المؤیدیہ" آٹھ سو مجلسوں میں سے اکثر مجالس میں آیات قرآنیہ کی
مفصل تفسیر ہے۔ یہ تو ہم نے ان تصنیفات کا ذکر کیا ہے جن میں تفصیل
سے تفسیری تشریحات کی گئی ہیں۔ ورنہ یوں تو ہر تاویلی کتاب میں تاویل سے
...تفسیری اشارات ہوتے ہیں۔ ائمۂ کرام کے علم سے فیض یاب ہو کر
...نے یہ حکم فرمایا تھا کہ وہ قرآن عزیز کی ان تمام باتوں کو جمع کریں جن کا
...والوں نے انکار کر دیا ہے۔ سیدنا قاضی نے حکم امامی کی تعمیل کرتے ہوئے
...ت لکھ کر امام کے حضور میں پیش کیے۔ امام نے انھیں نہایت پسند کیا۔
...سیدنا قاضی کو ایک گراں بہا توقیع عطا فرمائی جس سے سیدنا القاضی النعمان
...ہمت افزائی ہوئی۔ اور انھوں نے اپنا کام مزید نشاط سے جاری
...یہاں تک کہ "سورۃ المائدہ" تک انھوں نے چھ سو صفحات لکھ ڈالے۔"
...ات و تفسیر کی طرح فاطمی اماموں نے حدیث پر بھی اپنی توجہ مبذول کی اور
...صحیح احادیث میں فرق کا خاص اہتمام برتا۔ ان کے دعاۃ جو کچھ لکھا کرتے
...سے جانچا کرتے تھے۔ سیدنا القاضی النعمان نے خلط کردہ احادیث میں
...کتاب "شرح الاخبار" میں ان ہی احادیث کو قلم بند کیا ہے جنھیں

امام عصر نے صحیح قرار دیا ہے۔ حضرت علیؓ کی شان بابرکت میں کئی احادیث ایسی تھیں جنھیں سیدنا القاضی النعمان اپنی کتاب میں شامل کر سکتے تھے لیکن تاہم انھوں نے ان احادیث کو قبول کرنے سے گریز کیا۔ کیونکہ انھیں امام وقت سے سند حاصل نہیں تھی۔ اپنی دوسری کتاب "المناقب والمثالب" میں بھی انھوں نے قبول احادیث کی طرح قبول روایات میں بھی ایسی ہی احتیاط برتی ہے۔ اسی طرح احادیث و روایات کی تحقیق و تفتیش ان کی مشہور و مستند تصنیف "دعائم الاسلام" کے ہر فصل کے شروع میں پائی جاتی ہے۔ اس میں صرف وہی احادیث و روایات ہیں جو قرآن کریم سے تطابق رکھتی ہیں اور جنھیں امامی سند حاصل ہے۔[۲]

مصادر

۱۔ المجالس والمسائرات بحوالہ 'عہد فاطمی میں علم و ادب' ص ۱۲۰

۲۔ المجالس والمسائرات بحوالہ 'عہد فاطمی میں علم و ادب' ص ۱۲۴

فقہ

فاطمی ائمۂ کرام کے دربار میں اسلامی فقہ نے ایسی قابل تعریف اور لائق تحسین ترقی کی کہ اس کی مثال ملنا محال ہے۔ فقہ کی تدوین اور احکام شریعت کی مستند کتب کی تصنیف و تالیف میں فاطمیوں کو شرف اولیت حاصل ہے۔

سیدنا القاضی النعمان عہد فاطمی کے عدیم المثال فقیہ ہیں۔ ان کا سب سے اہم فقہی کارنامہ "دعائم الاسلام" ہے جس سے نہ صرف اسماعیلی شیعہ بلکہ اثنا عشری بھی سند لیتے ہیں۔ اسلام بے شک ایک مکمل دستور حیات (Code of Life) ہے۔ لیکن کوئی ایسی کتاب نہ تھی جس سے اس دستور حیات کی ساری تفصیلات و جزئیات سامنے آسکتیں اور یہ واضح ہو سکتا کہ قرآن تشریح احکام کی کتاب سماوی ہے۔ اس زبردست کمی کو سب سے پہلی مرتبہ "دعائم الاسلام" نے پورا کیا۔ اس کتاب میں قرآن کو بحیثیت متن اور احادیث و سنت کو بحیثیت شرح پیش کیا گیا ہے۔ جس سے عبادات و معاملات کا مکمل نقشہ مرتب ہو جاتا ہے۔ احادیث و سنت کو قرآن کے لیے بیان و تفسیر یا تفسیر اجمال قرار دیا جائے اور دونوں کو ملا کر تشریع احکام کا منشا کہا جائے تو بلاشبہ قرآن کا دعوائے اتمام نعمت و اکمال دین درست ہے۔ فاطمی ائمہ خاندان نبوّت

کے علم سے فیض یاب تھے اور سنّت ان کے گھر میں تھی ۔ یہ کتاب بھی سیدنا القاضی النعمان کی اور تصنیفات کی طرح امام وقت کی تشریحات اور افادات سے مستغنی نہیں ۔ اس کتاب سے یہ پوری طرح ثابت ہوجاتا ہے کہ قرآن ایک مکمل دستور اساسی تھا اور سنّت اس کی تشریح تھی ۔ ان دونوں کی پابندی سے تشتت و افتراق پیدا ہونا ممکن نہیں ۔ امام کی زیر ہدایات القاضی النعمان نے قرآن مجید کو اصل قرار دے کر احادیث و روایات و سنّت کی مدد سے احکام فقہ کا استنباط اس طرح کیا ہے کہ وہ واضح ہونے کے علاوہ اس قدر جامع ہیں کہ عہد ستر کے بعض علماء دعوت نے اس عظیم الشان فقہی کارنامہ "دعائم الاسلام" کے بعض ابواب میں سے ہر ایک پر مستقل کتاب تصنیف کی ہے ۔ مثلاً "باب النکاح" کی توضیح و تشریح کرتے ہوئے شیخ ابراہیم سیفی نے ایک مبسوط کتاب "کتاب النجاح فی معرفۃ احکام النکاح" تصنیف کی ہے ۔ سیدنا القاضی النعمان کی تصنیف کی دو جلدیں ہیں جو ان ابواب پر مشتمل ہیں : ولایۃ ، طہارت ، صلوٰۃ ، زکوٰۃ ، صوم ، حج ، جہاد ، بیوع ، مواریث ، نکاح ، طلاق وغیرہ ۔

اس فقیہہ بے مثال کی دوسری تصنیف "الایضاح" تھی ۔ اس ضخیم کتاب کی تلخیص "مختصر الایضاح" ہے ۔

فقہ میں ان شاہکاروں کے علاوہ کتاب الینبوع مختصر الآثار ، کتاب الطہارۃ ، کتاب الاقتصار ، کتاب المقتصر ، کتاب الاتفاق والافتراق وغیرہ بھی ان ہی کی تصنیفات ہیں ۔

ماخذ

۱- "عہد فاطمی میں علم و ادب" ص ۱۳۱

لغت و نحو

○

عہد فاطمی میں دیگر علوم کی نشو و نما کے ساتھ علوم لغت و نحو بھی فروغ حاصل
کرتے رہے۔ قدیم ادب کی شرحیں لکھی گئیں اور اس پر تنقیدیں کی گئیں۔ فاطمی
...علمی کعبے کی حیثیت رکھتے تھے۔ دور دور کے اسلامی شہروں سے علماء و
...تحصیل علم کی خاطر مصر جاتے اور وہاں کے عالموں سے استفادہ کرتے
...دیگر ائمہ کی طرح امام معز خود باکمال نحوی تھے۔ کتاب "المجالس والمسائرات"
...بعض واقعات اور اس میں درج کردہ نحوی و لغوی بحثیں اس پر شاہد ہیں کہ
...زبردست نحو داں ہونے کے علاوہ ماہر لغات بھی تھے۔ عربی کے ساتھ
...انھیں سوڈانی، صقلی، بربری اور لاطینی زبانوں پر بھی عبور حاصل تھا۔

سیدنا ابوحاتم الرازی کی کتاب "الزینۃ" اپنی نوعیت کی پہلی اور بہترین
...کتاب ہے جو بلاشبہ گہری، کاوش و تدقیق اور ادبی ذوق کا ثمرہ ہے۔ جب
...الرازی نے اپنے اس علمی ادبی کارنامہ کو امام قائم کی خدمت میں پیش کیا تو
...انھوں نے اسے نہایت ہی پسند فرمایا۔[1] کتاب کے مقدمہ میں حمد و صلوات
...کے بعد عربی زبان کی ابتدا اور اس کی فضیلت بیان کرتے ہوئے بڑے عالمانہ
...دوسری زبانوں کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا ہے۔ اس کے بعد شعر کی عظمت

اور اس کے فوائد پر دلچسپ بحث ہے۔

ان کے علاوہ فاطمی عہد میں اور بھی علماء لغت و نحو ہوئے ہیں۔ محمد بن احم
البازودی، محمد بن احمد العمیدی۔ محمد بن احمد الجرجانی۔ محمد بن الحسین۔ بن عمیر الیمنی۔
جنھوں نے اخبار النحویین کی تالیف کی اور قاضی قضاعی کے استاد تھے۔ استاذ
القاضی القضاعی محمد بن حمید بن حیدرہ۔ محمد بن علی بن محمد بن ابوسہل الہروی اور
احمد بن مطرف وغیرہ

ماخذ

ا۔ "عہد فاطمی میں علم و ادب" ص ۱۴۴

فاطمیوں کا ذوقِ تعمیر

مساجد، مدارس، قصر و ایوان اور نئے شہروں کی تعمیر

کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد!

تعمیری کارنامے بھی فاطمیوں کے بہت وقیع ہیں۔ ان کے آثار ونقوش
اب تک موجود ہیں، اوران سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس شعبے میں بھی انھوں نے
اپنی انفرادیت اور خصوصیت قائم رکھی۔

فاطمی حکمرانوں اور فاطمی دور کی عمارتوں کے خصائص اور امتیازات پر عہدِ حا
کے ماہرین فنِ تعمیر وہندسہ نے متعدد کتابیں لکھ کر ان کے خصائص کو اجاگر کیا
ہے اور بانیوں کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔

فاطمیوں کے بسائے ہوئے شہروں، بنائی ہوئی عمارتوں اور تعمیر کیے ہوئے
ایوان وقصور کی فہرست بہت لمبی ہے۔ ہم صرف چند کا ذکر کریں گے۔۔۔۔
خود حدیث مفصّل بخواں ازیں مجمل!۔

جرجی زیدان نے اپنی کتاب میں فاطمیوں کے متعلق لکھا ہے اور جا لکھا
ہے وہ کتاب "تاریخ مصر الحدیث" میں لکھتا ہے کہ شاید کسی کو یہ خیال پیدا ہو
کہ تاریخی کتابوں میں بنو فاطمیہ کی دولت وثروت کے متعلق جو لکھا گیا ہے وہ
مبالغے سے خالی نہیں۔ مگر اس کو یاد رکھنا چاہیے کہ مصر ہمیشہ اپنی زرخیزی میں مشہور
رہا ہے۔ چنانچہ لوگوں کا یہ قول ہے:

"من دخل مصر ولم یستغن فلا اغناہ اللہ"[۲]۔

تفصیلات کے لیے ابن اثیر[۳] اور دوسری کتابوں سے رجوع کیا جائے۔

ملاحظہ ہوں تصاویر نمبر، ۲۱، ۲۲

ماخذ

۱۔ تاریخ مصر الحدیث (جرجی زیدان) ج ۱، ص ۲۸۱

۲۔ ترجمہ:

مصر آکر بھی جو دولت مند نہ بن سکا اسے مولا کنگال ہی رکھے گا۔

۳۔ ابن اثیر، ج ۱۱، ص ۱۶۵۰

شہرِ مہدیہ

○

تحفظ دولتِ فاطمیہ کے لیے مہدی نے ۳۰۳ھ میں ایک ایسے شہر کی بنیاد ڈالی جو دشمن کے حملے کے وقت بنو فاطمہ کی پناگاہ بن سکے۔ اور جس میں ان کو امن مل سکے"[1]۔ اس کی تعمیر میں بہت اہتمام کیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ مہدی کو اپنی کتابوں کے ذریعے معلوم تھا کہ اس کے انتقال کے بعد اس کے لڑکے قائم کے زمانے میں ابویزید الخارجی معروف بہ صاحب الحمار بغاوت کرے گا۔ اس کے حملے سے بچنے کے لیے یہ شہر تعمیر کیا گیا۔ اور اس کے مستحکم کرنے میں ہر ممکن کوشش عمل میں لائی گئی۔ جائے وقوع کے انتخاب کے لیے خود مہدی تونس اور قرطاجنہ کی طرف روانہ ہوا۔ اور سمندر کے ساحل کا معائنہ کیا۔ آخر میں خشکی کا ایک ایسا قطعہ انتخاب کیا جو ایک جانب سے دریا میں نکلا ہوا تھا۔ شہر کے اطراف ایک مضبوط فصیل بنائی گئی جس میں لوہے کے عظیم الشان دروازے نصب کیے گئے۔ ہر کواڑ کا وزن تقریباً سو قنطار تھا۔ شہر کے اندر سنگ مرمر کے محلات، وسیع تالاب، اور زمین دوز مخزن بنائے گئے، جن میں کافی غلّہ فراہم کیا گیا۔ پہاڑ کے دامن میں ایک دار الصناعہ قائم کیا گیا جس میں نوسو کشتیاں تیار کی گئیں۔ جب شہر کی فصیل اونچی ہوئی تو مہدی نے ایک تیر انداز کو حکم دیا کہ وہ مغرب کی طرف ایک

تیر مارے۔ یہ تیر عیدگاہ تک پہنچا۔ مہدی نے کہا "اس مقام تک صاحب الحمار یعنی ابویزید الخارجی حملہ کرتا ہوا پہنچے گا۔" ۳۰۸ھ میں یہ شہر تکمیل کو پہنچا۔ لوگ اس کی مضبوطی اور پختگی کو دیکھ کر تعجب کرنے لگے تو مہدی نے کہا "یہ سب اہتمام صرف ایک ساعت کے لیے ہے۔ اب مجھ کو بنو فاطمہ کی حفاظت کامل کا اطمینان ہو گیا۔"[۱،۲] مہدی کی یہ پیشین گوئی ابویزید خارجی کی بغاوت کے متعلق تھی۔ مہدیہ قیروان کی ایک بندرگاہ تھا۔[۳] اور شہر قیروان سے دو مرحلوں پر واقع تھا۔ مگر یاقوت کے زمانے میں یہ شہر برباد ہو چکا تھا۔[۴،۵]

ماخذ

۱۔ ابن اثیر، ج ۸، ص ۳۵

۲۔ ابن خلدون، ج ۴، ص ۳۸

۳۔ یہ شہر قیروان سے دو مرحلوں پر واقع تھا۔ یاقوت کے وقت میں برباد ہو چکا تھا۔

۴۔ ادریسی، ص ۱۰۸

معجم البلدان، ج ۴، ص ۶۹۳

۵۔ از تاریخ فاطمیین مصر، ص ۹۷

شہر محمدیہ

خوارج کی تسخیر کے بعد قیروان واپس ہوتے وقت قائم میلہ کے ایک پہاڑ پر سے گذرا[۱] جہاں بنو کلمان رہتے تھے۔ جن کا تعلق قبیلہ ہوارہ سے تھا۔ قائم کو ان کی بغاوت کا خوف ہوا۔ لہذا اس نے ان کو قیروان کے ایک گاؤں میں منتقل کیا۔ اور ان کے اصلی مقام پر ایک شہر کی بنیاد ڈالی جس کا نام محمدیہ رکھا۔[۲] اس شہر کو آباد کرنے کا انتظام علی بن ممدون الاندلسی کے سپرد کیا گیا، جو دولت فاطمیہ کے خاص پروردہ اشخاص میں سے تھا۔ قائم نے اس کو والی مقرر کیا۔ اس نے شہر مذکور آباد کیا اور اس میں اتنا غلّہ فراہم کیا جو صاحب الحمار کے محاصرے کے زمانے میں بہت کام آیا۔ یہ شہر قیروان کی حدود میں شامل تھا۔ مگر … کے زمانے میں تباہ ہو چکا تھا۔[۳]، [۴]

حوالے

۱۔ عیون الاخبار، ج ۵، ص ۲۰۰

۲۔ تاریخ فاطمیّین مصر، ص ۹۶

۳۔ معجم البلدان، ج ۴، ص ۴۲

صقلیہ کے محلّات

○

کہا گیا ہے کہ عربوں کی عمارتوں میں استحکام نہیں ہے۔ بعض کی نسبت یہ البتہ درست ہے لیکن سب عمارتوں پر صادق نہیں آتا۔ جب عرب کسی ات کو جلد بنانا چاہتے تھے اور انھیں محض ظاہری ضرورت ملحوظ ہوتی تھی تو کے مکانات بھی ویسے ہی کمزور ہوتے تھے جیسی ہماری آج کل کی عمارتیں لیکن ان کا ایسی عمارتوں کو چھوڑ جانا جن پر اس وقت ہزار سال سے زیادہ رگے ہیں ثابت کرتا ہے کہ جب انھیں استحکام منظور ہوتا تو وہ بہت پائیدار تیں بنانے کی قابلیت رکھتے تھے۔ صقلیہ کے بہت سے سارے قصر ذیرا ٹھ صدیاں گذر گئی ہیں ہر قسم کی بدسلوکیاں جھیل چکے ہیں"۔[1]

جزیرہ صقلیہ کی یادگاریں۔ جزیرۂ صقلیہ کی مشہور عربی عمارتیں خیزہ اور کے دو مشہور قصر ہیں جو بلرم کے قریب واقع ہیں اور جن کی بنا دسویں عیسوی میں ہوئی۔ اتنے پرانے زمانہ کے عربی قصر کہیں نہیں پائے اور اس وجہ سے یہ نہایت ہی دلچسپ یادگاریں ہیں۔ صقلیہ کے کے تعلقات افریقیہ سے اس قدر زیادہ تھے کہ غالباً ان میں اور کے قصروں میں بہت مشابہت تھی۔ اور ان کے دیکھنے سے ان کی

طرز کا بھی اندازہ ہوسکتا ہے۔

حنیزہ اور توبع کے قصر نہ فقط قصر تھے بلکہ قلعے بھی تھے۔ یہ گھڑے ہوئے پتھروں سے بنے ہوئے اور سامانِ جنگ سے آراستہ تھے اور بلا تامل صدیوں کا سامنا کر سکتے تھے۔

قصر حنیزہ جو بلرم سے قریب ہے شکل میں پتھر اور چونے کا عظیم الشان مکعب نظر آتا ہے۔ اس کی دیواریں دور سے ایک زنجیرہ محرابوں کا معلوم ہوتی ہیں۔ جو کسی قدر نکیلی ہیں۔ اور ان کے اندر دہرے دہرے دریچے بھی بنے ہیں جن کی دونوں جانب کسی زمانہ میں ستون بھی تھے۔ منڈیر کے حاشیہ پر کسی وقت قرمطی کتبے تھے جن کا کچھ بقیہ رہ گیا ہے۔ میں نے موسیو غریبو دے یران ژی کی تصویر سے اس قصر کے ایک دالان کے نقشہ کو جیسا وہ چالیس برس پہلے تھا نقل کیا ہے۔ اس کی آرایش نہایت ہی سادہ اور خوبصورت ہے۔ اس میں اندلس کی طرح سے قلعی آرائشیں بھی ہیں۔ لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ ان عربی کاریگروں نے جنھوں نے نارمنوں کے وقت میں اس قصر کی مرمت کی ہے اس کی پرانی طرز کو کہاں تک بدلا ہے۔

حنیزہ کے قصر سے تھوڑے فاصلے پر توبع کا قصر واقع ہوا ہے۔ حنیزہ اور توبع کے قصروں کی ظاہری صورت اور ان کی نکیلی محرابوں کی قطاریں اور ان کی باقاعدہ تعمیر اندلس کے عربی قصروں سے بالکل علیحدہ ہے۔ موسیو دے یران ژی ان کو مصر کی عمارتوں کے مشابہ بتاتے ہیں لیکن میری رائے میں یہ مشابہت مطلق نہیں پائی جاتی۔ بہت تلاش کے بعد میں اس قدر کہہ سکتا ہوں کہ مسجد قلاؤن کے بعض حصوں کو کچھ خفیف سی مشابہت ان قصروں سے ہو تو ہو۔[۲]

حوالے ۱۔ تمدن عرب (موسیو لیبان) ص ۴۸۱

۲۔ تمدن عرب (موسیو لیبان) ص ۴۹۲

شہر مازر

مازر (Mazzro) صقلیہ کا سب سے پہلا اسلامی شہر ہے۔ ادریسی کہتا ہے یہ اپنی خوب صورتی میں تمام شہروں پر فائق تھا۔ امراء کے عالی شان محل اسلامی طرز تعمیر کا نمونہ تھے۔ شہر کی آبادی خوب صورتی سے بسائی گئی تھی۔ جا بہ جا باغ لگے ہوئے تھے۔ پھولوں کی تختہ بندیاں تھیں۔ سڑکیں صاف اور کشادہ تھیں۔ آبادی میں مہمان سرائے، حمام اور ہوٹل قائم تھے۔ یہاں کی تجارت کو بھی فروغ حاصل تھا۔ یہ تجارتی حیثیت سے افریقہ اور صقلیہ کا نقطۂ اتصال تھا۔ کشتیاں ایک دریا سے گزر کر اس کی شہر پناہ کی بنیادوں سے ٹکراتی تھیں۔ اہل علم کی ایک بڑی جماعت اس خاک سے اٹھی، اور اسی میں پیوند ہوئی۔ یہاں کے اہل علم میں امام مازری کو لازوال شہرت حاصل ہے جن کا شمار علم حدیث کے اساطین میں ہے۔[۲]

حوالے

۱۔ نزہتہ المشتاق، ص ۳۱، بحوالۂ تاریخ صقلیہ

۲۔ تاریخ صقلیہ، ص ۳۴

بلرم

ابن حوقل ۳۶۲ھ میں یہاں پہنچا تو قدیم وجدید آبادیوں کو ملا کر ایسے پانچ مقامات تھے جن میں سے ہر ایک مقام ایک جداگانہ شہر کی حیثیت رکھتا تھا اس لیے بعض جغرافیہ نویسوں نے ان میں سے ہر ایک کو ایک مستقل شہر قرار دے کر ان کا جدا جدا تذکرہ کیا ہے۔ یہاں تک کہ یعقوب حموی نے بھی اس کے بعض حصوں کو مستقلاً شہر شمار کر کے اپنی کتاب میں مختلف حروف تہجی کے ذیل میں درج کیا ہے حالانکہ یہ سب صرف ایک شہر بلرم کے مختلف محلے مختلف ناموں سے موسوم تھے۔

بلرم اپنے خصوصیات میں نہ صرف صقلیہ کا شیراز تھا بلکہ اس عہد میں دنیا کے تمام ممتاز شہروں میں تھا۔ شہر کی محلہ وار تقسیم، ہر ہر حصہ کا جداگانہ انتظام سرکاری عمارتیں، ہر صیغہ کے جداگانہ دفاتر، امراء کے عالی شان محل، محلوں کے خانہ باغ، مکانوں کے اردگرد چمن بندیاں، نزہت بخش فوارے، مرمر اور سنگ رخام کی کشادہ سڑکیں، پُر رونق بازار، بازاروں کی یکساں دلکش دکانیں، عالی شان مہمان سرائیں، پُر تکلف ہوٹل، آرام دہ حمام، اور دلفریب تفریح گاہیں، اور حماموں کا اہتمام وغیرہ اس شہر کی نمایاں خصوصیات تھیں

...اپنے دور میں ایسے ہی جاذبِ نظر تھیں، جس طرح مسٹر اسکاٹ کے بقول آج
...دارالبلاد (پیرس) میں تہذیبِ جدید کا آب و رنگ ایک نووارد کی نگاہ میں خیرگی
...پیدا کر دیتا ہے۔ مسٹر اسکاٹ اس کے عام شہری خصوصیات کے متعلق لکھتے ہیں:

"وہاں کے باشندے نہایت مہذب اور ذہین تھے۔ صرف مسجد ہی وہ
...نہ تھیں جہاں باشندگانِ پلرمو کے اسراف و تکلفات کے نمونے اور
...شان و شوکت کے نظارے دکھائی دیتے تھے، بلکہ دولت مندوں اور معززین
...کے مکانات بھی ایسے ہی ہوتے تھے کہ جن کی نظیر سوائے قرطبہ کے اور کسی
...اسلامی شہر میں نہیں ملتی۔ جو صنعت و نزاکت ان عمارتوں میں تھی وہ واقعی اس
...سامان اور قیمتی پتھروں کے قابل تھی جن سے وہ بنائی گئی تھی۔ ان کی دیواریں
...رنگ کے پتھروں کی ہوتیں، تمام فرش میں قیمتی پتھروں کی پچی کاری ہوتی۔
...چھتوں میں ماربیچ وضع کے ساتھ ہندسی اصول کے مطابق نقش و نگار بنے
...ہوتے۔ جگہ جگہ انھیں مختلف رنگوں سے مزین کیا جاتا یا سونے کا کام ہوتا۔ پھول
...اور خوشبودار پھولوں کے درخت لگے ہوتے جن سے تمام مکان طبلۂ عطار بنا
...رہتا۔ نہریں تھیں کہ ہر ایک بڑی عمارت کے خانۂ باغ میں بہہ رہی تھی۔ زمانہ قدیم
...کے انداز کے فوارے ہر سیرگاہ اور سرسبز مقامات میں اچھل رہے تھے۔ شہر میں
...مشرق سے مغرب تک منڈیاں بنی ہوئی تھیں۔ تمام بازار کشادہ تھے، اور پتھروں
...کا صاف شفاف فرش تھا۔ بازاروں میں بیش قیمت اور بیش بہا مال بھرا رہتا۔
...مکانات ریختہ پتھروں کے ہوتے جن کے جوڑ نہایت احتیاط اور
...خوبصورتی سے ملائے جاتے۔ تمام کوچہ و بازار میں روشنی ہوتی۔ محلات عالی شان
...اور خوبصورت تو تھے ہی، غربا کے مکان بھی اچھی گنجائش اور آرام کے ہوتے۔"

...شہر میں جابجا عالی شان ہوٹل قائم تھے جن میں طعام و قیام کا بہترین انتظام
...تھا۔ دوسرے ملکوں کے مسافر اور سیاح انہی ہوٹلوں میں ٹھہرا کرتے تھے۔ جن
...لوگوں کو زیادہ دنوں تک قیام کی حاجت ہوتی یہ ہوٹل ان کے لیے ضروری

ساماں بہم پہنچاتے۔ مشہور اندلسی سیاح ابن جبیر ایک صاحب منزلت سیاح کی حیثیت سے داخل ہوا اور اپنے اعزاز و مرتبہ کے لحاظ سے متعدد مرتبہ شاہ صقلیہ کا مہمان بنا مگر اس کا مستقل قیام ہوٹل ہی میں تھا۔ جس کے نظم و نسق کی اس نے تعریف کی ہے اسی طرح ہر محلہ میں کثرت سے حمام قائم تھے۔

بلرم کی دوسری خصوصیات کے ساتھ یہاں مساجد کی کثرت بھی ہے۔ تین سو سے زیادہ مسجدیں تھیں جن کی عمارتیں نہایت شاندار تھیں۔ یہاں کی جامع مسجد بلرم قدیم میں واقع تھی جو کلیسا سے منتقل کر کے مسجد بنائی گئی تھی اور یہ کلیسا بننے سے پیشتر عہد قدیم میں یونانیوں کا مقدس مندر تھا۔ وہ مشہور ہیکل اسی میں تھا جس میں یونانیوں نے ارسطو کا مجسمہ رکھا تھا۔ ہیکل کی چھت میں ایک لکڑی لٹکی ہوئی تھی مجسمہ اسی پر رکھا تھا۔ عیسائیوں نے مجسمہ کو بدستور باقی رکھا تھا۔ اور خوش عقیدہ یونانیوں سے متاثر ہو کر وہ بھی اس کی عزت و تکریم کرتے اور حاجت روائی چاہتے تھے۔ اس لیے وہ اب تک باقی تھا۔ چونکہ یہ شہر کا سب سے بڑا معبد تھا اور عیسائیوں کو بھی اس پر قبضہ رکھنے کا کوئی حق نہ تھا اس لیے عربوں نے جامع مسجد بنا لیا۔ ارسطو کا مجسمہ ہٹا دیا گیا۔ مگر وہ لکڑی جس پر مجسمہ آویزاں تھا مدتوں لٹکتی رہی۔ ابن حوقل نے اسے دیکھا تھا۔[۲]

حوالے

۱۔ اخبار الاندلس، ص ۶۷، ۶۹

۲۔ یہ ساری تفصیل "تاریخ صقلیہ" سے ماخوذ ہے۔ ملاحظہ ہوں صفحات ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶

خالصہ

○

دولت فاطمیہ کے دوسرے دور کے آغاز میں خلیل دالی صقلیہ نے بلرم
ے پہلو میں خالصہ کی بنیاد ڈالی۔ اس کی تعمیر کی اصل غرض حکومت کے دفاتر کو
ک جاکر نا تھا۔ اس جدید دار الحکومت میں حکومت کے دفاتر کے لیے جداگانہ عمارتیں
یر ہوئیں۔ ابن حوقل لکھتا ہے :

"خالصہ میں حاکم صقلیہ اور اس کے ماتحت عمال رہتے ہیں۔ اسی میں بازار
ر ہوٹل وغیرہ جو آبادی کے لوازم ہیں، نہیں ہیں۔ البتہ حمام بنائے گئے ہیں۔
س میں ایک جامع مسجد بھی ہے جو یہیں کے باشندوں کے لیے مخصوص ہے۔ نیز
یدخانہ، جہاز سازی کے کارخانے اور دیوانِ حکومت کی عمارتیں بنی ہوئی ہیں۔"
چنانچہ خالصہ کی تعمیر کے بعد سے حکومت کے دفاتر باضابطہ طور پر خالصہ میں
ل گئے۔

بالکل اسی طرح جیسے قیروان کے قریب منصوریہ۔ فسطاط کے قریب
رہ اور قرطبہ کے پاس مدینۃ الزہرا آباد ہوا تھا، بلرم کے متصل خالصہ
وکیا۔ اور اس کی تعمیر کے بعد حکومت کے تمام دفاتر یہاں منتقل

کر دیے گئے۔"(۱)

حوالہ

۱۔ "تاریخ صقلیہ"، ص ۱۵۰، ۱۶

قاہرہ

یوں تو جوہر کے ہاتھوں میں جب مصر کی زمامِ حکومت آئی، اس سلسلہ میں اس کے بکثرت اہم واقعات تاریخوں میں مذکور ہیں، لیکن اس کے ایسے کارنامے جو صفحۂ عالم پر لازوال ہیں ان میں سے مصر کے مشہور شہر قاہرہ کی بنا ہے۔ اس کی بنا اس نے ماہ جمادی الاخریٰ ۳۵۹ھ میں ڈالی۔ اس کی بنا کے وقت اس کی وہی حیثیت تھی جو صقلیہ میں بلرم کے پہلو میں خالصہ کی۔ قاہرہ کی بنا و تاسیس کی تفصیلی سرگزشت مقریزی نے خطط مصر میں لکھی ہے۔

"جوہر نے قاہرہ کی تعمیر کے بعد المعز کو قاہرہ کے دارالخلافت قرار دینے کی ترغیب دی لیکن اس نے اس وقت یہ دعوت قبول نہ کی۔ جوہر المعز کے نائب کی حیثیت سے حکومت کرتا رہا۔ اور خطبار، عمال و قضاۃ وغیرہ مقرر کردیے۔ ہفتہ میں ایک دن وہ خود بھی دادرسی کے لیے بیٹھتا تھا۔ پھر فتوحات کا سلسلہ بڑھایا اور ۳۶۱ھ تک اس نے مصر کے علاوہ شام و حجاز پر بھی قبضہ کرلیا۔ اس کے بعد جوہر کو اپنی دعوت پیش کرنے کا مزید موقع ملا۔ اور بالآخر اس کے اصرار سے المعز ترکِ وطن کرکے قاہرہ میں آکر آباد ہوگیا۔ اس طریقہ سے جوہر کی تحریک سے اس کا نو تعمیر شدہ شہر صدیوں کے لیے دارالخلافت بن گیا اور جو آج

بھی مصر کا پایۂ تخت ہے۔ جوہر نے المعز کے آنے کے بعد مصر و شام و حجاز کی عنانِ حکومت اس کے سپرد کر دی۔ اس نے ۱۶ سال ۲۰ یوم حکومت کی"[1]۔

حوالہ

۱۔ تاریخ صقلیہ، ص ۱۱۳

چند مساجد کا اجمالی تذکرہ

○

ایک اسماعیلی اہلِ علم اور مؤرخ کا بیان ہے :

جامع مقس بھی حاکمی عہد میں تعمیر ہوئی۔ امام حاکم نے قاہرہ اور دیگر شہروں میں کئی اور مسجدیں بنوائیں اور کئی مسجدوں کی مرمت کروائی۔ مُسبّحی کہتا ہے کہ ۴۰۴ھ میں امام حاکم نے آٹھ سو تیس مسجدوں کے لیے نو ہزار دو سو بیس درہموں کی ماہانہ امداد کی منظوری عطا فرمائی۔ علاوہ ازیں ہر مسجد کے لیے اور بارہ دینار ماہانہ مقرر کیے۔ ایک سال بعد ۴۰۵ھ میں امام کے حکم سے قاریوں، مؤذنوں، فقیہوں اور پانی کے حوضوں، دواخانوں اور اموات کے کفنوں کے لیے بڑی املاک وقف کی گئیں "۔

امام حاکم کے عہد کی تین اور مسجدیں تھیں لیکن اب ان کا کوئی نشان نہیں۔ یہ مساجد متعلّقہ کہلاتی تھیں۔ مسجد قرافہ عہدِ عزیزی کی ہے۔ جامع اقمر امام آمر نے اور جامع الرصد افضل بن بدر الجمالی نے تعمیر کرائی تھی۔

فاطمیوں کو مساجد کی تعمیرات سے خاص دلچسپی تھی۔

یہ واقعہ ہے اور اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ فاطمی علم و حکمت کے بڑے حامی تھے۔ انھوں نے مدرسے۔ کالج۔ کتب خانے اور سائنس کے ادارے

قائم کیے جن میں قابل اساتذہ۔ ارباب علم و فضل۔ بے شمار کتابیں اور ہر قسم کے آلات مہیا کیے۔ یہ ادبی اور علمی وفنی خزانے تمام لوگوں کے لیے بغیر کسی فیس کے وقف تھے اور ان سے جو چاہتا، جب چاہتا فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ امام دارالعلم وغیرہ میں ہمیشہ بحث وتحقیق کی مجلسیں منعقد کیا کرتے تھے جن میں مدرسوں اور علمی مرکزوں کے اساتذہ حصہ لیتے تھے۔ یہ مجلسیں اپنے مختلف شعبوں کے لحاظ سے منطقیوں، ریاضی دانوں اور طبیبوں وغیرہ پر مشتمل ہوا کرتی تھیں۔ جن میں ہر طبقہ کے علما اپنی مخصوص خلعت (گون) پہنے شریک ہوتے تھے۔ جو رقم محاصل کے باقاعدہ ذریعوں سے وصول ہوتی تھی ان مدرسوں اور علمی مرکزوں پر صرف کی جاتی تھی۔ علم ہیئت و نجوم کو ترقی دینے کے لیے اکثر مقامات پر رصدگاہیں بنائی گئی تھیں اور علم و ادب کے اساتذہ اور ماہران حکمت ایشیا، اور اندلس کے شہروں سے مدعو کیے جاتے تھے۔"(۴)

ماخذ

۱۔ الخطط التوفیقیہ بحوالہ "عہد فاطمی میں علم و ادب" ص ۴۴

۲۔ تاریخ عرب (موسیو سدیو) ص ۲۶۹

۳۔ عہد فاطمی میں علم و ادب، ص ۴۵

۴۔ History of Saracenes (Amir Ali)

جامع حاکم اور دیگر عمارات

جامع ازہر کے علاوہ عہد فاطمی میں جامع حاکم۔ جامع راشدہ۔ جامع مقس۔ جامع قرافہ۔ جامع الرصد۔ جامع الفیلہ اور جامع اقمر وغیرہ تعمیر ہوئی ہیں۔ جن سے اکثر مساجد میں تعلیم و تدریس ہوا کرتی تھی۔

جامع حاکم کی بنیاد ۳۸۰ھ میں امام عزیز نے رکھی تھی۔ ان کی وفات کے بعد ۴۰۳ھ میں امام حاکم نے اس کی تکمیل کرائی۔ اس کے لیے چٹائیاں، قندیلیں، فرش اور پردے مہیا کیے۔ اور چار بڑے بڑے چاندی کے جھاڑ آویزاں کیے۔ ۴۰۴ میں دوسری مسجدوں کے ساتھ اس کے لیے بھی املاک وقف کی گئیں۔[۲]

۱۷ ربیع الآخر ۳۹۳ھ کو خطہ راشدہ میں جامع راشدہ کی بنا رکھی گئی۔ اور رمضان ۳۹۵ھ میں اس کی تکمیل ہوئی۔ ۴۰۰ھ میں چاندی کے تنوّر اور وزنی قندیلیں لٹکائی گئیں۔[۳] اس کی محراب کا رخ مشہور ہیئت دان علی بن یونس نے متعین کیا تھا۔

شاہجہاں کی طرح عزیز کو بھی عمارتوں کا بہت شوق تھا۔ ۳۸۰ھ کے ماہِ رمضان میں اس نے باب الفتوح کے قریب ایک بڑی جامع مسجد کی بنا ڈالی جس کی تکمیل حاکم کے زمانے میں ہوئی۔ اس کا نام جامع ازہر کے مقابلے میں جامع انور رکھا گیا۔ لیکن

جامع الحاکم کے نام سے مشہور ہو گئی۔ ایک دوسری مسجد قرافہ (شاہی قبرستان) میں بنائی۔ دربار کے لیے ایک محل بنایا جسے "قصر الذہب" کہتے تھے۔ ایک دوسرا محل جس کا نام "قصر البحر" تھا، بحر نیل کے قریب تیار کیا۔ یہ ایسا عظیم الشان اور نادر محل تھا جس کی نظیر نہ مشرق میں پائی جاتی تھی نہ مغرب میں۔ علاوہ ان دو محلوں کے موضع عین الشمس میں کئی شاہی محلات تیار کیے۔[۳]

ایک سابق اسماعیلی اہل علم اور اہل قلم فرماتے ہیں:

"قائم کو تعمیر و آرائش مساجد سے بڑی دلچسپی تھی۔[۱] ان میں سب سے بڑی اور شاندار وہ مسجد ہے جو اسی کے نام سے اب تک جامع الحاکم کہلاتی ہے۔

حاکم کے عہد کی تین مسجدیں "مساجد معلقہ" کہی جاتی ہیں۔ ان کا اب کوئی نشان باقی نہیں ہے۔"[۴]

اس مسجد کی بنیاد حاکم کے باپ عزیز نے رکھی تھی۔ مگر عزیز کے انتقال کے بعد حاکم نے چالیس ہزار دینار کے مصارف سے ۳۹۳ھ میں اس کی تکمیل کی اور مزید پانچ ہزار دینار کے خرچ سے اس کی چٹائیاں۔ قندیلیں اور پردے مہیا کیے۔ چار بڑے بڑے چاندی کے جھاڑ اس میں لٹکائے گئے۔ اس کی حفاظت اور مرمت کے لیے بڑی املاک اس پر وقف کی گئیں۔ یہ مسجد قاہرہ کے قریب ہے۔[۵]

اسی سال یعنی ۳۹۳ھ میں ایک اور مسجد خطۂ راشدہ میں بنائی گئی۔ جہاں اکثر حاکم جمعہ کی نماز پڑھا کرتا تھا۔ اس کی محراب کا رخ بہت ہی احتیاط سے علی بن یونس نے معین کیا جو حاکم کے زمانے میں بڑا ہیئت داں تھا۔ اس کا نام مسجد راشدہ رکھا گیا۔[۶] اس کو بھی حاکم نے فرشوں۔ پردوں۔ اور چراغوں سے آراستہ کیا گیا۔ تیسری مسجد جو حاکم نے بنوائی وہ جامع مقس ہے۔

ان مسجدوں کے علاوہ حاکم نے قاہرہ اور دیگر شہروں میں اور کئی مسجدیں بنوائیں اور کئی مسجدوں کی مرمت کروائی۔ ان میں کثرت سے کلام اللہ کے

نسخے فراہم کیے۔ ان کو چاندی کے چراغوں۔ ریشمی پردوں اور سامانی چٹائیوں سے آراستہ کیا۔ مسبحی کہتا ہے کہ ۴۰۴ھ میں حاکم نے ان تمام مسجدوں کی گنتی کا حکم دیا جن کو کوئی غلّہ (یعنی امداد) نہیں ملتا تھا۔ یا جن کو غلّہ تو ملتا تھا مگر کافی نہ تھا۔ معلوم ہوا کہ ایسی مسجدوں کی تعداد آٹھ سو تیس ہے اور ان کو ماہانہ نو ہزار دو سو بیس درہم کی ضرورت ہے۔ حاکم نے اس رقم کی منظوری دی۔ اس کے علاوہ ہر مسجد کے لیے ماہانہ بارہ درہم مقرر کیے گئے۔ اس کے بعد ۴۰۵ھ میں بڑی املاک قاریوں، فقیہوں، مؤذنوں۔ پانی کے حوضوں۔ دواخانوں اور اموات کے کفن دفن کے لیے وقف کی گئی۔(۶)

حاکم ہی کے زمانے ۴۰۴ھ میں خلیج اسکندریہ تیار کی گئی جس پر حاکم نے پندرہ ہزار دینار صرف کیے۔(۷)

ماخذ

۱۔ الفاطمیون فی مصر، ص ۱۲۹

۲۔ مقریزی: الخطط، ج ۴، ص ۵۵

۳۔ تاریخ فاطمیین مصر، ص ۱۹۱

۴۔ الخطط التوفیقیہ، ج ۲، ص ۴۲

۵۔ الخطط (مقریزی)، ج ۴، ص ۵۶

۶۔ مقریزی، ج ۴، ص ۲۶۴

۷۔ مقریزی، ج ۱، ص ۲۷۶

مسجد امیر الجیوش

بدر الجمالی کو سپہ سالار یا امیر الجیوش (بہ عہد المستنصر) مقرر کیا گیا۔ اس نے بربروں کو ڈیلٹا میں اور سوڈانیوں کو مصر اعلےٰ میں زیر کیا۔ اس کے تحت مصر میں پھر خوش حالی کا دور دورہ ہوا۔ اور العزیز کے عہد کے بعد سے قاہرہ پہلی مرتبہ تعمیر کاروں اور صناعوں کی آماجگاہ بن گیا۔ یہ صحیح ہے کہ فاطمی دورِ خلافت کی ابتداء میں جتنے بے شمار وسائل حاصل تھے، اب اتنے وسائل موجود نہ تھے۔ اور قابل حصول وسائل میں سے ایک بڑے حصہ کو سلجوق خطرے کی بناپر فوجی کاموں کے لیے مختص کرنا پڑا تھا۔ اب جو مسجدیں بنیں وہ چھوٹی تھیں۔ لیکن ان میں بہت سی دلچسپ چیزیں نمودار ہونے لگیں۔ ان میں سے چند نے جامع الجیوش میں جگہ پائی۔ یہ مسجد قاہرہ سے آگے جبل مقطم پر واقع ہے۔ دروازے پر کے ایک کتبہ کی رُو سے اس مسجد کا سال تعمیر ۱۰۸۵ء ہے۔ یہ امیر الجیوش (سپہ سالار) بدر الجمالی کے نام سے منسوب ہے۔ اس کا نقشہ مستطیل ہے اور اس کی مساحت ۵۰ × ۸۴ فیٹ ہے۔ باب الداخلہ مغربی سرے پر بنایا گیا ہے یہاں وہ اصل عمارت سے لگا ہوا، ایک مستطیل عمارت کے بیچوں بیچ واقع ہے۔ شمال میں ایک اور عمارت اصل عمارت سے لگی ہوئی ہے۔

اس عمارت کے اندر ایک قبر ہے۔ باب الداخلہ کی بائیں جانب ایک مربع کمرہ ہے اس پر متقاطع لداؤ چھت ڈالی گئی ہے۔ اور اندر ایک کنواں بنایا گیا ہے۔ باب الداخلہ کے کمرے سے گذرنے کے بعد ایک کھلا صحن ملتا ہے۔ اس کی دائیں جانب خادموں کے لیے لداؤ چھت کے کمرے ہیں۔ کمرے کے آگے بائیں جانب راستہ ہے۔ یہ راستہ اس گنبد والے کمرے کی طرف جاتا ہے جس میں متذکرہ قبر واقع ہے۔ مسجد کے ساتھ مقبرے کا لزوم جو عموماً مسجد کے بانی کا ہوتا ہے آگے چل کر عام ہونے والا تھا۔ مصر میں اس کی یہ اولین مثال ہے۔ صحن اور خادموں کے کمروں کے مشرق میں حرم واقع ہے۔ اس میں تین کمانوں کے ذریعہ داخل ہو سکتے ہیں۔ یہ کمانیں جوڑی دار ستونوں پر اٹھائی گئی ہیں۔ درمیانی کمان باقی دونوں کمانوں سے زیادہ چوڑی ہے۔ کمانیں نکیلی اور عام فاطمی طرز کی ہیں۔ ستون مرمر کے ہیں اور ان پر گھنٹے جیسے سر ستون بنائے گئے ہیں۔ پھر اسی شکل کو الٹ کر، کرسی کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ کرسی اور سر ستون کی یہ شکل اسلامی فن تعمیر میں آگے چل کر عام ہو گئی۔ یہ شکل پتھر اور مرمر دونوں میں استعمال کی گئی۔ اور یہ بالکل واضح ہے کہ یہ اینٹ اور سنگتر کے مسالوں میں اس شکل کے سر ستون کی تعبیر ہے۔ عمارت گھڑ چنائی کی ہے اور اس پر استر کاری کی گئی ہے۔ گنبد کا عبور اور مینار اینٹ کے ہیں۔ مینار کے مربع عبور کے سرے پر اینٹ کی چنائی کے توڑے دار دور دور قلمی آرائش میں بنائے گئے ہیں۔ مصر میں یہ شکل پہلی بار یہاں نمودار ہوئی ہے۔ ان توڑے دار چنائی کے دوروں کا مقصد اس سطح پر اس چبوترے کو جس پر سے اذان دی جاتی تھی، اور عریض کرنا تھا، اس چبوترے کو ایک جنگلے کے ذریعہ محفوظ کیا گیا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ سنگ کاری کی صنعت جسے العزیز نے قاہرہ میں تین پشت پہلے رائج کیا تھا، جامع الجیوشی کی تعمیر کے وقت بالکل ناپید نہیں ہو گئی تھی۔ لیکن اگر ان لوگوں کی ایسی اولاد باقی بھی رہ گئی ہو جو اپنے اجداد کی طرح اپنے فن میں ماہر تھی، تب بھی جامع الجیوشی کی تعمیر میں ان

سے کام نہیں لیا گیا۔ اس کی وجہ ممکن ہے کفایت شعاری ہو۔ یا ان کی خدمات فوجی کاموں کے لیے درکار رہی ہوں۔ بہت ممکن ہے بدر الجمالی کی آمد سے پہلے کے سخت اور پُر آشوب زمانے میں سنگ سازی کی صنعت کو زوال ہو گیا ہو اور العزیز کے عہد میں جو لوگ اس فن میں مہارت رکھتے تھے، اب ان کی اولاد صرف بھدی گنڈ چنائی کا کام کرنے لگی ہو۔ ایسی ہی بھدی گنڈ چنائی جس سے جامع الجیوش کی مرکزی دیواریں بنائی گئی ہیں۔

جامع الجیوش کا محراب اس کے کام کی ایک عمدہ مثال ہے۔ اس کی استرکاری میں قرآنی کتبے اور شاخہ کمان میں نباتی بیل بوٹوں کے نمونے بنا کر اس کی تزئین کی گئی ہے۔ محراب کے پہلوؤں میں دو ستون دیے گئے ہیں۔ باہر کی طرف کسی قسم کی تعمیری ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور نہ دراور دریچے نکالنے کا خیال آیا ہے۔

نقشے کی تبدیلی، مقبرہ کی موجودگی، لداؤ چھت کے مقابلہ میں سپاٹ چھت سے دست برداری، متقاطع لداؤ چھت کی ترویج، قلمی تشکل کا ظہور، یہ تمام چیزیں نئے اثرات کا ثبوت ہیں جو اس زمانے میں مصر کا اسلامی فن تعمیر قبول کر رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ مسجدوں کی تعمیر میں بیشتر ایسے ہی معمار (سوائے ان معماروں کے جنھوں نے متقاطع لداؤ چھت اور قلمی شکلیں بنائیں) لگائے گئے تھے جو عرصۂ دراز سے قائم شدہ مکتب کے پیرو تھے۔ تاہم نقشہ سازی اور عمومی ہدایت کا کام غالباً کسی ایسے ملک کے باشندے کے ہاتھ میں تھا۔ جہاں متقاطع لداؤ چھت کا عام رواج ہو گا۔ ممکن ہے ایسا شخص پناہ گزین کی حیثیت سے شام سے یا اور بھی شمال سے غالباً کسی ایسے فاطمی یا ممکن ہے بازنطینی صوبے سے آیا ہو جس پر سلجوق حملہ آوروں نے قبضہ کر لیا تھا۔

لیکن یہ اس عہد کی فوجی تعمیر کاری ہے۔ جو مصر میں فنی اثرات کی ایک

نئی رو کی موجودگی کا زبردست ثبوت پیش کرتی ہے۔ بدر الجمالی نے قاہرہ کی شہر پناہ از سر نو تعمیر کی۔ ایسا کرتے ہوئے اس نے شہر کو پھیلا کر جامع الحاکم کو شمالی شہر پناہ کے اندر لے لیا تاکہ شہر کی مدافعت کی اسکیم میں مسجد کے ابھرے ہوئے میناروں سے کام لیا جائے۔ اس شمالی شہر پناہ میں دو دروازے باب النصر اور باب الفتوح بنائے گئے تھے۔ یہ دروازے جامع الجیوش کے دو سال بعد ۱۰۸۷ء میں تعمیر کیے گئے۔ العزیز کی بنائی ہوئی شہر پناہ کچی اینٹوں سے غالباً کسی قدر چونا ملے ہوئے گارے سے بنائی گئی ہے۔ شمالی شہر پناہ پتھر کی ہے۔ جنوبی شہر پناہ کو بھی بدر الجمالی نے نئے سرے سے تعمیر کیا اور اس میں ایک بڑا دروازہ بنایا جو باب الزوالہ کہلاتا ہے۔ یہ دروازہ شمالی دروازوں کی تعمیر کے دو سال بعد ۱۰۹۱ء میں تعمیر کیا گیا تھا۔ شمالی قلعہ بندی کو اولیت دی گئی تھی۔ بدر الجمالی کی فوجی تعمیر کاری میں داسوں یا نہایت عمدہ ترشے ہوئے پتھر میں بنی ہوئی نیم قوسی کمانوں کے ذریعہ موکھوں میں فصل دیا گیا ہے۔ یہاں ایرانی کمانیں، اینٹ اور سنگستر سرے سے ناپید ہے۔ اس کے سامنے کھڑے ہو کر ہم یہ محسوس کرتے ہیں گویا یہ کوئی یورپی عمارت ہے۔ یعنی ایک ایسی چیز ہے جو بحر روم کی تہذیب سے مشابہ اور روما اور اس کی سلطنت کی یاد تازہ کر دیتی ہے۔ دروازوں کو برجوں کے ذریعہ سہارا دیا گیا ہے۔ اور انھیں محفوظ کیا گیا ہے۔ ان کے اوپر خسی ڈاٹیں بنائی گئی ہیں۔ اسلامی فن تعمیر میں دندانہ دار پچر کے استعمال کی اولیں مثالیں اسی عہد کی باقیات میں ملتی ہیں۔

ایک اور دلچسپ چیز دیواری روزن ہیں۔ یہ دیواری روزن باب النصر کی مدافعت کا ایک جزو ہیں۔ جہاں تک مجھے علم ہے روزن مدافعتی تدبیر کی اوّلین مثال ہیں اور انھیں تقریباً ایک صدی کے بعد یورپ میں اختیار کیا گیا ہے۔ یہ عظیم الشان دروازے مدرسہ کے تعمیر کاروں نے بنائے ہیں۔ یہ تعمیر کار قلعہ بندی کے بازنطینی اصولوں سے نہایت اچھی طرح واقف تھے۔ مدرسہ عرصۂ دراز تک

ایشیا کے مقابلہ میں بحر روم کی تہذیب کا ایک بڑا امین رہا ہے۔

اگر جامع الجیوشی اس عہد کے مصر میں شمالی ملکوں کے صناعوں، تعمیر کاروں اور سنگی تعمیر کی روایتوں کی آمد کی شہادت دیتی ہے تو قاہرہ کے عظیم الشان دروازے اس کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔"

حوالہ

۱- اسلامی فن تعمیر (ارنسٹ ٹاڈ ہیام ۔ آرکیٹکٹ برائے مجلس تحفظ آثار عرب (معر) شائع کردہ انجمن ترقی اردو علی گڑھ (انڈیا) ص ۱۴۱ تا ۱۴۹

مقبرہ سیّدہ رقیہ

○

جامع الاقمار کی تعمیر کے سات سال بعد ایک مقبرہ جو "مقبرہ سیدہ رقیہ" کہلاتا ہے قاہرہ میں تعمیر کیا گیا۔ یہ ایک گنبد والی عمارت ہے۔ اور خشتی تعمیر میں زاغ بندی کی چنائی اور کمان دار محرابوں کو ملا کر مربع سے دائرہ میں عبور بنانے کے طریقہ کی وضاحت کے لیے ایک دلچسپ مثال ہے۔ یہ اکہری کمان دار محراب ہی کی ایک پر تکلف شکل ہے۔ جو اس غرض کے لیے جامع ازہر جامع الحاکم، اور جامع الجیوشی میں استعمال کی گئی ہے۔ ان عمارتوں میں زیر بحث تعمیر کے مربع کا مثمن میں عبور ایک درجہ میں بنایا گیا تھا۔ اور اس پر گنبد تعمیر کیا گیا تھا۔ مقبرہ سیدہ رقیہ میں یہ عبور دو درجوں میں بنایا گیا ہے۔ اوپر کا درجہ ایک کمان دار محراب پر مشتمل ہے اور محراب مثمن کے دو کار کے نصف برابر عریض ہے۔ اور یہ مربع کے گوشوں پر واقع ہے۔ اس کے بیرونی زاویے چھوٹی چھوٹی لداؤ چھت کی ایسی محرابوں پر اٹھائے گئے ہیں جن میں ہر ایک کے نیچے کی سطح ایک قائم زاویہ مثلث بناتی ہے۔ اور اس مثلث کی تنصیف سلامی چھت کی کگری کا خط کرتا ہے۔ یہ چھوٹی قوسی لداؤ چھتیں ویسے ہی مثلثی دیواری پایوں پر اٹھائی گئی ہیں جن پر نچلی محراب کے اوپر کی کمان اٹھائی گئی ہے۔ لداؤ قوسی

چھتوں والی محرابوں اور نچلی وسطی محراب کے درمیانی قطعات گنبد کے مثلث نما کردی حصوں سے پُر کیے گئے ہیں۔ ان چار محرابوں کے مجموعہ کا خاکہ اس مجموعہ کا جواب ہے جو دو کمان دار دریچوں کے اوپر ایک اور کمان دار دریچے پر مشتمل ہے۔ اور اس طرح یہ تین روشن دانی دریچوں کا ایک مجموعہ بناتا ہے جو مثمن کے ہر متبادل ضلع پر بنایا گیا ہے۔ یہ کمان دار محرابیں جو اینٹ میں بنائی گئی ہیں اسی شکل کی ہیں جو توڑے کے پتھروں کے سروں پر قلمی آرائش میں پائی جاتی ہیں۔ قلمی شکلوں کی اصل غالباً تزئینی مقاصد کے لیے ان شکلوں کی نقل ہے جو کمان دار محرابوں سے لے کر توڑے تک استعمال میں آتی ہیں، اور جس کی ایک مثال سیدہ رقیہ کا مقبرہ ہے۔ یہ شکل سے ممکن معلوم ہوتا ہے کہ کہیں کسی ایسی شکل کو تزئینی طور پر استعمال کیا گیا ہو جس کی نظیر تعمیر میں ملے۔ اور چونکہ ہمیں "قلمی شکلیں" سیدہ رقیہ کے مقبرے سے بھی پہلے عہد میں ملتی ہیں۔ اس لیے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ عبور بنانے کے لیے مرکب محراب کے طریقے کی مثالیں سیدہ رقیہ کے مقبرہ سے بھی پہلے موجود تھیں۔ (اگرچہ غالباً یہ مصر میں نہ ہوں گی)۔ مصر میں اس طریقہ کا رواج ایسے لوگوں پر سلجوق ———— دباؤ کا ایک نتیجہ ہے جو دوسرے اسلامی ممالک جیسے شام، عراق، مسوپیٹیمیا اور ایران میں شیعی عقائد کے پیرو تھے۔ اور فرار ہو کر فاطمی مصر کی سازگار فضا میں آ گئے تھے۔"[1]

حوالہ

۱۔ اسلامی فن تعمیر، ص، ۱۵۷، ۱۵۸

جامع صالح

۱۱۵۲ء میں فلسطین میں فاطمیوں کا آخری قلعہ عسقلان صلیبی محاربوں کے قبضہ میں چلا گیا۔ اس کے سات سال بعد جامع صالح طلائی ابن رزاق جو عملاً فاطمیوں کا آخری تعمیری کارنامہ ہے قاہرہ کے جنوبی دروازے کے باہر اور اس کے قریب ہی تعمیر ہوئی۔ یہ مسجد ایک مستطیل قطعہ زمین پر بنائی گئی ہے۔ اور اس کی مساحت تقریباً ۱۲۵ ضرب ۸۵ فیٹ ہے۔ احاطے کی دیوار میں داخلے بنائے گئے ہیں۔ بڑا باب الداخلہ تو اپنی اصلی جگہ یعنی دیوار قبلہ کے مقابل سرے پر واقع ہے۔ باقی دو در بازو کی دیواروں میں بنائے گئے ہیں۔ جامع الجیوشی اور جامع الاقمر جیسی دوسری چھوٹی فاطمی مسجدوں کی طرح اس مسجد میں بھی مینار بڑے باب الداخلہ کے اوپر بنایا گیا ہے۔ اور اس کے دائیں بائیں طلبا کے کمرے ہیں۔ اس سرے پر کوئی ایوان نہیں ہے۔ صرف بازو کی دیواروں پر ایوان ہیں۔ حرم کا عمق مسجد کے طول کا ایک تہائی ہے اور اس کا چھت تین چھتوں پر اٹھایا گیا ہے جو دیوارِ قبلہ کے متوازی جاتے ہیں۔ ستون، سرستون اور کرسیاں قبل اسلام کی ہیں۔ ان میں سے بعض نصرانی کلیساؤں سے لیے گئے ہیں۔ کیونکہ ان پر صلیب کندہ کی ہوئی ملتی ہے۔ سرستون کے اوپر چوبی Dossercts ہیں۔ ان سے چوبی بندھن

ملائے گئے ہیں۔ کمانیں اونچے ستون دے کر عام فاطمی طرز میں بنائی گئی ہیں۔ اور انھیں پکی اینٹوں اور گچ سے تعمیر کیا گیا ہے۔ چھت سپاٹ ہے اور یہ ابتدائی طریقے کی طرف بازگشت ہے۔ بیرونی دیوار پتھر کی ہے۔ یہ پتھر باہر کی طرف گھڑا ہوا ہے، اور اندر کی طرف اس پر استر کاری کی گئی ہے۔ کوفی کتبے جو استر کاری میں بنائے گئے ہیں حرم کی کمانوں کے گرداگرد چلے گئے ہیں۔ ایک چوبی مقصورہ صحن سے حرم کو جدا کرتا ہے۔ دریچے دہرے تھے۔ اندرونی دریچے استر کاری میں منبت کار ہیں۔ اور ان میں عمارت کے اندرون کی زیبائش کے لیے رنگین شیشے لگائے گئے ہیں۔ بیرونی دریچے استر کاری کی جالیوں کے ہیں۔ یہ جالیاں بیرون عمارت کی زیبائش کے لیے بنائی گئی ہیں۔ دہرے دریچوں کا یہ وہی طریقہ ہے جو قبۃ الصخرہ میں موجود ہے، اور اس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں۔ محراب میں شیشے کی پچی کاری کی گئی ہے۔ اور اس کے دونوں بازوؤں پر پشت بغل ستون لگائے گئے ہیں۔ ان ستونوں کے سر ستون اور کرسیاں گھنٹے کی وضع کی ہیں۔ اس کا منبر باریک ہندسی دلاکاری کی ایک نہایت عمدہ مثال ہے۔ یہ منبر حیرت انگیز طور پر مختلف النوع گلکاری کے نباتی نمونوں سے لبا ہوا ہے۔ استر کاری کی تزئین اور منبر دونوں پر سے رنگ کے سارے نشانات محو ہو چکے ہیں۔ عمارت کا بیرونی رخ گھڑے ہوئے پتھر کا ہے۔ اور اس کے بالائی حصے کی تزئین کوفی کتبوں کی پٹیوں سے کی گئی ہے۔"[1]

حوالہ

۱۔ اسلامی فن تعمیر (ارنسٹ ٹاڈ بیام) ص ۱۵۹، ۱۶۰

شام کی چند عمارتیں

فلپ ہتیّ نے بھی اس موضوع پر لب کشائی کی ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"ناصر خسرو بیروت میں داخل ہوا تو اس نے ایک شاندار محراب دیکھی، جو بانوے فٹ بلند تھی۔ اس کے اطراف کی دیواروں میں سفید پتھر استعمال کیے گئے تھے۔ جن میں سے ہر ایک وزن میں ڈیڑھ ٹن سے کم نہ ہو گا۔ ان کے اوپر سنگ مرمر کے ستون تھے جو چودہ چودہ، پندرہ پندرہ فٹ اونچے تھے اور اتنے بھاری تھے کہ دو آدمی بالمقابل کھڑے ہوکر بازوؤں سے انھیں گھیرتے تو ان کے بازو بمشکل مل سکتے۔ ان کے اوپر محراب تھی جس کا وسطی حصہ پچھتر یا اسّی فٹ اونچا تھا۔ یہ محراب نہایت خوبصورت منقش پتھروں سے بنی تھی جن سے ہر ایک کا وزن دس ٹن تھا۔ ارد گرد کا میدان بھی ستونوں سے بھرا ہوا تھا جن کے بالائی حصے سنگ مرمر اور سنگِ خارا کے تھے۔"

ناصر خسرو لکھتا ہے: صیدا کی مضبوط فصیل میں چار دروازے ہیں۔ بازار اس شان سے سجائے گئے ہیں کہ اجنبی کو گمان ہو، سلطانِ وقت یہاں آنے والا ہے۔ باغات اتنے خوبصورت ہیں گویا ان میں سے ہر ایک بادشاہ نے تفریح کے لیے بنوایا۔ دولت مند اور بارونق صور کے بازار بھی بہت صاف ہیں۔ یہاں کی سرائیں بھی

پانچ پانچ چھ چھ منزلیں اونچی ہیں۔ طرابلس کی طرح اس شہر کی آبادی بھی زیادہ تر شیعوں پر مشتمل ہے۔ پانی کا بڑا اچھا انتظام ہے۔ یہ ایک خاص گذرگاہ بنا کر پہاڑوں سے لایا گیا ہے۔ عکہ کی جامع مسجد شہر کے وسط میں واقع ہے اور اردگرد کی عمارتوں سے زیادہ اونچی ہے۔ اس کے ستون سنگ مرمر کے ہیں۔ سمندر کی طرف کوئی دیوار نہیں، البتہ دیوار کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک زنجیریں لگی ہوئی ہیں۔ جب کوئی جہاز آتا ہے تو زنجیریں ڈھیلی کر دی جاتی ہیں کہ وہ پانی میں ڈوب جاتی ہیں۔ کوئی اجنبی جہاز آنا چاہے تو زنجیریں خوب کس دی جاتی ہیں۔[(۱)،(۲)]

حوالے

۱۔ ناصر خسرو سفرنامہ، ص ۱۴، ۱۵۔ انگریزی ترجمہ ص ۴۹، ۵۰ (طبع لندن)

۲۔ تاریخ لبنان (حتی) ص ۲۸۳

فاطمیوں کے خصوصیاتِ تعمیر

فاطمی عہد کے آخر تک مسجد کی ضروریات بہت بڑی حد تک اتنی ہی رہیں جتنی کہ چارصدی پہلے تھیں۔ تنہائی کے لیے محصورہ احاطہ، اس احاطہ کے سرے پر ایک مسقّف حرم، حرم تک پہنچنے کے لیے دونوں بازوؤں پر دالان بناکر سایہ دار راستے اور درمیان میں وضو کے لیے کھلا صحن۔ فاطمیوں کے زمانے تک بھی مسجد کے اہم خط وخال یہی رہے۔ لیکن اب مقبرہ کو بھی اہمیت حاصل ہونے لگی۔ اور فاطمی عہد کے دوران میں یہ چیز پہلی بار مسجد کے نقشہ میں جگہ پاتی ہے۔ چنانچہ جامع الجیوش کا یہی حال ہے۔ ضروریات کی تکمیل اور نئی نئی شکلیں اختیار کرنے میں طریقہ کار بھی بدلتا گیا۔ الحاکم کے عہد کے بعد جو چھوٹی مسجدیں تعمیر ہوئیں ان میں ایک ہی مینار کافی سمجھا گیا۔ یہ مینار باب الداخلہ کے اوپر بنایا گیا۔ یہی جگہ اس مینار کے لیے موزوں ترین جگہ ہے جس پر سے مسلمانوں کو مسجد میں جمع ہوکر نماز ادا کرنے کی صلاح دی جاسکتی ہے۔ اس کے بعد سے باب الداخلہ اور مینار میں ــــ چند استثناؤں کو چھوڑ کر ــــ بہت ہی قریبی تعلق رہا ہے۔ نئی تعمیری شکلوں میں چھت کے لیے لداؤ چھت اور گنبد، ایک شکل سے دوسری شکل میں عبور کے قلمی شکلوں سے مزین توڑے اور نہایت پرکار محرابیں بنانے کا طریقہ، اٹھا ہوا گنبد، دندانے دار سرول، گچ کی جالیوں میں بٹھائے ہوئے رنگین

شیشے کے دریچے۔ منبت کاراستر کاری، یا لکڑی کی جالیاں ـــــ ویسے ہی موکھوں میں بٹھائی ہوئیں جیسے کہ رنگین دریچے، دیوار کے بیرونی کنارے پر ـــــ بنیادی زمین کو نباتی نمونوں کے ساتھ ملاکر تزئین کے طریقوں میں غیر معمولی پرکاری، مربع سے مثمن اور مثمن سے دائرے میں تبدیل ہونے والے درجہ بدرجہ منزلوں والے مینار ـــــ یہ تمام عناصر جو اسلامی فن تعمیر کی اہم ترین خصوصیات ہیں، فاطمی دور میں ظہور پذیر ہوئیں اور آخر میں الفقل طاقوں اور ان کے درمیان سنگی پایوں کے ذریعہ پیش رخ کی تزئین ایسی ترقی تھی جو مصر میں ہمسایہ ملکوں سے سنگ کاروں کے داخلے کی وجہ سے عالم وجود میں آئی تھی۔[1]

حوالہ

۱۔ اسلامی فن تعمیر (ارنسٹ ہاڈ حیام)، ص ۱۶۱، ۱۶۲

فاطمیوں کا نظمِ مملکت

گرچہ تھے صفحۂ ہستی پہ ہم اک حرفِ غلط
لیک اٹھے بھی تو اک نقش بٹھا کے اٹھے

ابتدائیہ

فاطمیوں نے کم و بیش تین سو سال تک جہاں بانی اور جہانگیری کی۔ شام کے ایک مقام سلمیہ سے ایک آشفتہ حال شخص اٹھا۔ دشمنوں کی نظر سے بچتا، دار و رسن کو پھلانگتا اور محن و زندان کی سختیاں جھیلتا مغرب اقصیٰ میں پہنچا۔ وہاں پہنچا اور دیکھتے دیکھتے مالک تاج و نگین ہوگیا۔ اس کی حکومت کا مرکز قیروان تھا۔ لیکن بہت جلد تیونس، الجزائر، مراکش، سسلی (صقلیہ)، مصر، شام اور حرمین شریفین تک اس کے جانشینوں کی حکومت قائم ہوگئی۔ حالانکہ یہ سارے علاقے اعتقادی طور پر اس سے مختلف الرائے تھے۔ اس کے مقبوضہ اور محروسہ ممالک، ایک طرف اندلس کی حکومت کی زد پر تھے، دوسری طرف عباسیوں کی قوت یہ تہیہ کر چکی تھی کہ ہر قیمت پر اس نو پیدا حکومت کو ختم کرنا ہے تیسری طرف بازنطینی اثرات اس کے خلاف یورش کر رہے تھے۔ عیسائی اور مجاہدین صلیب سے اسے بار بار ٹکر لینا پڑتی تھی، —— کیا یہ بہت بڑا سیاسی معجزہ نہیں تھا؟

آئندہ صفحات میں فاطمی نظم مملکت، انداز خسروی، اور شان امامت پر مستند مصادر کی مدد سے ہم روشنی ڈالیں گے۔

خلافت

خصوصیات اور امتیازات

شیعی عقیدہ کی رو سے امام کا خانوادۂ نبوت میں سے ہونا واجب ہے۔ اور یہ بھی ضروری ہے کہ وہ حضرت علیؓ کی اولاد اور حضرت فاطمہؓ کے بطن سے ہو، اور یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔ اسماعیلیوں کے نزدیک پہلے امام حضرت علی المتوفی ۴۱ھ (۶۶۱ء) تھے۔

امام اسماعیل کے بعد ائمۂ مستورین کا دَور شروع ہوتا ہے۔ کیونکہ امام کے لیے یہ روا ہے کہ اگر اسے قوت و شوکت حاصل نہ ہو تو نگاہِ مردم سے مستور ہو جائے اور اس کے دعاۃ نیابت کا فرض ادا کریں۔ چنانچہ پہلے خلیفہ المستور محمد بن اسماعیل تھے، جو محمد المکتوم کے نام سے بھی مشہور ہیں۔ پھر ان کے صاحبزادے محمد المصدق پھر ان کے فرزند محمد الحبیب، پھر ان کے بیٹے عبد اللہ المہدی جنھوں نے ۲۹۷ھ (۹۰۹ء) میں فاطمی خلافت بلادِ مغرب میں قائم کی، اور پھر یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہا۔

المعز لدین اللہ کے عہد سے، جب وہ مصر میں داخل ہوا تو شان و تجمل کا رنگ مذہبی تقدس کے ساتھ ساتھ بڑھتا گیا۔ چنانچہ اس کے حضور میں جو لوگ آتے وہ زمین بوس ہوتے۔

رعیت میں سے جو لوگ حاضر ہوتے وہ خلیفہ کے ہاتھ اور پاؤں بھی چومتے۔ لیکن یہ اعزاز نہایت سربرآوردہ اور ممتاز لوگوں کے سوا کسی اور کو نہیں حاصل ہوتا تھا۔

خلیفہ کے اجلال و احترام کے پیش نظر اگر کوئی سجدہ ریز ہو جاتا تو اسے امر منکر نہ قرار دیا جاتا، کیونکہ سجدۂ تعظیمی ممنوع نہیں ہے۔

قاضی نعمان نے اپنے مخطوطہ میں لکھا ہے:

"امام کے حضور میں جو شخص حاضر ہو اسے چاہیے کہ سلام کا آغاز خود کرے۔ پھر زمین ادب کو بوسہ دے۔ اور بوسہ دیتے وقت اعتقاد رکھے کہ یہ فعل وہ تعظیماً تقرب الٰہی حاصل کرنے کے لیے کر رہا ہے۔ اور سجدے کے لیے زمین پر جھکنے سے پہلے سلام یوں کرے

السلام علیک یا امیر المومنین ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

سلام کرنے والا اگر مسلمان ہوگا تو امام سلام کا جواب دے گا۔ پھر جب زمین کو بوسہ دے چکے تو کھڑا ہو جائے۔ اور اگر وہ امام وقت کے سامنے کلام کرنے کا مجاز ہو تو اپنی بات رکھے، ورنہ کلام کرنے کی اجازت لے۔ اگر امام اجازت دیدے تو بات کرے۔ اور اگر اجازت نہ دے تو واپس چلا جائے!"

پھر آگے چل کر بتایا ہے کہ امام کے سامنے حاضر ہو کر کون سے آداب اور مراسم بجا لانے چاہئیں:

"حاضر ہونے والا جب امام کے سامنے کھڑا ہو تو اس اعتدال کے ساتھ کھڑا ہو جیسے نماز میں کھڑا ہوتا ہے۔ نظر نیچی رکھے۔ بازو جھکے ہوں

امام کو دزدیدہ نظروں سے دیکھے، نظر سے نظر ملاکر نہیں ـــــ یا دونوں ہاتھ کھول کر کھڑا ہو، یا سینہ پر باندھ کر، اس وقت تک خاموش رہے جب تک آغاز کلام خود امام کی طرف سے نہ ہو ـــــ جب وہ گفتگو کر رہا ہو تو اس وقت تک جاری رکھے جب تک امام سنے۔ اگر امام اعراض کرے، یا قطع کلام کرے تو سکوت اختیار کر لے، اور اس وقت تک خاموش رہے جب تک امام خود اذن کلام زبان سے یا اشارہ سے نہ دے۔ بلا اجازت واپس نہ جائے ـــــ امام سے تخاطب کے وقت آواز نہ بلند ہو نہ پست۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے نبی کی آواز سے بلند آواز کرنے کی ممانعت فرمائی ہے۔ لہذا ہر عصر اور ہر زمانے میں یہی بات ائمہ کے لیے بھی جو ذریت نبی ہیں ملحوظ رکھنی چاہیے ـــــ اگر امام بات کر رہا ہو تو گوش ہوش سے سنے۔ امام کا تخاطب اگر جماعت سے ہو تو جملہ حاضرین کان لگا کر بات سنیں۔

ـــــ جو شخص کلام امام میں ہزل و مزاح کی کوئی بات سنے یا اسے کوئی بات عبث نظر آئے یا بے قاعدہ معلوم ہو تو چاہیے کہ سمجھ لے کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے ائمہ کو ان باتوں سے ماوراء رکھا ہے اور یہ اس کے فہم کا قصور ہے کہ وہ الفاظ کا ادراک معرفت نہیں کر پاتا۔

ـــــ امام کی مجلس میں اگر کوئی ایسی بات ہو کہ امام ہنس پڑے، یا تبسم کرے، تو حاضرین میں سے کسی کو زیبا نہیں ہے کہ خود بھی ہنس پڑے۔ حاضرین کو چاہیے کہ باادب رہیں۔ نظریں جھکائے رکھیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ تبسم کناں نظر آئیں۔ وقار کا دامن نہ چھوڑیں۔

ـــــ امام اگر حاضرین میں سے کسی کے ساتھ سرگوشی کرے، تو قریب کے آدمی کو چاہیے کہ سننے کی کوشش نہ کرے۔ دور ہٹ جائے یہاں تک کہ سرگوشی ختم ہو جائے۔

لوگوں کو باہمی سرگوشی سے گریز کرنا چاہیے۔ آپس میں بات چیت بھی نہ کرنی چاہیے اور مجلس امام میں جو باتیں ہوں ان کی ایک راز کی طرح حفاظت کریں۔"(۴)

فاطمیوں کے نزدیک امام کا اللہ تعالےٰ سے وہی روحانی تعلق ہوتا ہے جو انبیاء ورسل کا ہوتا ہے۔(۵)

امام اپنے کسی فعل کا جواب دہ نہیں۔ اس کے ہاتھ میں سارے اختیارات ہیں۔ جو کچھ وہ کرتا ہے خیر ہے۔ جس سے روکتا ہے شر ہے۔ کسی کو اس پر معترض ہونے کا حق نہیں۔ کیونکہ اس سے خطا اور نسیان کا صدور نہیں ہو سکتا۔ اس کا حکم اللہ کا حکم ہے۔ اس کا فعل امر الٰہی ہے۔

"اگر جب کوئی بات جاننا چاہتے ہیں خدا انھیں فوراً بتا دیتا ہے۔ انھیں ماضی اور مستقبل کا علم ہوتا ہے۔ ان سے کوئی چیز بھی مخفی نہیں ہوتی۔"(۶)

فاطمی امام تنہا وہ شخص ہے جسے اشیاء کے باطن کا علم ہوتا ہے۔ عقل باطن کا ادراک نہیں کر سکتی، جب تک امام نہ بتائے۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ نے اسے علم تاویل سے اس طرح سرفراز کیا ہے جس طرح رسول علیہ السلام کو تنزیل سے۔"

روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
تمہارے درمیان میرے اہل بیت کی حیثیت سفینۂ نوح کی ہے، جو اس پر سوار ہو گیا اس نے نجات پائی، جس نے اس سے اعراض کیا غرق ہوا۔
نیز آپؐ نے فرمایا:
میرے اصحاب (یعنی ائمہ از ذریت رسولؐ) نجوم کی طرح ہیں جس کی بھی پیروی کروگے ہدایت پاؤگے۔"(۷)

فاطمی خلفا پس پردہ رہتے تھے۔ ان کی حفاظت کے لیے باڈی گارڈ بھی رہتا تھا۔

خلیفہ کا ذکر جب خطبہ میں کیا جاتا لوگ تقدیس و تعظیم کے مظاہرہ کے لیے کھڑے ہو جاتے"۔[۱۰]

جمہور نے احترام خلیفہ میں اس درجہ غلو روا رکھا تھا کہ اسے دیکھ کر وہ رکوع میں جھک جاتے اور سجدے میں گر پڑتے"[۱۱] یا پیادہ اس کی خدمت میں حاضر ہوتے اس کی رداء کا دامن چوم لینا شرف عظیم کا سبب خیال کرتے۔

اسماعیلیوں کی ایک رسم یہ تھی کہ بہ قدر ۳۳ ۲/۳ پوشیدہ طور پر ایک ٹیکس دیتے دیتے تھے جو ہر مرد اور عورت پر واجب تھا۔ یہ رقم صندوق اخوت میں ڈال دی جاتی تھی۔

مصر میں خلیفہ کے سوا کوئی سوار نہیں ہو سکتا تھا۔

خلیفہ کے اختیارات میں یہ بھی تھا کہ وہ ان لوگوں کا مال و دولت اور ان کے املاک واموال کو داخل خزانۂ سرکاری کر لیتا تھا جن کے بارے میں معلوم ہوتا تھا کہ یہ دولت انھوں نے غیر مشروع طور پر جمع کی ہے۔

جس طرح عباسیوں کا شعار سیاہ رنگ تھا، اسی طرح فاطمیوں نے سفید رنگ کو اپنا شعار بنا لیا تھا۔ جوہر نے جب جامع عمرو بن العاص میں نماز جمعہ پڑھی تو خطیب سفید لباس میں ملبوس تھا"[۱۲] فاطمیوں نے یہ سفید رنگ اس حدیث نبوی کے ماتحت اختیار کیا تھا:

"اللہ کے نزدیک تمہارے لباس کا محبوب رنگ سفید ہے۔ سفید لباس پہن کر نماز پڑھو۔ اس رنگ کے کپڑے میں اپنے مردوں کو کفن دو"۔[۱۳]

فاطمی خلیفہ کے سر پر ایک تاج ہوتا تھا جو تاج خلافت کہا جاتا تھا۔ اس

میں اتنے قیمتی اور گراں بہا جواہر ٹنکے ہوئے تھے کہ کسی دوسرے خلیفہ کے خزانہ میں ایسے جواہر نہیں تھے۔ اس میں ایک "درِ یتیم" بھی ہوتا تھا، جس کا وزن سات درہم تھا۔ یہ دوسرے جواہر کے اوپر پیشانی کے قریب چمک دکھاتا تھا۔"[15]

خلیفہ کے ہاتھ میں جو عصا ہوتا تھا وہ عود کا ہوتا تھا۔ اس کی لمبائی ڈیڑھ بالشت ہوتی تھی۔ اس پر سونے کے پترے ہوتے تھے جو موتی اور جواہر سے مرصع ہوتے تھے۔"[16]

تخت خلافت سونے کا تھا جس کے سامنے امراء، اعیان اور اصحاب رتبہ و مقام ادب سے صف باندھ کر کھڑے ہوتے تھے۔ محل کے ایوان کبیر میں دربار ہوتا تھا۔ المعز نے دربار کا مقام ایوان کبیر سے ایوان طلائی میں منتقل کر دیا۔ اور اسے سلاح خانہ بنا دیا۔ سب سے پہلے جس شخص نے خلیفہ کے لیے اونچی جگہ جلوس کی مقرر کی وہ معاویہ تھے۔ ان کے بعد یہ سلسلہ چل پڑا۔"[17]

خلیفہ کی ایک انگشتری بھی تھی جس سے رسائل اور توقیعات پر مہر لگائی جاتی تھی۔

خلافت فاطمیہ کا ایک دستور یہ بھی تھا کہ خلیفہ جب نشست فرما ہوتا تو اس کے سر پر چھتر کا سایہ کیا جاتا جسے سب سے بڑا امیر وقت ہاتھ میں لیے رہتا۔ اس کا رنگ بھی وہی ہوتا جو خلیفہ کے لباس کا ہوتا۔ مثلاً عید اضحیٰ کے موقعہ پر سرخ، عید فطر کے موقعہ پر سفید۔

یہ چھتر دیباج یا ریشم کا ہوتا جس پر سونے کا کام کیا ہوا ہوتا، اور جواہر سے مرصع ہوتا۔"[18]

خلیفہ کے پرچم کا رنگ سفید تھا۔ اسی لیے اسے مبیضہ کہتے تھے۔ اس پر آیات قرآنی اور عبارات دینی مرقوم ہوتی تھیں۔ مثلاً

"نصرمن اللہ وفتح قریب"

خلیفہ کی جب سواری نکلتی تو بوق بجتے۔ طبل پر چوٹ لگائی جاتی۔ بیس خچروں پر نقارے ساتھ ساتھ بجتے ہوئے چلتے۔[19]

فاطمی خلفاء "خلیفہ"، "امیرالمومنین"، اور "امام" کہلاتے تھے۔ نماز پڑھانا ان کے فرائض میں تھا۔ انھیں "سلطان" بھی کہتے تھے۔[۲] جس کے لغوی معنے حجت کے ہیں۔ خلیفہ کو سلطان اس لیے کہتے تھے کہ وہ رعیت پر حجت تھا جس کی اطاعت واجب ہے۔

اسے "سیدنا" بھی کہتے تھے، "مولانا" بھی اور "سیف الاسلام" بھی۔ علاوہ ازیں اور بھی اس کے بہت سے لقب تھے۔[۲]

مصادر و حواشی

۱۔ اسی لیے شیعوں نے امویوں اور عباسیوں کی حکومت تسلیم نہیں کی اور برابر اس کا مقابلہ کرتے رہے۔ اور بالآخر عبیداللہ المہدی نے رؤساء کتامہ سے بیعت لے کر خلافت فاطمیہ کی بنیاد مغرب اقصٰی میں رکھی۔ دعاۃ نے کتامیوں کو پہلے ہی سے ہموار کر رکھا تھا۔ اس طرح خلافت بیت علیؑ میں آگئی۔

ابوالفداء: المختصر فی اخبار البشر، ص ۳۳۴

ابن طباطبا: الفخری، ص ۱۲۸

۲۔ القلقشندی: صبح الاعشیٰ، ج ۳، ص ۴۹۹

۳۔ نظم الحکم بمصر فی عصر الفاطمیین ص ۵۰۶، بحوالہ کتاب الہمۃ فی آداب الائمۃ، ورق ۲۱

۴۔ القاضی نعمان: کتاب الہمۃ فی آداب الائمۃ قلمی نسخہ؛ ورق ۶۵، ۶۶، ۶۷۔ بحوالہ نظم الحکم بمصر فی عصر الفاطمیین؛ ص ۵۷، ۵۸۔

۵۔ محمد بن یعقوب الکلینی: کتاب اصول الکافی، ص ۸۲

۶۔ ایضاً، ص ۸۲

۷۔ القاضی النعمان: تربیۃ المومنین، قلمی نسخہ، ورق ۱۳، بحوالہ نظم الحکم بمصر فی عصر الفاطمیین ص ۶۰

۸۔ ایضاً، ص ۲۰

۹۔ حجاب کی رسم امویوں کے عہد میں پڑی، جو عصر طولونی و اخشیدی میں بھی جاری رہی۔
(صبح الاعشیٰ، ج ۳، ص ۴۷۷)

۱۰۔ النویری: نہایۃ الارب، ج ۲۶، ورق ۷۲ بحوالہ نظم الحکم بمصر فی عصر الفاطمیین،
ص ۶۳

۱۱۔ ابن میسر: اخبار مصر، ج ۲، ص ۵۱

۱۲۔ المقریزی: الخطط، ج ۲، ص ۲۲۶

۱۳۔ ابن خلکان: وفیات الاعیان، ج ۱، ص ۲۱۳

۱۴۔ ابن سعد: الطبقات، ج ۱۲، ص ۲۱۲

۱۵۔ العینی: عقد الجمان (قلمی نسخہ)، ورق ۸۸۹، حصہ چہارم، بحوالہ نظم الحکم بمصر فی عصر الفاطمیین، ص ۷۳

۱۶۔ القلقشندی: صبح الاعشیٰ، ج ۳، ص ۴۸۲

۱۷۔ ابن خلدون: المقدمہ، ص ۲۲۶

۱۸۔ القلقشندی: صبح الاعشیٰ، ج ۳، ص ۴۸۳، ۵۲۱، ۵۱۵، ۵۱۳

۱۹۔ ابن خلدون: المقدمہ، ص ۲۲۵

۲۰۔ السیوطی: حسن المحاضرہ، ج ۲، ص ۱۵۶

۲۱۔ نظم الحکم بمصر فی عصر الفاطمیین، ص ۷۸

قصرِ خلافت

شان و شکوہ، اور جلال و ہیبت کا مرکز

قصر کا نظام اور اس کے آداب

خلیفہ کے دو محل تھے، زیرِ زمین راستہ بھی تھا تاکہ بار بار دیکھنے سے خلیفہ کی ہیبت کم نہ ہو جائے۔[۱]

قصرِ کبیر مشرقی میں خلیفۂ فاطمی کا قیام رہتا تھا۔ یہیں وہ دربار کرتا تھا۔ اربابِ سیف، اہل دولت اور اکابر یہیں حاضری دیتے تھے۔ یہیں اس کے خاندان کے افراد مصاحب اور خاص خاص آدمی رہتے تھے۔ یہیں دواوین اور خزائن تھے۔ عینی نے اپنے مخطوطے میں ذکر کیا ہے کہ صاحب العسس (ہیڈ سنتری)، ساری رات قصر کا پہرہ دیتا تھا۔ اور محل کے ارد گرد گشت کرتا رہتا تھا۔ اس کی ماتحتی میں ایک ہزار آدمی تھے جو طبل اور بوق استعمال کرتے تھے۔ ان سب کے لباس فاخرہ قابلِ دید تھے۔[۲]

دوسرا قصر "قصرِ صغیر غربی" کہلاتا تھا۔ یہ عزیز باللہ کے عہد میں مکمل ہوا۔ یہ کنار رودِ نیل تھا۔ تفریح کے لیے اور خلیج میں کشتی رانی کے لیے خلیفہ کبھی یہاں

آجاتا تھا۔ ان دونوں قصروں کا نام اگر ایک ساتھ لینا ہو تو "قصور زاہرہ" کے نام سے یاد کرتے تھے"(۳)

قصر شاہی کی عمارتیں رنگارنگ کے انواع و اقسام سے مزیّن تھیں۔ دیکھنے والے کی نگاہ اس منظر کو دیکھ کر ٹھہر جاتی تھی۔ چھتوں میں ایسے ٹائل لگے تھے جن پر سونے کی پتریاں چڑھی تھیں۔ قدم قدم پر فوارے تھے۔ جن کی ٹوٹیاں سونے اور چاندی کی تھیں۔ ان سے آبِ صافی کی تراوش جاری رہتی تھی"(۴)

محل شاہی کی وسعت میں بہت سی عمارتیں پھیلی ہوئی تھیں۔ ان میں قبے تھے۔ رواق تھے۔ ان کی دیواریں اور چھتیں زرکار و زرنگار تھیں۔ ریشم اور دیبا کے پردے لٹکتے رہتے تھے۔ باغات تھے۔ چبوترے تھے۔ جنھیں ایک کنج کی صورت میں جھاڑیاں ڈھانکے ہوئے تھیں۔ خواتین حرم کے رہنے کی عمارتیں تھیں۔ خادموں کے لیے حجرے تھے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ قصور زاہرہ اپنے حسن و زیبائی، اور رعنائی و خوبی اور رونق میں اپنا جواب آپ تھے۔ اسی طرح انھیں مضبوطی اور استحکام کے اعتبار سے بھی امتیاز خاص حاصل تھا۔ ان میں باغات تھے۔ پھلواریاں تھیں "تالاب تھے۔ فوارے تھے۔ طرح طرح کے دیدہ زیب اور خوشبودار درخت تھے۔

خلیفہ کے قصر میں غلاموں اور باندیوں کی بھی کثرت تھی۔ نوبہ، حبشہ، سوڈان، اور ترکستان دمین سے خوبصورت غلاموں کی کھیپ کی کھیپ منہ مانگے داموں پر آیا کرتی تھی۔ جنھیں خلیفہ عہدے اور منصب دیتا تھا۔ اپنا مصاحب اور ندیم بناتا تھا۔ نقد و جواہر سے لاد دیتا تھا۔ قدردانی کی یہی کیفیت باندیوں کے ساتھ بھی تھی۔ خلیفہ حاکم بامر اللہ کی ہمشیر شہزادی ست الملک کے پاس چار ہزار جاریہ تھیں جن میں ۱۵۰۰ کنواری تھیں۔

قصر میں رقاصاؤں اور نغمہ طراز باندیوں کی بھی بہت بڑی تعداد تھی۔ جو باندی خریدی جاتی اسے اشعار یاد کرائے جاتے۔ بڑے بڑے استادوں سے تعلیم دلائی

جاتی، یہاں تک کہ وہ اپنے فن میں کامل ہو جاتی۔

دولت فاطمیہ اپنی دولت وثروت، اور شان وعظمت کے اعتبار سے دول اسلامیہ میں سب سے بڑی حکومت تھی۔ قصر شاہی میں بہت سے محکمے اور توشہ خانے تھے، جن میں سے چند یہ ہیں:

خزانۃ الکسوہ

یہ ہمیشہ بہترین قسم کے زنانہ و مردانہ ملبوسات اور انواع و اقسام کے ریشمی پارچہ جات سے بھرا رہتا تھا۔

درزی خانہ

یہاں ایک "صاحب المقص" ہوتا تھا جو درزیوں کا سربراہ ہوتا تھا۔ اس کے ہاتھ کے نیچے بہت سے درزی کام کرتے تھے۔ ان کے لیے علیحدہ مکانات بنے تھے جہاں یہ بیٹھے پردسنے کا کام کیا کرتے تھے۔ خلیفہ کا لباس بھی یہی تیار کرتے تھے۔

خزانۃ الکسوۃ الباطنۃ

اس کی نگراں اور سربراہ کوئی عورت ہوا کرتی تھی۔ اس کی مدد کے لیے تیس باندیاں ہر وقت حاضر رہتی تھیں۔ خلیفہ کا لباس اسی کی نگرانی میں بدلا جاتا تھا۔ یہی اس میں عطر بساتی تھی۔

درزی خانے میں جتنے اعلیٰ ملبوسات تیار ہوتے تھے، اور بلاد اسلامیہ سے جو نفیس ترین اور بہترین پارچہ جات آیا کرتے تھے، وہ سب یہیں ذخیرہ کیے جاتے تھے۔

محل کے مردوں، عورتوں، ان کی اولاد، خواص، اور خدم و حواشی کے لیے گرما اور سرما کا لباس تیار کرنے کا حکم یہیں سے دیا جاتا تھا۔

اسی طرح امراء، وزراء اور منصب داران حکومت کے لیے خلعتیں تیار کرنے کی ہدایت بھی یہیں سے جاری ہوتی تھی۔ یہ خلعتیں نہایت گراں بہا ہوتی تھیں

خلعت کے ساتھ مرصع عمامہ بھی دیا جاتا تھا۔[۵۹] علاوہ ازیں طوق، کنگن، ہار، مرصع تلواریں بھی عطا ہوتی تھیں۔

امراء کے لیے جو خلعت تیار ہوتے تھے ان میں جواہر کے ہار ہوتے تھے۔ وزراء کو جو خلعت ملتے تھے ان میں ریشمی اور زرکار و زرنگار پارچہ جات بھی شامل ہوتے تھے۔

خلیفہ کی طرف سے جو خلعت عطا ہوتے تھے ان پر خلیفہ کا نام بھی سنہرے حروف میں کڑھا ہوتا تھا۔

خزائن کسوہ کا افسر اعلیٰ "دیوان خزائن الکسوہ" کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ یہ بہت بڑا عہدہ تھا۔[۶۰]

خزائن جواہر وغیرہ

بطائحی کا بیان ہے کہ عید اور دوسرے تہواروں کے مواقع پر خلیفہ کے استعمال میں جتنے جواہر اور اس طرح کی دوسری قیمتی چیزیں آتی تھیں وہ استعمال کے بعد یہیں واپس کر دی جاتی تھیں۔ نیز شان و شوکت کی وہ چیزیں جن سے خلیفہ کی عظمت و جلال میں اضافہ ہوتا تھا یہیں ذخیرہ رہتی تھیں۔

علاوہ ازیں ہر طرح کی خوشبوئیں، سامان آرائش و زینت، صندل، عود، آبنوس، ہاتھی دانت وغیرہ قسم کی چیزیں بھی یہیں رکھی جاتی تھیں۔

خزائن السلاح

یہاں ہر قسم کے ہتھیاروں کا ذخیرہ رہتا تھا۔ ان میں سونے اور چاندی سے مرصع ہوئے خود بھی تھے۔ عربی تلواریں بھی، تیر، پیکان، ترکش، زرہ غرض جملہ آلات سلاح۔

خزائن فرش و امتعہ

یہاں بہترین اور گراں بہا قسم کے فرش فروش کا ذخیرہ رہتا تھا۔ رنگارنگ، متنوع اور دیدہ زیب قسم کے پردے بھی موجود رہتے تھے۔ اس کے علاوہ دوسری

قیمتی چیزیں رکھی جاتی تھیں"۔

خزانۃ السراج

یہ ایک بہت بڑا ہال تھا۔ یہاں سونے اور چاندی کی زین اور لگام، بتعداد کثیر موجود تھیں۔ نیز اسپ سواری کے دوسرے قیمتی لوازمات موجود رہتے تھے۔ اس کی دیکھ بھال کے لیے ایک مستقل عملہ مقرر تھا۔

خزانۃ الشراب

یہاں ہر قسم کے بہترین مشروبات اور مربے موجود رہتے تھے۔ دواؤں کا ذخیرہ بھی یہیں رہتا تھا۔ عطریاتِ فاخرہ کی مقدار کثیر بھی یہاں تیار رہتی تھی ظروف گراں بہا کا بھی بڑا اعلیٰ ذخیرہ تھا۔ جن کا حصول بڑے بڑے شاہان وقت کے سوا کسی کے لیے ممکن نہ تھا۔

خزانۃ الطعام

یہاں پستے۔ شکر۔ شہد۔ زیتون اور موم وغیرہ کے ذخائر موجود رہتے تھے۔ گوشت اور سبزی ترکاری کے علاوہ خلیفہ، اس کے اہل بیت، اور منصبداروں کے لیے مذکورہ چیزیں یہیں سے جاتی تھیں"۔

خزائن الخیم

یہاں بہت بڑی تعداد خیموں اور چھولداریوں کی موجود رہتی تھی۔

خزائن البنود

بنود یعنی جھنڈے اور پرچم۔ اس کا واحد "بند" ہے۔ جو بڑے علم یارایت یالواء کے لیے بولا جاتا ہے۔

یہ جھنڈے اور پرچم مجالس، تقاریب، اور میدان جنگ میں استعمال ہوتے تھے۔ ان پر آیاتِ قرآنیہ اور عباراتِ دینیہ مرقوم ہوتی تھیں۔

حواصل المواشی

خلیفہ کے لیے دو طویلے خاص تھے۔ ایک گھوڑوں اور خچروں کے لیے۔

دوسرا اونٹوں کے لیے۔

ان مویشیوں کی بہت بڑی تعداد ہر وقت موجود رہتی تھی۔ ان کا استعمال خلیفہ کی سواری یا اربابِ مراتب یا خادمانِ دولت کے لیے خاص تھا۔

دار الضیافۃ

یہاں غیر ممالک کے سفرا، اور نمائندے پوری شان و شوکت اور احترام کے ساتھ ٹھہرائے جاتے تھے۔

۳۶۲ھ (۹۷۲ء) میں جوہر نے ایک سفیر بادشاہ نوبہ کے پاس جس کا نام جارج تھا بھیجا۔ اور اسے دعوت دی کہ یا اسلام قبول کر لے یا جزیہ دے۔ بادشاہ نے جزیہ دینا منظور کر لیا۔

نوبہ آٹھویں صدی ہجری (چودھویں صدی عیسوی) تک دین مسیحیت پر قائم رہا۔[9]

روم کا سفیر جب مصر میں آیا تو باب فتوح پر سواری سے اتر پڑا۔ زمین ادب کو بوسہ دیا اور پاپیادہ قصر تک آیا۔[10]

متولی دار الضیافۃ کو "نائب" کہتے تھے۔

متولی کی مدد کے لیے صاحب الباب ہوتا تھا جو سفرا کو ان کی مخصوص قیام گاہ پر ٹھہراتا تھا۔

———•———

قصر کے منصب داروں میں یہ لوگ تھے:

حامل المظلّۃ

یعنی چتر بردار۔ یہ دربار میں اور سواری کے موقعہ پر خلیفہ کے سر پر چتر لے کر کھڑا ہوتا تھا۔ اس منصب پر کوئی بہت بڑا آدمی فائز کیا جاتا تھا۔

حامل سیف الخلیفہ

یعنی شمشیر بردار۔ خلیفہ کی سواری جب نکلتی تو خلیفہ کی تلوار لے کر ساتھ چلتا۔ اس کا درجہ سپہ سالار کے بعد تھا۔

صاحب المجلس

دربار میں اشراف و اعیان کو بٹھانے کا کام اس کے ذمہ تھا۔ اسے امین الدولہ کہتے تھے۔

صاحب الرسالہ

یہ خلیفہ کے فرامین و مراسلات وزراء وغیرہ کے پاس بدست خود لے جاتا تھا۔ آخر عہد فاطمی میں اس منصب کا نام "الامیر الثقہ" پڑ گیا تھا۔

متولی زمام القصر

یہ قصر کے تمام معاملات کا نگراں تھا۔ خدام قصر اسی کی ماتحتی میں تھے۔ ان کی ڈیوٹیاں یہی تقسیم کرتا تھا۔ اور ان کی کارگزاری کو نظر میں رکھتا تھا۔

متولی زمام الاقارب

خلیفہ کے عزیزوں، اور قرابت داروں کے احوال و معاملات اسی کے سپرد تھے اور اس کا قول ان معاملات میں حرف آخر مانا جاتا تھا۔

طبیب خاص

اس کا فرض یہ تھا کہ دن بھر باب خلیفہ پر حاضر رہے۔ اور جب بھی خلیفہ یا اس کے اہل خاندان میں سے کسی کو ضرورت ہو فوراً علاج کے لیے پہنچ جائے۔ اس کی اعانت کے لیے کئی طبیب ساتھ رہتے تھے۔ ان کے لکھے ہوئے نسخے خزانۃ الشراب سے جو دوا خانہ بھی تھا، تیار ہو کر فوراً آجاتے تھے۔

ان اطباء کو بڑی قدر اور منزلت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ اور خلیفہ بھی ان کی بڑی توقیر کرتا تھا۔ اسحاق بن سلیمان یہودی منصور اور اس کے بیٹے المعز لدین اللہ کے طبیب خاص تھے۔ بعد میں معز نے موسیٰ بن عازار کو طبیب خاص بنایا۔[11]

اسی طرح ایک نصرانی طبیب ابوالفتح سہل ابن مقشر خلیفہ عزیز باللہ اور اس کے بیٹے حاکم بامراللہ کا طبیب خاص تھا۔

ایک مرتبہ حاکم بامراللہ بیمار پڑا۔ ابن مقشر کے علاج سے تندرست ہو گیا تو

اسے دس ہزار دینار عطا کیے۔[۱۲]

قراء خاص

ان قاریوں کی تعداد دس سے زیادہ تھی۔ یہ خلیفہ کی مجالس میں اور سواری کے مواقع پر اور دوسرے مناسبات پر، قرآن کریم کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ ان کا کمال یہ تھا کہ بڑی مناسب حال آیتیں تلاوت کرتے تھے۔ جس سے خلیفہ اور حاضرین بہت محظوظ ہوتے تھے۔

خلیفہ المستنصر باللہ فاطمی نے جب بدر جمالی کو وزیر اعظم بنایا تو قاری نے تلاوت کی:

ولقد نصرکم اللہ ببدر وانتم اذلۃ، فاتقوا اللہ لعلکم تشکرون۔

اسی طرح خلیفہ الحافظ نے جب رضوان بن ولخشی کو منصب وزارت سونپا تو قاری نے یہ آیت تلاوت کی:

"یبشرھم ربھم برحمۃ منہ ورضوان وجنات لھم فیھا نعیم"

شعرا دربار

دولت فاطمیہ میں شعراء کی بڑی قدر و منزلت ہوتی تھی۔ خلفاء، امراء وزراء سب انھیں مالا مال کرتے رہتے تھے۔ یہ شعراء خلفاء اور اہل بیت کی مدح میں قصیدے بھی کہتے تھے۔ جس میں ان کے اخلاق و عقائد کا ذکر بھی کر جاتے تھے۔

ان شعراء میں اہل سنت بھی تھے، اور شیعہ بھی۔ اول الذکر مدح میں غلو سے کام نہیں لیتے تھے۔ آخر الذکر خوب خوب غلو کرتے تھے۔ مثلاً ایک شاعر کہتا ہے،

ھذا امیر المومنین بمجلس
الجبروت فیہ الوحی والتنزیل ملا
واذا تمثل راکبا فی موکب

عاینت تحت رکابہ جبریلا

یعنی :

- یہ امیرالمومنین ہیں جو اپنی مجلس میں تشریف فرما ہیں ،
- جہاں میں وحی اترتے ہوئے دیکھ رہا ہوں ،
- اور جب امیرالمومنین سوار ہوتے ہیں ،
- تو میں ان کی رکاب کے نیچے جبریل کو دیکھتا ہوں"[۱۳۱]

ابن ہانی

خلیفہ فاطمی المعز لدین اللہ اپنے شاعر خاص محمد بن ہانی اندلسی پر بہت مہربان تھا اس نے بہت سے مدحیہ قصیدے لکھے تھے اور ان میں عقائد مذہب اسماعیلی یعنے عصمت ائمہ ، نظریۂ امامت ، مسئلہ تاویل ، اور شریعت کے ظاہری و باطنی پہلو کی صداقت پر دل نشین انداز میں اظہار خیال کیا ۔

تمیم بن المعز

خلیفہ المعز کا ایک لڑکا نزار تخت حکومت پر متمکن ہوا ۔ دوسرا تمیم اقلیم ادب کا شہریار رہا ۔ سلاست اور روانی تمیم کی شاعری کا حسن ہے ۔ ۳۷۴ھ (۹۸۴ء) میں اس کا انتقال ہوا ۔

عباسی شاعر ابن المعتز کے جواب میں اس کا ایک شعر بہت مشہور ہے :

لیس عباسکم کمثل علی
هل تقاس النجوم بالاقمار؟

یعنی :

تمہارا عباسؓ بھلا علیؓ کے مانند کیسے ہو سکتا ہے ؟
کہیں ستاروں کو چاند پر بھی قیاس کیا جا سکتا ہے ؟[۱۳۲]

عمارہ بن ابی الحسن علی بن زیدان الیمنی

$\frac{۵۱۵}{۵۶۹}$ھ ($\frac{۱۱۲۱}{۱۱۷۴}$ء) یہ بھی بڑا اچھا شاعر تھا ۔ اس نے خلیفہ فائز اور خلیفہ

عاضد (آخری فاطمی خلیفہ) کی مدح لکھی۔ پھر جب سلطان صلاح الدین نے دولتِ فاطمیہ کا خاتمہ کر دیا تب بھی فاطمیوں سے عمارہ کی عقیدت اور وفاداری میں فرق نہیں آیا۔ اس نے عاضد کا بڑا پُر درد مرثیہ لکھا جس کی پاداش میں صلاح الدین کے عتاب و غضب اور ظلم و جور کا اسے ہدف بننا پڑا۔

یہ مذہب شافعی کا پیرو تھا۔

اس کے مرثیہ کا پہلا شعر تھا:

رمیت یا دھر کف المجد بالشلل
وجیدہ بعد حسن الحلی بالعطل

یعنی:

اے زمانے تو نے مجد کے ہاتھ پر تیر چلایا اور ناکارہ بنا دیا۔
اور اس کی گردن جو زیور سے آراستہ رہتی تھی اسے بے جان کر دیا۔

اور آخری شعر تھا:

واللّٰہ لا زلت عن حبی لھم ابدا
ما اخر اللّٰہ لی فی مدۃ الاجل

خدا کی قسم جب تک میں زندہ رہوں گا،
فاطمیوں کی محبت کا دم بھرتا رہوں گا۔

اپنے اور فاطمیوں کے عقائد کے بارے میں کہتا ہے:

افاعیلھم فی الجود افعال سنۃ
وان خالفونی فی اعتقاد التشیع

یعنی:

جود و سخا میں فاطمیوں کے افعال بالکل سنت کے مطابق تھے۔
اگرچہ ان سے اعتقادِ تشیع میں مجھے اختلاف ہے۔

حجابت

حاجب اور دربان کی رسم معاویہ بن ابی سفیان کی ایجاد ہے جو بعد میں عام ہو گئی۔ چنانچہ عہد فاطمی میں بھی ہمیں اموی اور عباسی عہد کی طرح حاجب نظر آتے ہیں۔

اس منصب پر کوئی بڑا منصب دار فائز کیا جاتا تھا۔ اس کا فریضہ یہ تھا کہ خلیفہ سے اجازت لیے بغیر کسی کو پیش نہ ہونے دے۔ خلیفہ کو رعیت کے حالات سے باخبر رکھتے تھے۔ یہ مرتبے میں وزیر کے برابر ہوتا تھا[۱۱]

مصادر و حواشی

۱۔ نظم الحکم بمصر فی عصر الفاطمیین، ص ۷۹

۲۔ عقد الجمان، ج ۱۹، حصہ چہارم، ص ۶۸۵، بحوالہ نظم الحکم بمصر فی عصر الفاطمیین ص ۷۹۔

۳۔ ابن اثیر: الکامل، ج ۲، ص ۲۱۲

۴۔ کنوز الفاطمیین، ص ۱۶۱

۵۔ ایک مرصع عمامہ کی قیمت پانچ سو دینار ہوتی تھی۔ (نظم الحکم بمصر فی عصر الفاطمیین، ص ۴۴)

۶۔ القلقشندی: صبح الاعشیٰ، ج ۳، ص ۴۹۴

۷۔ المقریزی: الخطط، ج ۲، ص ۲۶۲

۸۔ القلقشندی: صبح الاعشیٰ، ج ۳، ص ۴۷۶

۹۔ O'Leary, A Short History of the Fatimid Khalifate, P. 170.

۱۰۔ المقریزی: الخطط، ج ۳، ص ۴۱۷

۱۱۔ ابن خلدون: العبر فی دیوان المبتدا والخبر

۱۲- استاذ عنان : الحاکم بامر اللہ، ص ۳۰۷
۱۳- القلقشندی : صبح الاعشیٰ - ج ۳ - ص ۴۹۷
۱۴- احمد امین بک : ظہر الاسلام، ص ۲۱۸
۱۵- نظم الحکم بمصر فی عصر الفاطمیین، ص ۹۵

قصر و دربار کی شان و شوکت

صلیبیوں کے سفیروں کی باریابی جو عاضد کے محل میں ہوئی۔ اس کی مفصل کیفیت اسٹنلے لین پول نے لکھی ہے۔ جس سے خلیفہ کے محل کی شان و شوکت اور اس کے محلات کے آداب پر روشنی پڑتی ہے۔

نصرانی سفیروں کی باریابی حضرت اقدس میں جہاں بڑے پائے کے مسلمان بھی صرف چند ہی داخل ہو سکتے تھے ایک بے نظیر واقعہ تھا۔ لیکن طریک ہی کو ایسا موقع ملا کہ اس کو خود اپنے شرائط پیش کر سکنے کی اجازت حاصل ہو گئی۔ قیسا دیہ کا ہیو اور جیوفری فلیچر دی ٹمپلر سفارت کے لیے منتخب کیے گئے۔ خود وزیر ان کو اپنے ساتھ مشرقی آداب ادا کراتا ہوا محل میں لے گیا۔ پوشیدہ لمبے راستوں اور محفوظ دروازوں میں سے انھیں گزرنا پڑا۔ جہاں قوی ہیکل حبشی سپاہیوں نے ننگی تلواروں سے سلامی دی۔ پھر وہ اوپر سے کھلی ہوئی ایک وسیع عمارت میں پہنچے جس کے اطراف سنگ مرمر کے ستونوں پر ٹکی ہوئی کمانیں تھیں۔ اس کی اندرونی چھتیں رنگ رنگ کے سنہری نقش و نگار سے جگمگا رہی تھیں۔ راستے پر پچی کاری کا فرش تھا۔ مسیحی امیروں کی نامانوس آنکھیں اس مذاق لطیف کو دیکھ کر جو کبھی ان کی نظروں سے گذرا نہ تھا تعجب سے کھل گئیں۔ انھیں سنگ مرمر کے فوارے

ختلف بولیاں بولنے والے اور حیرت انگیز رنگ برنگ کے پرندے نظر آئے
جو مغربی دنیا کے لیے بالکل اجنبی چیزیں تھیں۔ ایک اور ہال میں پہلے سے بھی زیادہ
نفیس اشیاء دکھائی دیں۔ اقسام کے جانوروں کی تصویریں جنھیں کسی ماہر نقاش کا
قلم ہی اتار سکے یا شاعر کا تخیل ایجاد کر سکے یا سونے والے کا خیال خواب میں
ختراع کر سکے۔ واقعی یہ ایسی چیزیں تھیں جو مشرق اور جنوب کے ممالک ہی پیدا
کر سکتے ہیں۔ مغرب نے انھیں کبھی دیکھا ہے نہ سنا ہے۔ آخر میں بہت سے چکروں کے
بعد وہ سفیر تخت کے کمرے میں پہنچے جہاں خادموں اور ان کے زرنگار لباسوں سے ان
کے مالک کی شان و شوکت ظاہر ہوتی تھی۔ تین دفعہ وزیر اپنی تلوار میان سے نکالے
ہوئے خاکساری سے زمین پر سجدہ ریز ہوا۔ پھر فوری حرکت سے سونے اور جواہرات
کے مرصع وزنی پردے ہٹائے گئے۔ اور سونے کے تخت پر شاہی لباس میں خلیفہ
متمکن دکھائی دیا۔"[1]

مقریزی نے بسط و تفصیل سے جو تقریباً ۲۰ صفحات کو محیط ہے قصر خلافت
کے خزائن کی تفصیل دی ہے۔ وہ کہتا ہے:

ایک ایسا صندوق تھا جس میں سات مد یعنی دس پونڈ زمرد کے ٹکڑے تھے
ان کی قیمت تین لاکھ دینار تھی۔ سات دبہ یعنی دو سو پچاس پاؤنڈ کے نفیس موتی۔
یاقوت کی بہت سی انگوٹھیاں۔

مستنصر کے خزانوں میں حسب ذیل قیمتی چیزیں موجود تھیں۔ ہزاروں قسم کے بڑے
بلور کے گلدان جن میں بعض پر عزیز کا نام کندہ تھا۔ سونے کی رکابیاں جن پر رنگوں کی
گلکاری اور مینا کاری تھی۔ زہر مہرہ کے پیالے جن پر ہارون الرشید کا نام کندہ تھا۔
سونے، چاندی، آبنوس، ہاتھی دانت، اگر اور دوسری اقسام کی لکڑیوں کی دواتیں،
لیکن یہ دوات سے مراد قلمدان ہوا جن میں بعض تراشی ہوئی، بعض پچی کاری کی
ہوئی اور بعض جواہرات سے مرصع تھیں۔ چینی کے بڑے مرتبان جن میں کافور بھرا
۔ عنبر کے پیالے۔ مشک کی بوتلیں۔ تپائی پر رکھے ہوئے بڑے کنگال جو جانوروں

کی شکل کے بنے ہوئے تھے جن میں سے ہر ایک کی قیمت ایک ہزار دینار۔ سفید چینی کے انڈے۔ سونے کی چٹائی جس پر خلیفہ مامون کسی خوشی کے موقع پر سویا تھا۔ مینا کاری کی ہوئی رکابیاں جنھیں شہنشاہِ روم نے عزیز کو تحفہ بھیجا تھا۔ فولادی آئینے۔ کانچ اور مٹی کے بے شمار برتن۔ ریشمی کارچوبی شطرنج اور چوسر کی بساطیں۔ سونے چاندی۔ ہاتھی دانت اور آبنوس کے مہروں کے چار ہزار سونے کے گلدان، گل نرگس کے لیے اور دو ہزار گلدان بنفشہ کے لیے۔ مصنوعی میوے، اور دوسرے کھلونے عنبر اور کافور کے بنے ہوئے۔ ایک جواہرات سے مرصع عمامہ جس کی قیمت ایک لاکھ تیس ہزار دینار تھی اور جس کے جواہرات کا وزن سترہ پاؤنڈ تھا۔ مختلف قسم کے عطروں کے بہت سے کنٹر، ایک سونے کا مور جس کی آنکھیں یاقوت کی اور پروں پر مینا کاری تھی۔ ایک سونے کا مرغ جس کی کلغی اور آنکھیں یاقوت کی بنی ہوئی تھیں۔ ایک ہرن جو موتیوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ ایک میز جو عقیق کی بنی ہوئی تھی۔ ایک سونے کا کھجور کا درخت جس میں قیمتی جواہرات کی کھجوریں لگی ہوئی تھیں۔ شاہی کشتیوں میں جو نیل کے جلوسوں کے لیے تیار کی گئی تھیں، ایک کشتی ایسی تھی جو خلیفہ کے لیے وزیر جرجرائی کے حکم سے تیرہ ہزار دینار کے مصارف سے تیار کی گئی تھی۔ ایک دوسری چاندی کی کشتی جو مستنصر کی ماں کو ابوسعید تستری کی طرف سے تحفۃً بھیجی گئی تھی۔ ریشم۔ کارچوب۔ مخمل اور دیگر اقسام کے کپڑے جن میں ایک سرخ و مشرقی کپڑے پر زربفت کا کام کیا ہوا اور سبزہ زاروں کے نقشے کھینچے ہوئے جن میں ہاتھی گھوم رہے تھے۔ ریشمی کپڑے جن پر کارچوب سے مشرق کے حکمران خاندانوں کی تاریخیں اور ان کے کارنامے لکھے ہوئے تھے، اور جن پر ان کے مشہور لوگوں کی تصویریں تھیں۔ ایک قالین جو معز کے لیے شہر تستر میں تیار کیا گیا تھا اور جس پر دنیا کا ایک نقشہ کھینچا گیا تھا۔ جس میں پہاڑ، ندیاں، شہر اور خاص طور پر مکہ اور مدینہ بتائے گئے تھے۔ بے شمار قیمتی کپڑے، جواہرات سے مرصع خنجر، تلواریں، نیزے بھالے اور ہر قسم کے بہت سے ہتھیار جن میں معدی کرب، معز اور قائم کی تلواریں

حضرت حسینؓ کا زرہ بکتر۔ حمزہؓ کی ڈھال۔ مشہور ذوالفقار اور خود رسول خدا صلعم کی تلوار شامل تھی۔ ریشمی اور سنہری خیمے جن میں سے بعض پر آدمیوں، جانوروں اور پرندوں کی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ اور ان کی چوبوں پر سونے کا ملمع تھا۔ خاص کر ایک بڑا ڈیرہ جو بازوری کے لیے تیس ہزار کی لاگت پر بنا تھا۔ اس کی چوب (۶۵) کیوبٹ اونچی اور اس کا محیط (۵۰۰) کیوبٹ (ذراع) تھا۔ اس کے اور اس کے فرنیچر اٹھانے کے لیے سو آدمیوں کی ضرورت پڑتی تھی۔ یہ اتنا بڑا تھا کہ اس کو تیار کرنے کے لیے کاریگروں کو نو سال لگے۔ خلیفہ ظاہر کا ڈیرہ خالص سنہری تاروں کا بنا ہوا تھا۔ جو چھ چاندی کی چوبوں پر ایستادہ کیا جاتا تھا۔ ایک دوسرا بڑا ڈیرہ حلب میں بنایا گیا تھا۔ جس کی قیمت تیس ہزار دینار تھی۔[۲]

ماخذ

۱۔ تاریخ فاطمیین مصر، ص ۳۳۹

۲۔ مقریزی: ج ۲، ص ۲۵۳ تا ۲۸۰

وزارت

○

صدر اسلام میں وزیر کا لفظ کہیں نظر نہیں آتا[1]۔ یہ منصب عباسیوں نے اہل فارس سے لیا ہے۔ چنانچہ قضاعی نے اپنی کتاب "عیون المعارف فی اخبار الخلائف" میں لکھا ہے کہ اسلام میں سب سے پہلے جو شخص وزیر کے لقب سے یاد کیا گیا وہ ابو سلمہ حفص بن سلیمان الخلال، سفاح (۱۳۲ھ/۱۳۶ھ ۷۵۰ء/۷۵۴ء) کا وزیر تھا[2]۔ ورنہ اس سے پہلے لفظ کاتب ہی ان معنوں میں استعمال ہوتا تھا۔

مصادر تاریخیہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ فتح مصر کے وقت جوہر نے ابو الفضل بن فرات کو اپنے نامہ میں مخاطب کرتے ہوئے وزیر کے لفظ سے یاد کیا تھا۔

وزیر کا لفظ فاطمیوں کے اوائل دور حکومت میں غیر مقبول تھا۔ کیونکہ مہدی، قائم بامر اللہ، المنصور بنصر اللہ، تمام شئون دولت کے خود ہی بغیر کسی واسطے کے سربراہ تھے۔ چنانچہ ان کے دور میں جو شخص وزیر کی طرح معزز اور ممتاز تھا وہ یا قاضی القضاۃ تھا، یا حاجب، یا چتر بردار[3]۔

فاطمیوں میں عزیز باللہ پہلا خلیفہ ہے جس نے ابن کلس کو ۳۶۸ھ (۹۷۸ء) میں وزیر بنایا[4]۔

وزارت تفویض پر جو شخص فائز ہوتا تھا اسے غیر معمولی طور پر وسیع اختیارات حاصل تھے۔ وہ خلیفہ سے رجوع کیے بغیر اپنی ذمہ داری پر جو چاہے کر سکتا تھا، سیوطی نے لکھا ہے،

یہ وزیر خلیفہ کا نائب ہوتا ہے۔ جمیع امور مملکت اسے تفویض ہوتے ہیں۔ قاضیوں کا تقرر، گورنروں کا انتخاب، عساکر اور جیوش کی تیاری، وظائف کی تقسیم وغیرہ یہ سارے کام اسی کے ذمہ ہوتے ہیں۔"[۲]

اس سے نیچے کا درجہ وزارت تنفیذ کا تھا۔ وزیر تنفیذ کو آزادی عمل حاصل نہیں تھی۔ یعنی وہ بطور خود کوئی اقدام نہیں کر سکتا تھا۔

وزیر کا سب سے اہم کام میزانیہ کے داخل خارج میں توازن کا قائم رکھنا تھا۔

فاطمیوں نے غیر مسلموں کو بھی منصب وزارت پر فائز کیا مثلاً:

ابوالفرج یعقوب بن کلس

بہت بڑا ماہر مالیات تھا، اور نظمِ مملکت کا تجربہ رکھتا تھا۔ یہ یہودی تھا ــــ بعد میں اس نے اسلام قبول کر لیا تھا ــــ جب یہ مرض الموت میں مبتلا ہوا تو خلیفہ عزیز باللہ اس کے پاس عیادت کے لیے پہنچا اور گویا ہوا:

" کاش تو (تیری زندگی) خریدا جا سکتا تو میں دولت اور اولاد دے کر بھی تجھے خرید لیتا۔"

۳۸۰ھ ۹۹۰ء میں یعقوب کا انتقال ہوا۔ خلیفہ نے اس کے جنازے میں بنفس نفیس شرکت کی۔ نماز جنازہ پڑھی، اور اپنے ہاتھوں اسے لحد میں اتارا۔ اس کی تدفین اس قبہ میں ہوئی جسے خلیفہ نے اپنی وفات گاہ میں خاص اپنے لیے بنوایا تھا۔[۱]

عیسیٰ ابن نسطورس

ابوالفرج یعقوب بن کلس کی وفات کے بعد خلیفہ عزیز باللہ نے عیسیٰ

نسطورس مسیحی کو وزیر مالیات کے منصب پر فائز کیا۔[۹]

فہد بن ابراہیم نصرانی

حاکم بامر اللہ کے زمانہ میں یہ شخص منصب وزارت پر فائز ہوا۔ اس سے پہلے کاتب کا منصب رکھتا تھا اور رئیس کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ یہ شخص مسلمانوں کے لیے مصیبت اور عیسائیوں کے لیے رحمت ثابت ہوا۔

خلیفہ حافظ کے عیسائی وزیر کا جب انتقال ہوا تو خلیفہ کو بہت صدمہ ہوا۔ اس کے تابوت پر ریشم کی چادریں ڈالی گئیں۔ اردگرد عیسائی لوبان اور عود کی دھونی دیتے ہوئے چل رہے تھے۔ اعیانِ حکومت اور امرائے دولت نے جنازہ کی مشایعت کی۔ خود خلیفہ بھی بہ نفس نفیس ساتھ ساتھ چل رہا تھا، اور اس کے پیچھے راہبوں اور قسیسوں کی ایک جماعت انجیل کی تلاوت کرتی آ رہی تھی۔ جب لاش قبر میں رکھی گئی تو خلیفہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔[۱۰]

اور صورت احوال یہ تھی کہ فاطمی خلفاء نے اہل ذمہ (عیسائی اور یہودی) کو وزارت کے منصب عطا کیے۔ لیکن انھوں نے ناجائز فائدہ اٹھانے میں کوئی کمی نہیں کی۔ رعایا کی غیر معمولی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ لیکن یہ غیر مسلم وزیر اپنے ابنائے ملت کو مسلمانوں پر ترجیح دے کر اہم ترین سرکاری مناصب پر فائز کر دیتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں میں اور اہل ذمہ میں بدمزگی اور تلخی پیدا ہونے لگی۔ مسلمانوں نے خلیفہ کی بارگاہ میں پہنچ کر اس غلط بخشی پر احتجاج کیا مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

عصر فاطمی میں عیسائی اور یہودی وزیروں نے خوب دولت جمع کی۔ اور مصر کی بہتر زمین خرید کر کنیسوں اور دیروں پر وقف کر دی۔ ان درازدستیوں سے متاثر ہو کر کبھی کبھی بعض خلفاء نے اہل ذمہ پر سختیاں بھی کیں جو رائے عامہ کے دباؤ اور ذاتی مشاہدات کا نتیجہ تھیں۔[۱۱]

مصادر تاریخیہ سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ ایک عورت خلیفہ

عزیز باللہ[۷] یا حاکم بامر اللہ[۸]، کا راستہ روک کر کھڑی ہوگئی اور کہنے لگی۔
"یا مولائی، میں تجھے اس ذات کا واسطہ دیتی ہوں جس نے عیسٰے بن نسطورس کے ذریعہ عیسائیوں کو سربلند کیا، اور منشا بن ابراہیم القزاز کے ذریعہ یہودیوں کو رفعت بخشی، اور تیرے ذریعہ مسلمانوں کو ذلیل کیا میری فریاد کیا تو سنے گا؟"[۹]

اور یہ فریاد بجا بھی تھی۔ ابن نسطورس نے مسلمانوں کو معزول کر کر کے عیسائیوں کو اچھے اچھے عہدوں پر فائز کیا۔ چنانچہ ایک مرتبہ اس جرم میں معزول ہو کر دوبارہ جب یہ بحال کیا گیا تو پروانۂ تقرر میں وضاحت کر دی گئی کہ ملازمتو میں مسلمانوں کو ان کا حصہ دیتا رہے۔"[۱۰]

ابوسعد تستری یہودی نے یہودیوں کو اتنا نوازا اور مسلمانوں کو اتنا پامال کیا کہ ایک شاعر[۱۱] جل کر کہہ اٹھا:

"اس زمانے کے یہودیوں نے
اپنی تمنائیں حاصل کر لی ہیں؛
ان کے پاس عزت ہے، دولت ہے، وزارت ہے،
اے اہل مصر! میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں،
یہودی بن جاؤ۔"[۱۲]

اسی طرح شاعر حسن بن بشر دمشقی نے خلیفہ عزیز باللہ کے زمانے میں کہا:

لوگو عیسائی ہو جاؤ کیونکہ عیسائیت عین حق ہے۔
ہمارے زمانے میں تو یہ بات ثابت ہو چکی ہے۔
اب تین خداؤں کے قائل ہو جاؤ،
ان کے سوا سب کو معطل کر دو۔
اور وہ ہیں، باپ یعقوب وزیر، خلیفہ عزیز بیٹا،
اور روح القدس فضل۔"[۱۳]

اسی طرح ابو نجاح بن قنا نصرانی نے خلیفہ آمر کے زمانے میں مسلمانوں کی تباہی و بربادی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔

خلیفہ حافظ کے زمانے میں احزم بن زکریا انصاری کی چڑھ بنی تھی۔ اس نے سرکاری دفاتر کو عیسائیوں سے پاٹ دیا۔ اور وہ بڑے ٹھاٹھ کی زندگی بسر کرنے لگے۔ مسلمانوں کے لیے ذرائع معاش تنگ ہوگئے۔ احباس دینیہ اور اوقاف شرعیہ تک پر یہ قبضہ جمانے لگے۔ مسلمان غلاموں اور مسلمان باندیوں کو رکھتے تھے اس پر ابن الخلال کہہ اٹھا:

جب حالت یہ ہے کہ عیسائی مسلمان عورتوں سے تمتع کرتے ہیں،
خچروں اور گھوڑوں پر زین رکھ کر سوار ہوتے ہیں۔
دولت اسلام دن بدن ذلیل ہوتی جا رہی ہے
اور معاملات حکومت کافروں کے ہاتھ میں آ گئے ہیں
پس وقت آ گیا ہے کہ کانے دجال سے کہہ دو،
تیرے خروج کا وقت آ گیا ہے۔[۱۴۱]

اولیری کو بھی اس کا اعتراف ہے کہ:

"فاطمی خلفاء نے سرکاری مناصب پر اہل ذمہ کو اس کثرت سے فائز کیا جس کی مثال عہد ماقبل میں نہیں ملتی!"

غرض امر واقعہ یہ ہے کہ فاطمی خلفاء نے امور مملکت میں مسلم، نصرانی اور یہودی کے مابین کوئی امتیاز روا نہیں رکھا۔ مناصب دولت سب کے لیے عام تھے۔ خواہ وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم۔

اسی طرح غیر شیعی اور غیر فاطمی یعنی سنی حضرات بھی اس حکومت میں بڑے بڑے مناصب پر فائز ہوئے۔ وزارت کی کرسی تک یہ بھی پہنچے۔ ان کا سنی ہونا ان کے بلند ترین منصب پر فائز ہونے میں رکاوٹ نہیں بنا۔ مثلاً رضوان بن والخشی خلیفہ حافظ کا وزیر بنا۔ اسی طرح احمد بن افضل جمالی، اور ابن سلار کردی

شافعی کو خلیفہ ظافر ۵۴۳ھ (۱۱۴۸ء) کے عہد میں وزارت کا منصب بلند سونپا گیا۔

—— • ——

وزارت کے رسوم و ممیزات

ایام دولت فاطمیہ میں خلیفہ کے بعد وزیر ہی کا مرتبہ تھا۔ سیوطی کا قول ہے:
"خلافت کے بعد وزارت ہی کا منصب ہے۔"[۱۶]

خلفاء کی طرف سے وزراء کے اعزاز و احتشام میں کوئی کوتاہی روا نہیں رکھی جاتی تھی۔ اسے بڑے بڑے القاب و خطابات دیے جاتے تھے۔ مثلاً خلیفہ آمر نے اپنے وزیر "الافضل" کے لیے حکم جاری کیا تھا کہ منابر پر، اس کے بعد اس کا نام لیا جائے، اور اسے "عزالاسلام، فخرالانام، نظام الدین، خالصة امیرالمومنین" کے نام سے یاد کیا جائے۔[۱۷]

وزراء کے لیے لباس فاخرہ بھی خاص طور پر متعین کر دیا گیا تھا۔ اس کے لیے طلائی دوات مخصوص تھی۔[۱۸]

وزیر کی تنخواہ پانچ ہزار دینار ماہوار تھی۔ اس کی ہر اولاد کو دو سو سے لے کر تین سو درہم تک ماہوار ملتے تھے۔ اس کے علاوہ بھی عطایا، انعامات، تحائف اور سالانہ وظیفے ملتے رہتے تھے۔[۱۹]

ان سب کے علاوہ بھی وزیر کو غلّہ، گوشت، ترکاری، پھل، برف، جاگیر، ہدایا، خلعت، گھوڑوں اور سواریوں کے لیے چارہ، اور اس کے ذاتی مددگاروں کی تنخواہ، دو سو سے پانچ سو دینار تک سرکاری خزانہ سے ملتی تھی۔[۲۰]

بعض وزراء کا نام بھی خلیفہ کے نام کے ساتھ سکّہ پر ڈھالا جاتا تھا۔[۲۱]

خلیفہ وزیر کو خلعت بھی دیتا تھا۔ یہ سرخ رنگ کا ہوتا تھا جس کے ساتھ یاقوت اور جواہر سے مرصع تلوار بھی عطا ہوتی تھی۔ ایک طلائی ہار بھی جسے خلیفہ خود اپنے ہاتھ سے اس کے گلے میں پہناتا تھا۔

—— • ——

وزراء کو بارگاہ خلافت سے القاب بھی عطا ہوتے رہتے تھے۔
ابو محمد الحسن بن عمار الکتامی کو "امین الدولہ"
حسن بن صالح بن علی روزباری کو "عمید الدولہ"
بہرام نصرانی کو "تاج الدولہ"
ابن ابی کدینہ کو ولی الدولہ ــــ کے القاب سے نوازا گیا تھا۔
بعض وزراء کو "ملک" تک کے القاب مرحمت ہوئے۔ مثلاً رضوان بن والخش کو ۵۳۰ھ (۱۱۳۵ء) میں "الملک الافضل" کا لقب عطا ہوا۔ اس سے قبل اس لقب سے کوئی اور وزیر سرفراز نہیں ہوا تھا۔
بعض فاطمی وزراء کو "وزیرالوزراء" کے لقب سے بھی یاد کیا گیا۔ حاکم بامر اللہ نے اپنے وزیر علی بن جعفر بن فلاح کتامی کو "وزیرالوزراء"، "ذوالریاستین"، "الامیرالمظفر" اور "قطب الدولہ" کے لقب سے ملقب کیا تھا۔[۲۴]

ــــــ ۰ ــــــ

مصادر و حواشی

۱۔ ابن خلدون: المقدمہ، ص ۲۰۶
۲۔ بنوعباس سے پہلے وزیر کو کاتب یا مشیر کے لفظ سے یاد کیا جاتا تھا۔
(الفخری، طبع مصر، (۱۳۱۷ھ) ص ۱۳۵)
۳۔ ابن طاہر: اخبار الدول المنقطعہ، ورق ۴۳، بحوالہ نظم الحکم بمصر فی عصر الفاطمیین
ص ۹۸۔
۴۔ السیوطی: حسن المحاضرہ، ج ۲، ص ۱۲۱
۵۔ ابن خلدون: العبر فی دیوان المبتدا والخبر، ج ۴، ص ۵۵
۶۔ السیوطی: حسن المحاضرہ، ج ۲، ص ۱۱۶
۷۔ النجوم الزاہرہ، ج ۴، ص ۱۵۸، بحوالہ نظم الحکم بمصر فی عصر الفاطمیین، ص ۱۰۴
۸۔ نظم الحکم بمصر فی عصر الفاطمیین، ص ۱۰۵

۹۔ ابوالفداء: المختصر فی احوال البشر، ج ۲، ص ۱۳۱

۱۰۔ النویری: نہایۃ الارب، ج ۲، ورق ۹۴، بحوالہ نظم الحکم بمصر فی عصر الفاطمیین، ص ۱۰۶

۱۱۔ ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن بک نے اپنی کتاب "الفاطمیون فی مصر" (ص ۲۱۱) میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ ایک ہم عصر شاعر رضی بن البواب تھا۔

۱۲۔ ابن میسر: اخبار مصر، ج ۲، ص ۱۰۲ بحوالہ نظم الحکم بمصر فی عصر الفاطمیین، ص ۱۰۶

۱۳۔ ابن اثیر: الکامل فی التاریخ، ج ۹، ص ۴۳

۱۴۔ المقریزی: الخطط، ج ۲، ص ۲۵۰

۱۵۔ O. Leary, A Short History of The Fatimid Khalifate, P. 114.

۱۶۔ السیوطی: حسن المحاضرہ، ج ۲، ص ۸۴

۱۷۔ القلقشندی: صبح الاعشیٰ، ج ۳، ص ۵۰۴

۱۸۔ الاستاذ الایوبی: "الفاطمیون" ج ۱، ص ۱۱۶

۱۹۔ ابن منجب: الاشارہ الی من نال الوزارہ "(مطبوعہ قاہرہ ۱۹۲۴ء) ص ۲۳

۲۰۔ القلقشندی: صبح الاعشیٰ، ج ۳، ص ۵۲۵

۲۱۔ السیوطی: حسن المحاضرہ، ج ۲، ص ۱۱۶

۲۲۔ یحییٰ بن سعید الانطاکی: "التاریخ المجموع علی التحقیق والتصدیق" ص ۱۲۸ بحوالہ نظم الحکم بمصر فی عصر الفاطمیین، مطبوعہ مصر، ص ۱۱۹

۲۳۔ نظم الحکم بمصر فی عصر الفاطمیین، ص ۱۱۶

انتظامیہ

فاطمی حکومت کے محکمے، شعبے، سیکریٹریٹ

دواوین (دفاتر سیکریٹریٹ) کبھی قصر خلافت میں رہتے تھے۔ کبھی ایوان وزارت میں۔ لیکن بدرجمالی کے بعد مستقل طور پر آخر وقت تک قصر خلافت میں رہے۔[1]

بڑے لوگوں کی وفات پر سرکاری دفاتر میں تعطیل کا رواج بھی تھا[2]

خلیفہ عزیز باللہ کو یعقوب بن کلس کی وفات کا بڑا صدمہ ہوا۔ اس نے اس غم میں ۱۸ دن دفاتر بند رکھے۔ خلیفہ نے بہرام کی وفات پر ۳ دن کی تعطیل عام کا اعلان کیا۔

عہد فاطمی کے اہم ترین دفاتر کی ضروری تفصیل یہ ہے:

دیوان الانشاء والمکاتبات

فاطمی خلیفہ المعز لدین اللہ نے مصر آنے کے بعد اس محکمہ کی طرف زیادہ توجہ کی۔ اس محکمہ کے سربراہ کو "صاحب دیوان الانشاء" یا "کاتب الدست الشریف" کہتے تھے اس دفتر سے تمام اہم پروانے اور فرامین صادر ہوتے تھے۔ باہر کے مراسلات و مکاتیب اور سفارتی مراسلات سب سے پہلے سربمہر حالت میں یہیں آتے تھے۔ پھر "سارٹنگ" کے بعد خلیفہ کے سامنے پیش کیے جاتے تھے۔ پھر صاحب دیوان خلیفہ کے قلم سے جواب لکھتا تھا۔

فاطمیوں کے عہد میں اس منصب پر جو لوگ فائز ہوئے وہ فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے یگانۂ روزگار تھے۔ اس منصب پر مسلمان ہی فائز نہ ہوتے تھے، اور ذمی (عیسائی یا یہودی) بھی، دین کی کوئی تخصیص نہ تھی مثلاً خلیفہ عزیز باللہ کا اور بعد میں اس کے بیٹے حاکم بامر اللہ کا کاتب دیوان نصرانی تھا۔ خلیفہ حافظ لدین اللہ کا کاتب دیوان یہودی تھا[۴]"

خوش اندام، خوش رو، فصیح البیان، طلیق اللسان، حسب نسب کے اعتبار سے برتر، باوقار، بردبار، سنجیدہ اور متین لوگ اس منصب پر فائز کیے جاتے تھے[۵]"ضروری تھا کہ صاحب دیوان الانشا، طبقات رعایا میں سب سے اونچے درجہ کا ہو۔ راز کی حفاظت کر سکتا ہو۔ اور شدائد کے وقت جادۂ وفا سے منحرف نہ ہوتا ہو[۶]"

اکابر ارباب قلم میں سے ایک جماعت اس کے اعوان و مددگار کے طور پر بھی کام کرتی تھی۔

ابن بابشاذ ۴۶۹ھ (۱۰۷۶ء) کو خلیفہ مستنصر باللہ کے عہد میں اس کام پر مامور کیا گیا کہ جو تحریریں اس دفتر سے نکلیں ان پر نظر ثانی کر دیا کرے۔ اور کسی قسم کی ادبی، لغوی، صرفی، نحوی غلطی باقی نہ رہنے دے[۷]"۔

ابن مماتی[۸] نے اس منصب دار کے شرائط تحریر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"ضروری ہے کہ وہ آزاد ہو، مسلمان ہو، عاقل ہو، صادق ہو، ادیب، فقیہ، اور عالم ہو۔ احساس ذمہ داری سے بہرہ ور ہو۔ امین اور محرم اسرار ہو، ذہین و فطین ہو۔ قوت ارادی مضبوط رکھتا ہو۔ خوش بیان اور خوش فکر ہو۔ شیریں زبان اور بردبار ہو۔ باوقار اور کریم الاخلاق ہو۔ نہ کوئی ہدیہ قبول کرے، نہ کسی سے کوئی ہدیہ لے!"

دیوان انشاء میں بڑھیا قسم کا کاغذ استعمال ہوتا تھا۔ یہ کاغذ مصر میں بھی تیار ہوتا تھا، اور دوسرے شہروں سے بھی منگایا جاتا تھا۔

ڈاک کی دو قسمیں ہوتی تھیں :

البرید السریع Cursus Velox (میل)

البرید البطی Cursus Calhularis (مال)

جن کے ذریعہ مال کی نقل و حمل کا کام سرانجام دیا جاتا تھا[۱۲]

فضائی ڈاک

رسائل و فرامین ارسال کرنے کے سلسلہ میں فاطمی خلفا صرف گھوڑوں اور کشتیوں پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ کبوتر بھی استعمال کرتے تھے۔ ان کے لیے طیران گاہیں بنی ہوئی تھیں۔ ایک مستقل عملہ ان کبوتروں کی تربیت اور دیکھ بھال کے لیے متعین تھا۔ پہلے انھیں دور دراز فاصلوں پر واقع برجوں سے ایک خاص مقام کے لیے چھوڑا جاتا تھا۔ جب یہ سدھ جاتے تو ڈاک رسانی کا کام لیا جاتا تھا۔ شروع شروع میں ان کی اڑان محدود رقبے کے اندر ہوتی تھی رفتہ رفتہ مسافت میں اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ اور پھر یہ مسافات بعیدہ قطع کرنے کے عادی ہو جاتے تھے۔

کبوتروں کے لیے بھی وہی قاعدہ اور اصول تھا جو گھوڑوں کے لیے تھا۔ ان کی بھی منزلیں متعین تھیں۔ ایک طیران گاہ سے اڑ کر کبوتر دوسری طیران گاہ پر پہنچتے تھے۔ یہاں ان کے بازو، پر، یا دُم سے جو خط لگا ہوتا اسے لیکر دوسرے کبوتر کے لٹکا دیا جاتا تھا اور وہ آگے کی منزل کی طرف اڑ جاتا تھا۔[۱۴] بری ڈاک کے مقابلہ میں فضائی ڈاک کم وقت میں منزل مقصود تک پہنچ جاتی تھی

کبوتروں کے ذریعہ جو ڈاک بھیجی جاتی تھی اس کی ایک اہم خصوصیت یہ ہوتی تھی کہ حد درجہ مختصر ہوتی تھی۔ تاریخ، دن اور مطلب کی بات مختصر الفاظ میں بالکل اسی طرح جیسے آج کل تار بھیجتے وقت لکھتے ہیں، لکھ دی جاتی تھی۔[۱۵]

فضائی ڈاک میں جو کاغذ استعمال کیا جاتا تھا وہ نہایت باریک ہوتا تھا۔ اتنا ہلکا کہ کبوتر کو اڑنے یا منزل پر اترنے میں ذرا بھی دشواری نہیں محسوس

ہوتی تھی۔ یہ کاغذ "ورق برید الحمام" — کبوتری ڈاک کا کاغذ — کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ پرچہ کبوتر کے بازو یا دُم میں باندھ دیا جاتا تھا۔"[16]

عام طور پر اصول یہ تھا کہ کبوتروں کے ذریعہ جو ڈاک بھیجی جاتی تھی، وہ مکرر بھیجی جاتی تھی۔ دو دو گھنٹے کے وقفے سے تاکہ اگر کبوتر راستہ سے بھٹک جائے یا شکار ہو جائے، یا اس کا کوئی بازو زخمی ہو جائے، یا دشمن کے ہاتھوں گرفتار ہو جائے، تو دوسری مرتبہ ضرور منزلِ مقصود تک پہنچ جائے۔

ایک اصول یہ تھا کہ بارش کی حالت میں یا دانہ دینے سے پہلے کبوتروں کو نہیں اڑایا جاتا تھا۔"[17]

نامہ بر کبوتروں کے اترنے کے جو برج بنے ہوئے تھے، وہاں ہر وقت نگہدار موجود رہتے تھے۔ جو فضا میں تکتے رہتے تھے۔ جیسے ہی کوئی کبوتر نامہ لے کر اترا فوراً خلیفہ کی خدمت میں پیش کر دیا جاتا تھا۔ اس کے بازو یا دُم پر جو نامہ بندھا رہتا تھا اُسے خلیفہ کے سوا کوئی نہیں کھول سکتا تھا۔ خلیفہ اگر کھانا کھا رہا ہوتا تو ہاتھ روک لیتا۔ سو رہا ہوتا تو جگا دیا جاتا۔ تاکہ فوراً صورتِ حال سے باخبر ہو جائے۔"[18]

اس سلسلے میں بعض لطیفے بھی پیش آجاتے تھے۔

ایک مرتبہ وزیر ابن کلس کا نامہ بر کبوتر، خلیفہ عزیز باللہ کے کبوتر سے اڑان میں بازی لے گیا۔ یہ بات خلیفہ کو شاق گزری۔ وزیر کے دشمنوں کو موقع مل گیا، انھوں نے خلیفہ کو بھڑکایا کہ ابن کلس نے تمام بہتر چیزیں اپنے پاس رکھ لی ہیں اور معمولی چیزیں خلیفہ کے لیے چھوڑ دی ہیں حتیٰ کہ کبوتر تک۔ یہ بات وزیر تک بھی پہنچ گئی۔ اس نے خلیفہ کو دو شعر لکھ بھیجے:

امیر المومنین سے کہہ دو،
ساری بلندی اور بزرگی انہی کے لیے ہے؛
آپ ہی کا کبوتر آگے رہا،

— • —

پولیس

فاطمی خلفاء نے اجرائے حد (شرعی سزا) کے سلسلہ میں ایک اصول نافذ کیا تھا کہ پولیس کے دفتر میں کبھی کبھی اپنی طرف سے دو مبصر بھیج دیتے کہ اطمینان کر لیں کہ ملزم پر کوئی زیادتی نہیں ہوئی۔ حاکم بامر اللہ نے حکم نافذ کیا تھا کہ جب تک یہ دونوں مبصر توثیق نہ کر دیں سزا نافذ نہ کی جائے۔ اس طرح خلیفہ کو اطمینان ہو جاتا تھا کہ ملزم پر پولیس کی طرف سے کوئی زیادتی نہیں ہوئی نہ وہ عدل سے محروم رہا۔"[۲۰]

: ملزم اگر جرم کا اعتراف کرے تو اس کے لیے یہ شرط تھی کہ وہ اعتراف کسی دھمکی یا جبر و جور کے ماتحت نہ ہو۔ نہ ترغیب اور لالچ کا نتیجہ ہو۔ اگر ایسی صورت ہو تو حد ساقط کر دی جاتی تھی۔

: کوئی شخص جرم کا اعتراف کر کے مکر جائے تو بھی سزا نہیں دی جاتی تھی۔

: کوئی شخص کسی عورت پر تہمت لگاتا۔ پھر اس سے شادی کر لیتا تو اسے سزا دی جاتی!"[۲۱]

مصادر و حواشی

۱۔ ابن خلکان: وفیات الاعیان، ج ۲، ص ۲۹۶

۲۔ النویری: نہایۃ الارب، ج ۲۶۔ ورق ۴۹، ۹۱۔ بحوالہ منظم الحکم بمصر فی عصر الفاطمیین ص ۱۲۵

۳۔ القلقشندی: صبح الاعشیٰ ج ۱، ص ۴۰۳، ۴۹۰

۴۔ ایضاً ایضاً ج ۱، ص ۹۶

۵۔ ایضاً ایضاً ج ۱، ص ۴۰۴، ۴۰۵

۶۔ ابن خلدون: المقدمہ، ص ۲۱۵، ۲۱۶

۷۔ الدکتور احمد بک امین: ظہر الاسلام، ص ۲۰۵

۸۔ ابن مماتی: کتاب قوانین الدواوین، ص ۵۰۶، بحوالہ نظم الحکم بمصر فی عصر الفاطمیین ص ۱۳۰
۹۔ القلقشندی: صبح الاعشیٰ، ج ۱، ص ۱۱۵
۱۰۔ تاریخ البرید فی مصر، ص ۲۰
۱۱۔ القلقشندی: صبح الاعشیٰ، ج ۱، ص ۱۱۴
۱۲۔ المواصلات فی مصر فی عصور الوسطی، ص ۵۳
۱۳۔ تاریخ البرید فی مصر، ص ۳۰
۱۴۔ القلقشندی: صبح الاعشیٰ، ج ۱۴، ص ۳۹۱
۱۵۔ تاریخ البرید فی مصر، ص ۴۴
۱۶۔ المقریزی: الخطط، نیز السیوطی: حسن المحاضرہ، ص ۶۶
۱۷۔ Lane Poole, Egypt in the Middle Ages, P. 246
۱۸۔ السیوطی: حسن المحاضرہ، ص ۱۶۶
۱۹۔ تاریخ البرید فی مصر، ص ۴۴
۲۰۔ ابن سعید: کتاب المغرب فی حلی المغرب، ص ۱۳۲، بحوالہ نظم الحکم بمصر فی عصر الفاطمیین ص ۱۴۰

مالیات

الخراج

دولت فاطمیہ کے موارد مالیہ حسب ذیل تھے:

حکومت کے ذرائع آمدنی متعدد تھے۔ ان میں اہم ترین خراج تھا۔ یہ وہ ٹیکس تھا جو زمین پر بطور لگان کے وصول کیا جاتا تھا۔ یہ ٹیکس سارے کا سارا نقد وصول نہیں کیا جاتا تھا۔ یہ حاصلات ارض پر بھی مشتمل ہوتا تھا اور نقد پر بھی۔ حالات کے مطابق اس میں کمی بیشی ہوتی رہتی تھی۔[1]

لگان اراضی کی تحصیل کے لیے خلفائے فاطمی کے زمانے میں ایک اور اصول رائج تھا جسے "نظام التزام" یا "تقبیل ارض" کہتے تھے۔ اس صورت میں کسی شخص کو چند دیہاتوں یا مخصوص رقبہ کا خراج وصول کرنے کا ٹھیکہ دے دیا جاتا تھا۔ ایسے شخص کو "ضامن" یا "ملتزم" کہتے تھے۔ اس کے نام باقاعدہ پٹہ لکھا جاتا تھا۔ اور وہ رقم جو اسے دینا ہوتی تھی اس کی تجدید ہر چار سال کے بعد ہوتی تھی۔ آفات ارضی و سماوی کی صورت میں رعایت بھی برتی جاتی تھی۔

مامون بطائحی نے یہ مدت ۴ سال سے بڑھا کر ۲۳ سال کر دی تھی۔ لیکن بعد میں جب یہ ملتزمین زر اندوزی کے لیے کسانوں پر ظلم و جور کرنے لگے

تو یہ سسٹم قریب قریب ختم کر دیا گیا۔ کیونکہ خلفاء فاطمیین کسانوں کے مفاد، اور رعایت و سہولت کا بہت زیادہ خیال رکھتے تھے۔ ملتزمین کسانوں سے رقم وصول کرنے کے سلسلہ میں وسائل تعذیب بروئے کار نہیں لا سکتے تھے۔ نہ مارپیٹ کر سکتے تھے۔[۱]

دیوان الخراج

اگرچہ دفتر خراج عبداللہ بن عبدالملک بن مروان والی مصر کے زمانہ میں قبطی زبان سے عربی میں منتقل ہو گیا تھا لیکن اس کے باوجود دفتر خراج اور دوسرے دواوین حکومت میں سال اور تاریخ قبطی ہی رائج تھے۔ اور پورے طور سے یہ دفاتر عربی میں منتقل ہی نہیں ہو سکے تھے۔ ۵۰۱ھ (۱۱۰۷ء) تک یہی کیفیت رہی، یہاں تک کہ الافضل بن امیر الجیوش بدر الجمالی کے حکم سے قبطی سن اور تاریخ کو قطعی طور پر سن ہجری سے بدل دیا گیا۔ یہ اقدام تمامتر موثرات دینیہ پر مبنی تھا۔ نہ کہ موثرات عقل و مصلحت پر۔ کیونکہ قمری سال حسابات زرعی میں دشواری پیدا کر تا ہے اس لیے کہ اس میں فصول اربعہ پوری نہیں آتیں۔[۲]

الجوالی وجزیہ

یہ وہ ٹیکس تھا جو اہل ذمہ یعنی یہود و نصاریٰ سے وصول کیا جاتا تھا۔[۳] جو سالانہ لیا جاتا تھا۔ لیکن صرف اس شخص سے جو جزیہ ادا کرنے کی مالی اعتبار سے سکت رکھتا ہو۔ جزیہ صرف ان لوگوں سے وصول کیا جاتا تھا جو برسر کار اور بارو زگار ہوں۔[۵] نادار اور پریشان حالوں سے نہیں لیا جاتا تھا۔ نہ عورتوں، بچوں، پاگلوں، غلاموں اور راہبوں پر عائد تھا۔ جزیہ کی شرط یہ تھی کہ جس سے لیا جائے وہ عاقل ہو، بالغ ہو، آزاد ہو۔[۶] جزیہ قبول اسلام کے بعد بالکل ساقط ہو جاتا تھا۔[۷] یہ رقم ان سے حفاظت جان و مال کے لیے لی جاتی تھی کیونکہ ان سے فوجی خدمت نہیں لی جاتی تھی۔ اور جو فوجی خدمت انجام دیتے تھے ان پر سے جزیہ ساقط ہو جاتا تھا۔

دیوان الجوالی[۸]

یہ دفتر صرف جزیہ کے اجرا، نفاذ اور سقوط سے متعلق کام کرتا تھا۔

الزکوٰۃ

حکومت کے ذرائع آمدنی میں سے ایک اور ذریعہ زکوٰۃ تھا۔ آں حضرت کا ارشاد ہے کہ:

"زکوٰۃ کو اللہ تعالےٰ نے اس لیے فرض کیا ہے کہ دولت مندوں سے روپیہ لے کر غریبوں میں تقسیم کر دیا جائے۔"

زکوٰۃ وصول کرنے اور اسے اس کے مصارف میں خرچ کرنے کا حق صرف امام معصوم کو تھا جو اولاد نبی علیہ السلام میں سے ہو۔ اس کے مصارف وہی تھے جو کتب فقہ اسلامیہ میں مندرج ہیں[۱۸]

زکوٰۃ کے سلسلہ میں بھی ایک بہت بڑا دفتر قائم کیا گیا تھا۔ کیونکہ شیعہ کے نزدیک نماز کا نمبر، زکوٰۃ کے بعد ہے۔ جو زکوٰۃ نہیں دیتا اس کی نماز نہیں ہوتی۔[۱۹]

المستغلات

حکومت کے بہت اچھے اور بڑے ذرائع آمدنی میں وہ معاون تھے جن کے حاصلات سے کافی آمدنی ہوتی تھی۔ ان میں سب سے اہم کان "شب" کی تھی جس کی سالانہ پیداوار بارہ ہزار قنطار (وزن) سے زیادہ تھی۔

اسی طرح دارالصناعۃ (کارخانہ جہاز سازی) میں کچھ جہازات صرف فروخت کے لیے تیار کیے جاتے تھے۔ اور اچھے داموں پر بیچ دیے جاتے تھے۔ قصر خلافت کے مطبخ کی فاضل لکڑیاں بھی فروخت کر دی جاتی تھیں اور یہ ساری آمدنی سرکاری خزانے میں داخل کر دی جاتی تھی۔

خلیفۂ فاطمی کی ملکیت میں بہت سی دکانیں اور دوسری عمارتیں تھیں۔ ان کے کرایہ سے جو رقم خطیر وصول ہوتی تھی وہ بھی داخل بیت المال ہوتی تھی۔ سمندر سے جو چیزیں برآمد ہوتی تھیں، مثلاً عنبر وغیرہ جو روں سے جو لاوارث مال چھینا جاتا

تھا وہ بھی خزانہ میں داخل کر دیا جاتا تھا۔"[۱۱]

مصادر و حواشی

۱۔ الامیر عمر طوسون: مالیۃ مصر، ۲۲۲

۲۔ المقریزی: الخطط (طبع بولاق ۱۲۷۰ھ) ج ۱، ص ۸۲

۳۔ الاستاذ الایوبی: "الفاطمیون" ج ۲، ص ۱۴۸، ۱۴۹

۴۔ مقریزی کا بیان ہے کہ چوتھی صدی ہجری میں قاہرہ میں سات لاکھ اور اسکندریہ میں تین لاکھ یہودی اقامت گزین تھے۔

اسی طرح فتح اسلامی کے وقت مصر میں قبطیوں کی تعداد سات لاکھ سے متجاوز تھی، اور ان پر جو جزیہ عائد کیا گیا وہ دس لاکھ دینار سالانہ تھا۔

(محمد کامل مرسی پاشا: الملکیۃ العقاریہ، ص ۸۵ مطبعۃ السعادۃ، ۱۹۰۹ء)

۵۔ الماوردی: الاحکام السلطانیہ، ص ۱۳۹

۶۔ القرطبی: الجامع الاحکام القرآن" ج ۲، ص ۱۰۹

۷۔ جالیہ اس رقم کو کہتے ہیں جو شکست خوردہ ملک پر عائد کی جاتی ہے۔ پھر یہ لفظ اہل ذمہ کے لیے بھی استعمال ہونے لگا۔ جالیہ کی جمع جوال ہے۔

۸۔ جن انواع پر زکات واجب ہے وہ پانچ ہیں:

۱۔ زکات النقد (سونا چاندی)

۲۔ زکات السوائم (اونٹ اور مویشی)

۳۔ زکات مال تجارت

۴۔ زکات معدن و رکاز

۵۔ زکات زرع و ثمار

شیخ محمد حسین آل کاشف الغطاء اپنی کتاب "اصل الشیعہ و اصولہا" (ص ۹۹) میں لکھتے ہیں کہ:
"شیعوں میں زکات کے مسائل بالکل وہی ہیں جو مذاہب معروفہ حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی

کے ہیں۔

ماخذ

۹۔ العلامہ الشیخ محمد الحسین کاشف الغطاء: کتاب اصل الشیعہ و اصولہا" ص ۹۹
۱۰۔ پھٹکر دی
۱۱۔ سفر نامہ ناصر خسرو، ص ۱۲۷
۱۲۔ آل کاشف الغطاء: اصل الشیعہ و اصولہا" ص ۱۴۲

فاطمی ٹکسال اور فاطمی سکّے

فاطمیوں نے اپنے دورِ حکومت میں متعدد مقامات پر ٹکسال (دارالضرب) قائم کر رکھے تھے، جہاں سِکّے ڈھالے جاتے تھے۔ فتح مصر کے بعد جوہر نے جو دینار معزّی ڈھلوایا اس پر تین سطریں منقوش تھیں۔

پہلی سطر:

"دعی الامام المعز لتوحید الاحد الصمد"

اس کے نیچے کی سطر:

"ضرب هذا الدینار بمصر سنة ثمان وخمسین وثلاثمأته"

آخری سطر:

"لا اله الا الله محمد رسول الله، ارسله بالهدی ودین الحق لیظهره علی الدین کله ولوکره المشرکون"

یہ دارالضرب (ٹکسال)، صرف ایک ہی شہر میں نہیں تھے متعدد شہروں میں قائم کیے گئے تھے۔ اسکندریہ، قوص، صور، عسقلان وغیرہ[۲]۔

اس دفتر کا سربراہِ اعلیٰ قاضی القضاۃ ہوتا تھا جس کے ساتھ پورا ایک عملہ ہوتا تھا[۳]۔

خلفائے فاطمیین کے سکوں سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں ملکی اور سیاسی امامت سے اتنی دلچسپی نہیں تھی جتنی دینی امامت سے تھی۔ خاص طور پر اس بارے میں خلیفہ المعز لدین اللہ زیادہ سرگرم تھا۔ اس کی انگشتری پر یہ عبارت کندہ تھی:

لتوحید الاله الصمد، دعا الامام معد

لتوحید الاله العظیم دعا الامام التمیم

اسی طرح دینار کے سکہ کے ایک طرف یہ عبارت تھی:

"لا اله الا اللہ، محمد رسول اللہ، ارسله بالهدیٰ و دین الحق لیظهره علی الدین کله و لوکره المشرکون!"

اور دوسری طرف یہ عبارت کندہ تھی:

الامام معد التوحید الاله الصمد المعز لدین اللہ امیر المومنین ضرب بمصر فی سنة ۳۵۸ھ۔[۴]

مقدسی نے اقلیم مغرب کے بیان میں جس میں افریقہ اور صقلیہ دونوں داخل ہیں، لکھا ہے کہ ساری اقلیم کا سکہ یکساں تھا۔ بنو فاطمہ کی حکومت کی توسیع کے بعد تو مغرب سے دمشق تک یکساں رائج ہو گیا تھا۔[۵]

خلفائے فاطمی اپنے سکے جو ڈھلواتے تھے ان پر کچھ نہ کچھ نقش بھی ہوتا تھا۔ ابوعبداللہ الشیعی کے سکہ پر یہ عبارت نقش تھی:

"الحمد للہ رب العالمین"

اس کا نام سیدہ تھا۔[۶]

المعز کے والد المنصور نے اپنے درہم کے ایک طرف،

اللہ الواحد الغفور

اور دوسری طرف

الامام ابو المنصور[۷]

نقش کرایا تھا۔

دولتِ فاطمیہ کے رئیسِ اعلیٰ کو خلیفہ کے لقب سے بھی ملقب کرتے تھے کیونکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قائم مقام اور جانشین تھا۔[۸]

مصادر وحواشی

۱۔ الاب انستاس: النقود العربیہ وعلم النمیات، ص ۵۰

۲۔ المقریزی: اغاثۃ الامہ، ص ۱۵

۳۔ المقریزی: الخطط (طبع بولاق، ۱۲۷۰ھ) ج ۱، ص ۴۵۴

۴۔ النویری: نہایۃ الارب فی فنون الادب، قلمی نسخہ کا فوٹوگراف ورق ۴۱، بحوالہ نظم الحکم بمصر فی عصر الفاطمیین، ص ۲۰

۵۔ احسن التقاسیم، (مقدسی)، ص ۲۴۰

۶۔ القلقشندی: صبح الاعشیٰ، ج ۳، ص ۴۷۴

۷۔ ابن عذاری المراکشی: البیان المغرب فی اخبار المغرب، ص ۲۸۴

۸۔ نظم الحکم بمصر فی عصر الفاطمیین، ص ۴۶

فاطمیوں کے اصلاحات

فاطمیوں نے بہت سے اصلاحات رائج کیے، ہم صرف چند کا ذکر کریں گے:

بہت ہی اہم اور نتائج کے اعتبار سے دوررس ایک اصلاح یہ کی گئی کہ ایسی عدالت بہ عہد معز قائم کی گئی جس میں ملک کے والیوں اور عہدہ داروں کے خلاف شکایتوں کی سماعت ہوتی تھی۔ ایسی شکایتوں کا ازالہ معمولی عدالتیں نہیں کر سکتی تھیں۔ اس عدالت کا نام "عدالت ازالۂ شکایات" رکھا گیا۔ اس میں خود جوہر، وزیر، قاضی اور چند فقہاء حاضر ہوتے تھے۔ اس کا فیصلہ خلیفہ کے پاس بھیجا جاتا اور اس کی منظوری کے بعد صادر کیا جاتا تھا۔[۱]

دوسری اہم اصلاح یہ تھی کہ:

جانب داری کو روکنے کے لیے ہر ملکی عہدے پر ایک مصری کے ساتھ ایک مغربی بھی شریک کیا گیا۔[۲]

ایک اور اہم ترین اصلاح یک زوجگی کا فرمان تھا۔ خلیفہ معز نے سرداران کتامہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

تم خود اپنی بیویوں کے مسئلے پر غور کرو، اور ایک ہی پر اکتفا کرو۔ ایک

سے زیادہ بیوی کی خواہش نہ کرو ورنہ تمہاری زندگی تلخ ہو جائے گی۔ تمہارے جسم ضعیف ہو جائیں گے۔ تمہاری قوت گھٹ جائے گی۔ ہم تمہارے اجسام اور دماغ دونوں کے محتاج ہیں۔ یقین کرو کہ اگر تم میری نصیحت پر عمل کرو گے تو مجھے امید ہے کہ ہم اسی طرح مشرق بھی فتح کر لیں گے جس طرح ہم نے مغرب فتح کر لیا ہے۔"(۳)

مصادر و حواشی

۱- D. Leary. A Short History of The Fatimid Khatifate, P. 103.

۲- اتعاظ الحنفاء، ص ۷۸

۳- مقریزی: الخطط، ج ۲، ص ۱۶۶

فاطمیوں کی رواداری

مسلمان فرماں رواؤں کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ انھوں نے باہمی طور پر خواہ کتنے ہی ایک دوسرے کے حقوق پامال کیے ہوں لیکن غیر مسلموں پر دست تعدّی کبھی دراز نہیں کیا۔ بلکہ ان کے ساتھ زیادہ سے زیادہ رواداری کا برتاؤ کیا۔ حجاج بن یوسف جیسا شخص بھی جو مسلمانوں کے لیے قضائے مبرم تھا، غیر مسلموں کے لیے ابرِ رحمت تھا۔

فاطمی خلفاء نے رواداری کو خاص طور پر اپنا شعار رکھا۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ انھوں نے اس باب خاص میں بہت زیادہ غلو سے کام لیا، تو مبالغہ نہ ہوگا۔ اس رواداری کے باعث ان پر کفر کے فتوے تک لگے۔ سلطان ابن سعود مرحوم نے فتاوائے ابن تیمیہ کا جو مجموعہ شائع کیا ہے اسے دیکھ کر ہمارے اس دعوے کی تصدیق کر لی جا سکتی ہے۔ فاطمی خلفاء اپنوں کے بڑے بنے، متہم ہوئے، تکفیر کا ان پر الزام لگایا گیا۔ لیکن غیر مسلموں کے ساتھ ان کے روادارانہ اور مشفقانہ برتاؤ میں کوئی فرق نہیں آیا۔ جس طرح ہندوستان میں عالمگیر تعصب میں بدنام ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس نے ہندوؤں کو نوازا اسی طرح فاطمی خلفاء میں الحاکم تعصب میں بدنام ہے، لیکن امر واقعہ یہ ہے

کہ اس نے غیر مسلموں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ حسن سلوک کا برتاؤ کیا جس کا غیروں کو بھی اعتراف ہے۔ موسیو لیبان لکھتے ہیں:

"جو امور عام معاشرت سے متعلق تھے مثلاً معاملات جائداد و وراثت وغیرہ وغیرہ ان کو عربوں (فاطمیوں) نے اس عمدگی سے رسم و رواج ملک کے مطابق ٹھہرا دیا تھا کہ نارمن بھی بالالتزام انھیں قواعد کی پابندی کرتے رہے۔

عربوں کی حکومت میں عیسائیوں کو مذہب و رسم و رواج اور قانون کی پوری آزادی ملی۔ ایک راہب جو پلرمو کے کلیسا کا قسیس ہے لکھتا ہے کہ پادریوں کو پوری آزادی تھی کہ وہ اپنا مذہبی لباس پہن کر بیماروں کو تسلی دینے کے لیے جایا کریں۔ ایک دوسرا قسیس موردکول بیان کرتا ہے کہ مسینا میں عام رسومات مذہبی کے وقت دو جھنڈے کھڑے ہوتے تھے۔ ایک جھنڈا مسلمانوں کا اور دوسرا عیسائیوں کا۔ فتح کے وقت جتنے کلیسے موجود تھے قائم رکھے گئے تھے البتہ اندلس کی طرح نئے کلیسے بنانے کی یہاں اجازت نہ تھی۔"[۱]

مسٹر اسکاٹ لکھتے ہیں:

"عرب جاہلیت کے قصائد اور نظمیں نہ صرف پلرمو (بلرم) میں بلکہ بہما شہر روم میں اسی قدیم شان اور لب و لہجہ میں پڑھی جاتی تھیں اور مسلمان اور غیر مسلمان دونوں تحسین و آفرین کرتے اور داد دیتے تھے۔"[۲]

مسلمانوں نے اپنی زبان کی اشاعت میں قومی عصبیت نہیں برتی۔ انھوں نے نہایت فراخ دلی سے صقلیہ کی قدیم زبانوں کو بھی زندہ رکھا۔ چنانچہ صقلیہ کے پورے اسلامی دور میں وہاں کی قدیم زبانوں میں سے لاطینی اور یونانی رائج رہیں اور ہر شخص آزاد تھا کہ وہ جس زبان کو چاہے استعمال کرے۔ چنانچہ یہ دونوں زبانیں بھی تحریری زبان کی حیثیت سے اسلامی عہد حکومت میں استعمال ہوتی رہیں۔"[۳]

فاطمی حکومت فرقہ داریت سے بھی بہت بلند تھی۔ "تاریخ صقلیہ" کے فاضل مصنف کا بیان ہے:

"اگرچہ صقلیہ میں تقریباً سو برس تک شیعی حکومت قائم رہی، لیکن فرقہ وارانہ حیثیت سے اس کا کوئی اثر مترتب نہیں ہوا۔ نہ حکومت نے کبھی شیعیت کو فروغ دینے کی کوشش کی۔ نہ رعایا نے اس کی جانب مذہبی حیثیت سے تنفر یا میلان کا اظہار کیا۔ وہ جس طرح اہل سنّت تھے اپنے عقائد پر قائم رہے۔"[۴]

صقلیہ میں فاطمیوں کی حکومت عیسائی حکومت سے زیادہ منصف اور روادار تھی۔ اسی طرح مسٹر اسکاٹ لکھتے ہیں:

"دربار قسطنطنیہ کے محاصل بہ نسبت مسلمانوں کے جزیہ کے بہت سخت تھے۔ مسلمانوں کا ایک محصل ایک مقررہ وقت پر آکر جزیہ وصول کر لے جاتا تھا اور دربار قسطنطنیہ کا تقاضا ئے بد قائم رہتا تھا۔

تاریخ صقلیہ کا بیان ہے:

"جب فاطمیوں کا دور آیا، تو حکومت کا مذہب شیعی قرار پایا۔ کلبیہ کے عہد میں عہدۂ قضاء پر سنّی المذہب علماء مقرر ہوئے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حکومت کے شیعی المذہب ہونے کے باوجود یہاں سنی مذہب کے قوانین نافذ تھے۔

اسلامی حکومت نے صقلیہ کے عیسائی باشندوں کے لیے جداگانہ عدالتیں قائم کی تھیں۔ اور ان کے خاص نوع کے مقدمات انہی عدالتوں میں پیش ہوتے اور انہی کے قوانین کے رو سے فیصل ہوتے تھے۔ موسیو لیبان لکھتے ہیں:

"ان امور میں جو عام فوائد ملکی سے متعلق نہ تھے عیسائی خود اپنے قانون کے پابند اور اپنے احکام کے ماتحت تھے۔ پرانے یونانی حکام فوجداری جنھیں اسٹراٹیج کہتے تھے اب تک قائم تھے اور نہ فقط ان کے فرائض اور حقوق مثل سابق کے برقرار تھے، بلکہ ان کا نام تک نہیں بدلا گیا تھا۔"[۵]

دولت کلبیہ (فاطمیہ) کے قضاۃ کے جو نام دستیاب ہوئے ان میں سے اکثر مالکی المذہب ہیں۔ کیونکہ کلبیوں نے حکومت سے مذہب کو علیحدہ کر دیا تھا اور رعایا کی کثیر آبادی کے لحاظ سے عہدۂ قضاء پر سنّی فقہاء ہی سرفراز کیے جاتے تھے۔[۶]

مسٹر اسکاٹ لکھتے ہیں:

"صقلیہ کے عیسائی باوجود تعصب مذہبی و قومی مخالفت کے اور باوجود اس کے کہ وہ اپنے دشمنوں کے ہاتھوں شدید ترین نقصانات اٹھاتے تھے، مسلمانوں کی عادلانہ حکومت کو اچھی نظر سے دیکھنے لگے تھے خصوصاً قسطنطنیہ کی طماع و جابر حکومت کے مقابلہ میں۔ جب رعایائے بازنطین "اپنی حالت کا مسلمانوں کی عیسائی رعایا کے حالات سے موازنہ کرتے تو اپنے کو ناخوش گوار حالات میں پاتے۔ اور مسلمانوں کی عیسائی رعایاؤں پر رشک کرتے۔ مسلمانوں نے جو محاصل لگائے تھے وہ قانون کے رو سے مقرر تھے جن میں کمی بیشی نہیں ہو سکتی تھی، وہ مداخلت کے خوف و خطرہ کے بغیر اپنے مذہبی مراسم ادا کر سکتے تھے۔ اور اپنی تمدنی حالت پر قائم رہ سکتے تھے۔"(۱۰)

مشہور مؤرخ فلپ کے حتی کا بیان ہے:

"اموی خلفاء باستثناء عمرؓ ثانی اقتصادی وجوہ کی بناپر غیر مسلموں کے قبولِ اسلام کو پسند نہیں کرتے تھے، خصوصاً ان لوگوں کے قبولِ اسلام کو جو قابلِ زراعت زمینوں کے مالک تھے۔ عراق کے علوی اور حجاز کے راسخ العقیدہ لوگ معاویہؓ کے سخت مخالف تھے۔ اپنے تختِ حکومت کی حفاظت کے لیے مسیحی رعایا پر بھروسہ کیے بغیر چارہ نہ تھا۔ اسی لیے انھوں نے ایک یعقوبی مسیحی خاتون میسون سے عقد کیا۔ وہی یزید کی والدہ تھی۔ معاویہؓ کا درباری شاعر الاخطل اور طبیب خاص دونوں مسیحی تھے۔ مالیات کے انتظام کے لیے اس نے منصور ابن سرجون کی خدمات سے فائدہ اٹھایا جو دمشق کے سینٹ جان (یوحنا) کا دادا تھا۔ عباسیوں کی پالیسی (بہ خلاف فاطمیوں کے) نہ اتنی روشن خیالی کا مظہر تھی، نہ اتنی رواداری تھی۔ ہم سمجھ سکتے ہیں کہ عباسیوں ہی کے زمانے میں مسیحی لوگ زیادہ تر لبنان میں پہنچے خصوصاً ہارون الرشید (۷۸۶ء ۔ ۸۰۹ء) اور اس کے پوتے المتوکل (۸۴۷ء ۔ ۸۶۱ء) کے عہد میں جس نے امتیازی قوانین

نہ صرف از سر نو جاری کر دیے تھے بلکہ ان کے دائرے میں بہت توسیع کر دی۔ دسویں صدی کے اختتام تک شام مصر اور عراق اسلامی سرزمینوں کے خط و خال پیدا کر چکے تھے۔ مصر میں فاطمی خلیفہ الحاکم (۹۹۶ء - ۱۰۲۱ء) کے قوانین کی بدولت عمل اسلامیت تکمیل پر پہنچ گیا"[۱۲]

فاطمیوں کا دستور رواداری آغاز کار ہی سے نافذ تھا!

مہدی نے مذہبی آزادی کا اعلان کر دیا اور احکام جاری کیے کہ کسی کو اسماعیلیت پر مجبور نہ کیا جائے۔ ہر شخص کو اپنے مذہب پر قائم رہنے کی آزادی حاصل ہے"[۱۳]

مصادر و حواشی

۱۔ تمدن عرب (موسیولیبان)، ص ۲۸۲

۲۔ اخبار الاندلس (اسکاٹ)، ج ۲، ص ۳ء

۳۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، ج ۲۰، ص ۳۲، بحوالہ تاریخ صقلیہ ص ۴۱

۴۔ تاریخ صقلیہ (دار المصنفین)، ص ۹۸

۵۔ اخبار الاندلس، ج ۲، ص ۵۷، ۴

۶۔ تاریخ صقلیہ، ص ۸۰

۷۔ تمدن عرب (لیبان)، ص ۲۸۱

۸۔ گویا حکومت کو فاطمیوں نے "سیکولر" بنا دیا تھا۔

۹۔ تاریخ صقلیہ، ص ۹۳

۱۰۔ تمدن عرب (لیبان)، ص ۲۸۲

۱۱۔ O. Leary, A Short History of the Fatimid Khalifate, P. 72

۱۲۔ تاریخ لبنان (حتی)، ص ۲۵۷

نظامِ جنگ

تمہید

فاطمیوں نے اپنے سہ صد سالہ دورِ حکومت میں کئی ایسے کارنامے انجام دیے جو ان کا نام ہمیشہ زندہ رکھیں گے۔ انہی کارناموں میں ایک وقیع اور عظیم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے جو نظامِ جنگ قائم کیا تھا حد درجہ مضبوط و مستحکم تھا۔

فاطمیوں کی بری فوج بھی کافی منظم اور مستحکم تھی جس کا تفصیلی تذکرہ حصہ کشورکشائی میں آچکا ہے۔ یہاں اجمال پر اکتفا کیا ہے لیکن فاطمیوں نے اپنے بحری بیڑے کو جس طرح منظم کیا، وہ ان کا لازوال کارنامہ ہے۔ اور امر واقعہ یہ ہے کہ اس کارنامے کو انجام دیے بغیر وہ زندہ بھی نہیں رہ سکتے تھے۔ ایک عظیم اور طاقتور بحری بیڑے کے بغیر نہ وہ اندلس کی مخالف حکومت سے عہدہ برآ ہو سکتے تھے، نہ رومیوں کی بحری تاخت و تاراج سے محفوظ رہ سکتے تھے۔ نہ فتوحات کا سلسلہ جاری رکھ سکتے تھے۔ نہ صقلیہ اور دوسرے علاقوں پر اپنا پرچم لہرا سکتے تھے۔ نہ داخلی تحفظ سے بہرہ ور ہو سکتے تھے۔

آئندہ صفحات میں ہم فاطمیوں کے نظامِ جنگ اور بحری بیڑے سے متعلق معلومات پیش کریں گے۔

فاطمیوں کا فوجی دروبست

○

وزارتِ جنگ، برّی اور بحری فوجوں کے نظام پر ایک نظر

فاطمیوں نے اپنے عہد حکومت میں جو فوجی نظام استوار کیا تھا وہ ایک ترقی یافتہ اور اولوالعزم حکومت کا شاہکار قرار دیا جاسکتا ہے۔ ذیل میں اس کی ضروری تفصیلات پیش کی جاتی ہیں۔

دیوان الجیش"

فاطمی عہد حکومت میں اس محکمے کی دو قسمیں تھیں۔

۱۔ دیوان الجیش

۲۔ دیوان الرواتب

یہ پوری وزارت "دیوان الجیش والرواتب" کے نام سے موسوم تھی۔ یہاں سپاہیوں اور فوجیوں کے احوال، ان کے مرض، صحت، زندگی، موت، موجودگی، غیرحاضری، اور کارگزاری سے متعلق مکمل خاکہ ہر وقت تیار رہتا تھا۔ اور متولی دیوان جیش[۲] کی خدمت میں ضروری کاغذات برابر پیش کیے جاتے رہتے تھے۔ یہ حکومت کا بہت بڑا اور معزز عہدیدار مقرر کیا جاتا تھا۔

فاطمیوں کے ایام حکومت میں جیش ان لوگوں پر مشتمل تھا جن کی جنس اور زبان مختلف تھی۔[۳] خلیفہ المعز لدین اللہ کے زمانے میں جیش مصری، عرب، بربر، صقالبہ (سسلی کے باشندے)، روم اور اغلبیہ پر مشتمل تھا۔

المعز نے جو فوج تیار کی تھی وہ بہت بڑی تھی۔ چنانچہ کہا جاتا ہے:

"اسکندر اعظم کے بعد مصر کی سرزمین پر معز سے بڑی کسی کی فوج کبھی مجتمع نہیں ہوئی!"[۴]

صرف قصر خلافت کے نگہبان فوجیوں کی تعداد دس ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ جو افریقہ، ایشیا، اور یورپ کے لوگوں پر مشتمل تھی۔[۵]

فوج کے مختلف عناصر کے اختلاط کا ایک اثر یہ بھی مترتب ہوا کہ باہمی حسد اور نفسانیت کے جذبات پیدا ہوئے، جس سے فتنے برپا ہوئے، شورشیں ہوئیں، خلفا کا بھی یہ دستور ہو گیا کبھی ایک فریق کو معتوب قرار دے لیتے، کبھی دوسرے کو سر چڑھا لیتے۔[۶]

فوج کی ترتیب و تنظیم اور طریق قتال و پیکار میں فاطمیوں نے خصوصی دسترس حاصل کر لی تھی۔ انھوں نے صف بندی اور ضبط و نظم کی طرف بہت زیادہ توجہ کی۔ کسی شخص کو اجازت نہ تھی کہ صف سے آگے بڑھ سکے یا پیچھے ہٹ سکے۔ تاکید تھی صف بندی اس طرح کرو جیسی نماز میں ہوتی ہے۔ اور جیسا کہ اللہ تعالے نے فرمایا ہے:

ان اللہ یحب الذین یقاتلون فی سبیلہ صفاً کانھم بنیان مرصوص

(یعنی اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو اس کی راہ میں صف بستہ ہو کر مقاتلہ کرتے ہیں)

جیش کی پانچ قسمیں تھیں:

۱۔ مقدمہ:

یہ سب سے آگے رہتا تھا۔ اس میں غالب تعداد سواروں کی ہوتی تھی۔

۲۔ قلب:

یہ جیش کا درمیانی حصہ ہوتا تھا۔ سالار اعلیٰ یہیں ہوتا تھا کہ بچشم خود تمام

جنگی کارروائیوں کا نظارہ کر سکے، اور حسب ضرورت ہدایات دے سکے اور احکام نافذ کر سکے۔

۳۔ میمنہ:
یہ جیش کا دایاں حصہ ہوتا تھا۔

۴۔ میسرہ:
یہ جیش کا بایاں حصہ ہوتا تھا
میمنہ اور میسرہ کی حیثیت جیش کے داہنے اور بائیں بازو کی ہوتی تھی۔

۵۔ ساقۃ الجیش:
یہ فوج کا پچھلا حصہ ہوتا تھا۔

ان پانچوں حصوں کا الگ الگ امیر ہوتا تھا۔ جو سالار اعلیٰ کے ہدایات کے مطابق کام کرتا تھا۔

جیش میں سوار اور پیادے دونوں ہوتے تھے۔ جیش میں ہر دس آدمیوں پر ایک سردار ہوتا تھا جو "عریف" کہلاتا تھا۔ اور ہر دس عریف پر ایک سردار ہوتا تھا جو نقیب کہلاتا تھا۔ اور ہر دس نقبا پر ایک سردار ہوتا تھا جو قائد کہلاتا تھا، اور ہر دس قواد پر ایک سردار ہوتا تھا جو امیر کہلاتا تھا۔

جنگ میں سب سے زیادہ استعمال تلوار کا ہوتا تھا۔ دوسرے ہتھیار، اور اسلحہ مثل تیر، پیکان، نیزہ، خنجر، طبر، منجنیق وغیرہ بھی استعمال ہوتے تھے۔ منجنیق سے دشمن پر پتھر اور آتش افروز مادہ پھینکا جاتا تھا۔ دبابے بھی استعمال ہوتے تھے۔ گاڑیوں پر رکھ کر توپ کی قسم کے اسلحہ بھی استعمال ہوتے تھے جس سے فصیلوں کے منہدم کرنے کا کام لیا جاتا تھا۔ اسی طرح اور بھی بہت سے آلات و اسلحہ تھے جو استعمال ہوتے تھے۔"

خلفاء فاطمیئین اپنی فوج میں گھوڑے بہت زیادہ استعمال کرتے تھے کیونکہ مذہبی اعتبار سے ان کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

واعدوا لھم ما استطعتم من قوۃ ومن رباط الخیل ترھبون به عدو اللہ وعدوکم۔

(یعنی: کافروں کے لیے جس قدر ہو سکے ہتھیار سے اور پلے ہوئے گھوڑوں سے سامان درست رکھو اور اس کے ذریعہ تم اپنا رعب جمائے رکھو۔ جو اللہ کے دشمن ہیں اور تمھارے دشمن ہیں)۔

چنانچہ فاطمی گھوڑوں کا نسب نامہ بھی اسی طرح محفوظ رکھتے تھے جیسے لوگ اپنا شجرۂ نسب محفوظ رکھتے ہیں۔ اسی طرح خچر، اونٹ اور دوسرے جانور پورے اہتمام سے رکھے جاتے تھے۔ ان کے لیے باقاعدہ اصطبل تھے ان کی دیکھ بھال کے لیے ایک پورا عملہ تھا۔[۹]

ذخائر کے نقل وحمل کے لیے اچھی اور مضبوط گاڑیاں بھی تھیں۔ نیز ایسے ظرف وآلات بھی تھے جو آتش ریز تھے۔ بعض ہاتھ سے پھینکے جاتے تھے۔ بعض کسی واسطے سے اور جب کسی چیز سے ٹکراتے تھے فوراً آگ قبول کر لیتے تھے۔[۱۰]

جس طرح ذخائر کے نقل وحمل کے لیے اچھی اور مضبوط گاڑیاں تھیں اسی طرح اسلحہ اور سپاہ کے نقل وحمل کے لیے بھی انھیں کام میں لایا جاتا تھا۔ قتال کے لیے جب کوئی فوج نکلتی تھی تو اس کے ساتھ ایک پرچم بھی ہوتا تھا جیسا کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد گرامی میں ہوا کرتا تھا۔[۱۱] ابوعبداللہ شیعی کے پرچم پر یہ آیۂ کریمہ مرقوم تھی:

سیھزم الجمع ویولون الدبر

(یعنی عنقریب (ان کی) یہ جماعت (دشمن) شکست کھائے گی اور یہ پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے)۔

جیش کی ہر قسم کے لیے ایک الگ پرچم ہوتا تھا۔ بعض کا سبز بعض کا سفید۔ اماں کا جھنڈا سفید ہوتا تھا۔ جوہر جب مصر میں داخل ہوا تو اس کا ایک ایسی سفید جھنڈا لے کر سارے شہر میں گشت کرتا رہا۔ یہ اس بات کی

علامت تھی کہ اہل شہر کو اماں حاصل ہے۔

پرچم ہمیشہ امیر جیش کے ہاتھ میں رہتا تھا البتہ اگر وہ چاہتا تو کسی اور کو بھی حوالے کر سکتا تھا۔ علمبردار ہونا بہت بڑے شرف کی بات تھی۔

جیش کے ساتھ کاتب، ترجمان، قاضی اور مزدور بھی ہوتے تھے تاکہ وہ راستہ ہموار کرتے رہیں۔ اور آلاتِ حرب کی تنصیب میں مدد دیں۔ اطباء بھی ہوتے تھے تاکہ جو لوگ بیمار پڑ جائیں ان کا بر وقت علاج ہو سکے۔ جراح بھی ہوتے تھے تاکہ زخمیوں کی مرہم پٹی کر سکیں۔[12]

حرب و قتال اور جنگ و جدال، اور رزم و پیکار کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام و ہدایات پر عمل کرنے کی پوری کوشش کی جاتی تھی۔ نہ کسی کا مثلہ کیا جاتا تھا،[13] نہ کسی عورت کو قتل کیا جاتا تھا۔ نہ بچے کی جان لی جاتی تھی۔ نہ بوڑھے کو ہلاک کیا جاتا تھا۔

پرچہ نویسوں اور جاسوسوں کے خدمات بھی حاصل کیے جاتے تھے، تاکہ دشمن کے ارادوں اور منصوبوں کا پتہ چل سکے۔

فوج کے لیے لباس تیار کرایا جاتا تھا جو چست بھی ہوتا تھا اور قصیر بھی تاکہ حرکات قتال میں اسے کوئی دشواری نہ ہو۔ فوجیوں کے لیے جو خیمے نصب کیے جاتے تھے یا عمارتیں بنائی جاتی تھیں وہ مختلف قوموں کے لیے الگ الگ مخصوص ہوتی تھیں تاکہ آسانی کے ساتھ ان کی شناخت ہو سکے۔[14]

مصر کے جیش فاطمی کے ممیزات میں سے یہ بات بھی تھی کہ وہ رفتار کے لحاظ سے نہایت سریع، اور تکالیف بلکہ موت تک کا مقابلہ کرنے میں حد درجہ جری تھا۔ شاید اس عزیمت اور استقامت کا ایک بڑا سبب قضاء و قدر پر ایمان تھا۔ فاطمی فدائیوں اور جاں بازوں کو شروع ہی سے اس کی تربیت دی جاتی تھی کہ اپنے امام کے نفاذِ احکام میں جان کی پروا نہ کریں کیونکہ اس کی طاعت ہی انھیں نعیم دائم سے بہرہ ور کر سکتی ہے۔ اور چونکہ جسم سلیم ہی عقل سلیم کا حامل

ہوسکتا ہے لہٰذا بہت سے کھیلوں میں بھی انھیں مشغول رکھا جاتا تھا۔ مثلاً گیند، چوگان، دوڑ وغیرہ۔ اسی طرح جسم کے مختلف حصوں کی تقویت کے لیے بہت سی ورزشیں بھی ان پر لازمی تھیں۔ بازو کی مضبوطی کے لیے الگ، پاؤں کی تقویت کے لیے جدا، پیٹھ، سر اور گردن کے لیے دوسری۔

پا پیادہ چلنے، دوڑنے بھاگنے، اچکنے پھاندنے کے بھی وہ عادی بنائے جاتے تھے۔ اور کئی میٹر کی دوڑ لگوائی جاتی تھی۔ بلندی سے کودنا، کھائی کا پھاندنا، نیزہ پھینکنا، کشتی لڑنا، تیرنا، گھوڑے کی سواری کرنا، اور اسی طرح کے دوسرے مردانہ کھیلوں اور ورزشوں میں حصہ لینا ان کا شعار تھا۔[15] ڈوبتے کو پانی سے نکالنا۔ آگ کو بجھانا، لپکتے ہوئے شعلوں میں گھر کر نکل آنا، یہ فن بھی ان کے لیے نیا نہ تھا اس کی باقاعدہ تعلیم و تربیت دی جاتی تھی۔

فاطمی خلیفہ کے سامنے افواج و عساکر کی باقاعدہ پریڈ بھی ہوتی تھی اور وہ باب الفتوح سے نقلی جنگوں کا نظارہ بھی کرتا تھا۔ ایسے مواقع پر سالار لشکر کو خلعت مزرکش طلائی بھی عطا کی جاتی تھی۔ مثلاً ایک مرتبہ خلیفہ آمر باحکام اللہ ایک ایسے ہی موقع پر باب الفتوح سے فوج کی نقل و حرکت اور ہجوم و دفاع کا نظارہ کر رہا تھا جب فوج اس کے سامنے سے طبل اور پرچم کے ساتھ ایک بحر بیکراں کے مانند گزری تو اس نے اس کے سالار حسام الملک کو طلب کیا اور اسے ایک حُلّۂ جلیلہ عطا کیا۔

جیش کی سالاری صرف ایسے شخص کو سونپی جاتی تھی جو شجاعت و بسالت اور جرأت و ہمت کے اعتبار سے اپنے اقران و امثال میں یکتا ہو، سرد و گرم چشیدہ ہو، امور جنگ پر حسن تدبیر کے ساتھ رائے دیتا ہو۔ ذکی، فہیم، اور عقیل ہو۔ سالار کی طاعت اس طرح واجب تھی جیسے خلیفہ کی اس لیے کہ وہ اس کا نائب ہوتا تھا۔

دیوان الجہاد

اسے "دیوان العمائر" بھی کہتے تھے۔[16] تجارتی، جنگی اور سفری جہازوں کی تیاری نظم و ترتیب، اور سفر و اجرا کا کام اس کے ذمہ تھا۔ ملاحوں اور بحری افسروں کی تربیت اور کارگزاری کی ذمہ داری بھی عائد ہوتی تھی۔ اس محکمہ کا ایک خاص بجٹ ہوتا تھا۔ اور وہ اگر کم پڑ جاتا تھا تو بیت المال سے رقم حاصل کر لی جاتی تھی۔[17]

المعز لدین اللہ اور بعد کے خلفائے فاطمیین مصر نے بری افواج کے ساتھ ساتھ ایک مضبوط بحری بیڑے کی تکمیل اور تیاری پر خاص توجہ مبذول رکھی۔ جو بحر روم (بحر ابیض متوسط) میں ہمہ وقت مستعد بیکار رہتا تھا۔ کیونکہ یہاں سے بہ آسانی شام پر بازنطینی حملہ کی مدافعت کی جا سکتی تھی۔

ابن ابی طے نے لکھا ہے کہ المعز لدین اللہ نے جہاز سازی کا ایک کارخانہ مقس میں قائم کیا تھا۔[18] جو ساحل نیل پر ایک قریہ ہے۔ اس کارخانہ میں چھ سو جہازوں کی تعمیر اور مرمت کا بندوبست تھا۔ لیکن مسبحی کا خیال ہے کہ یہ کارخانہ عزیز نے قائم کیا تھا۔ وہ کہتا ہے:

"عزیز باللہ فاطمی خلیفہ پہلا شخص ہے جس نے مقس میں جہازی کا اتنا بڑا کارخانہ قائم کیا تھا!"

تجارتی اور جنگی جہازوں کی تعمیر اور تیاری میں جو لکڑی تیار ہوتی تھی وہ لبنان کے جنگلات اور دوسرے مقامات سے حاصل کی جاتی تھی۔[19] بحری بیڑے کے جہازوں کے لیے جنوبی یورپ سے بھی لکڑی کے درآمد کرنے کا بندوبست تھا کیونکہ وہ زیادہ مضبوط ہوتی تھی، لیکن عام کشتیوں اور تجارتی بیڑے کے لیے مقامی لکڑی کا استعمال ہوتا تھا۔

بحری بیڑے کے ساتھ ساتھ تجارتی بیڑا بھی تھا۔ جو مصر کے بنے ہوئے کپڑے اور دیگر مصنوعات مشرق و مغرب میں لے جاتا تھا۔

فاطمی حکومت جہازی لکڑی کا ذخیرہ رکھتی تھی۔ جو بوقت ضرورت استعمال

ہوتا تھا۔

بحری لشکر کی ترتیب بھی اکثر ایسی ہی ہوتی تھی جیسی برّی لشکر کی چنانچہ امیر البحر اپنی جنگی کشتیوں سے "قلب"، "مقدمہ"، "جناح" اور "ساقہ" مرتب کرتا تھا۔ وہ اپنے جہازوں کو نصف دائرے کی شکل میں رکھتا تھا۔ اور جب دشمن اس سے قریب پہنچ جاتا تھا تو اسے گھیرے میں لے لیتا تھا۔ اسی طرح اور بھی جنگی "ہنر" بروئے کار لائے جاتے تھے۔

بحریہ میں تخاطب کا ذریعہ رایات اور اشارات تھے۔ بحریہ کا سب سے بڑا افسر امیر البحر یا "امیر الماء" کہلاتا تھا۔ یہ ہواؤں کے چلنے، دریاؤں کے رخ، اور راستے، طوفانوں کی آمد، اور دوسری ضروری چیزوں پر ماہرانہ دسترس رکھتا تھا۔[20] فن کے کارخانے میں خود خلیفہ بھی کبھی کبھی بہ نفس نفیس آیا کرتا تھا۔ اور دعائے خیر و برکت دیا کرتا تھا۔

بحریہ کی طرف سے مشقی جنگوں کا بندوبست ہوا کرتا تھا۔ ایسے موقع پر بھی خلیفہ آتا تھا۔ اور یہ منظر دیکھتا رہتا تھا۔ اس کے سامنے جنگی کشتیاں ایک دوسرے پر حملہ آور ہوتی تھیں۔ منجنیق اور دوسرے آلات و اسلحہ استعمال کرتی تھیں۔ تعاقب کرتی تھیں۔ آخر میں کامیاب لوگوں کی حوصلہ افزائی کے لیے انعام عطا فرماتا تھا۔[21]

خلیفہ آمر باحکام اللہ نے اپنا بحری بیڑہ ایک مرتبہ صلیبیوں (عیسائیوں) پر حملہ کرنے کے لیے بھیجا۔ مصری بحریہ نے ۵۰۱ھ (۱۱۰۷ء) میں صیدا کے مقام پر عیسائیوں کی بحری قوت پر مہلک حملہ کیا۔

دیوان الاقطاع

دیوان جیش سے ملحقہ دواوین میں ایک دیوان الاقطاع بھی تھا۔[22] یہ فوجیوں کو حسب ضرورت زمین اور جائداد عطا کیا کرتا تھا۔ دوسرے لوگ بھی اس سے بہرہ ور ہو سکتے تھے۔ عام طور پر یہ جاگیریں حق ملکیت کے بغیر حین حیات ہوتی تھیں۔ یہ زمینیں ان لوگوں سے حاصل کی جاتی تھیں جن کے پاس فاضل ہوتی تھیں۔ یا کسی

سبب سے ضبط کر لی جاتی تھیں۔ اس طرح اسماعیلیوں نے ابطالِ ملکیت زمین کی بنا اشتراکیوں کے مانند ڈال دی تھی، جسے وہ ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیتے تھے۔[۲۳] ان اراضی سے انتفاع کا حق دیا جاتا تھا ملکیت کا نہیں۔ وفات کے بعد یہ پھر خلیفہ کی ہو جاتی تھیں۔ یہ جاگیریں اور زمینیں نہ منتقل ہو سکتی تھیں نہ ان میں وراثت چلتی تھی۔

فاطمی خلفا کی طرف سے جن لوگوں کو یہ جاگیریں اور زمینیں عطا ہوتی تھیں وہ انھیں زرخیز اور شاداب کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے تھے۔ بنجر زمینیں قابل کاشت بن جاتی تھیں۔ ان کے سینہ میں جو معادن چھپے ہوتے تھے۔ وہ برآمد کر لیے جاتے تھے۔ ان سے بعض زرعی صنعتوں کی داغ بیل ڈالی جاتی تھی۔[۲۴]

مصادر و حواشی

۱۔ ہمارے زمانے میں وزارت دفاع کا مترادف

۲۔ یعنی وزیر دفاع

۳۔ دولت امویہ کے آخر عہد حکومت تک جیش اسلامی خالص طور پر عرب تھا۔ عباسیوں کے عہد میں غیر عربی عناصر — ایرانی — بھی بکثرت داخل ہوئے

فاطمیوں کے عہد میں فوج کا بڑا اور معقول حصہ مغاربہ یعنی اہل کتامہ اور دوسرے بربری اہل قبائل برقیئین اور صنہاجیئین پر مشتمل تھا۔ ان میں سے ہر گروہ کا الگ سردار تھا۔ کتامی سورماؤں کی تعداد بیس ہزار سے زیادہ تھی۔

(القاضی النعمان: المجالس والمسایرات، ج ۱، ص ۳۔ بحوالہ نظم الحکم بمصر فی عصر الفاطمیین ص ۱۴۳)

۴۔ النویری نے بتایا ہے کہ المعز جب مصر آیا تو اس کے ساتھ ایک لاکھ جنگجو صرف قبیلہ کتامہ کے تھے۔ اور چالیس ہزار بربر تھے۔ اور ساٹھ ہزار زنگی تھے۔

(نہایۃ الارب ج ۲۶، ورق ۴۴، بحوالہ نظم الحکم بمصر فی عصر الفاطمیین ص ۱۴۴)

O,Leary, A Short History of the Fatimid Khalifate, P. 198, 200 ۵۔

۶۔ علی مبارک پاشا: الخطط التوفیقیہ، ج ۱، ص ۹

۷۔ فاطمی فوج کی ترتیب یہ تھی:

-: جیدہ۔ سب سے چھوٹا دستہ

-: سریہ۔ اس سے بڑا۔ اس میں ۲۰۰ سے لے کر ۴۰۰ تک نفر ہوتے تھے۔

-: کتیبہ۔ یہ ۴۰۰ سے لے کر ۱۰۰۰ سپاہیوں پر مشتمل ہوتا تھا۔

-: جیش۔ ایک ہزار سے لے کر چار ہزار نفوس پر یہ مشتمل ہوتا تھا۔

(الشیخ امین الخولی بک: الجندیۃ فی الاسلام، ص ۲۳)

۸۔ جرجی زیدان: التمدن الاسلامی، ج ۱، ص ۱۴۳

۹۔ ابن الاثیر: الکامل فی التاریخ، ج ۲، ص ۱۹

۱۰۔ الدکتور علی ابراہیم حسن: دراسات فی عہد الممالیک، ص ۸۴۴

۱۱۔ ابن سعد: الطبقات، ج ۲، ص ۱۹

Ameer Ali: A Short History of Saracenes, P. 432 ۱۲

۱۳۔ یعنی لاش کے ناک، کان، آنکھ کاٹ کر اس کی صورت کو بگاڑ دینا۔

۱۴۔ المقریزی: الخطط، ج ۲، ص ۱۸۲

۱۵۔ ایضاً ، ایضاً، ج ۳، ص ۳۲۰

۱۶۔ یعنی وزارت بحریہ

۱۷۔ القلقشندی: صبح الاعشیٰ، ج ۳، ص ۴۹۶

۱۸۔ المقریزی: الخطط، ج ۲، ص ۵۳ (طبع بولاق ۱۲۷۰ھ)

۱۹۔ الشیخ امین الخولی: الجندیۃ فی الاسلام، ص ۱۰۲

۲۰۔ الاستاذ حامد: سفن الاسطول المصری، ص ۷

۲۱۔ المقریزی: الخطط، ج ۲، ص ۳۶۹

۲۲۔ یعنی ٹکڑہ، جاگیر

۲۳۔ الاستاذ خلیل سکاکینی: تاریخ الحرکات الفکریہ فی الاسلام، ج ۱، ص ۲۸

۲۴۔ النجوم الزاہرہ، ج ۵، ص ۱۳۳ بحوالہ نظم الحکم بمصر فی عصر الفاطمیین، ص ۱۵۹

فاطمیوں کا بحری بیڑہ

فاطمیوں کا بحری بیڑہ بہت بڑا اور بہت زیادہ مضبوط و مستحکم تھا۔ مقریزی کا بیان ہے کہ اس بیڑے کے جنگی جہازوں کی تعداد سولہ ہزار تھی۔[1] عیسائی مؤرخ جرجی زیدان نے بھی یہی تعداد لکھی ہے۔[2]

جنگی جہازوں کا بہت بڑا کارخانہ بلرم (پلرمو) میں تھا۔ جہاں بنو کتامہ کے موالی بڑی تعداد میں کام کرتے تھے۔[3] دوسرا دارالصناعہ مسینا میں تھا۔[4] تیسرا بارؔی میں جہاں سسلی (صقلیہ) کی اسلامی حکومت کے لیے جہاز اور اسلحہ تیار کیے جاتے تھے۔[5]

صقلیہ کے اسلامی عہد میں جزیرہ کے سیاسی حالات جس قدر پُرآشوب رہے اسی قدر یہاں کے جنگی بیڑے مستحکم نظر آتے ہیں۔ صقلیہ کی اسلامی حکومت اپنے فاطمی دور میں بازنطینی حکومت قسطنطنیہ اور اٹلی کی مختلف حکومتوں سے معرکہ آرائی رہی۔ اس لیے صقلیہ کے جنگی بیڑے اس قدر مستحکم تھے کہ انھیں بحر روم پر فرماں روائی حاصل تھی۔ اور اسی بحری طاقت کی وجہ سے بحر روم کے بکثرت جزیروں اور جنوبی اٹلی پر اسلامی اقتدار رہا۔[6]

فاطمیوں کی بحری قوت و شوکت پر علامہ سید سلیمان ندوی نے بھی روشنی

ڈالی ہے:

"بحر روم میں پہلے تو رومیوں (یونانیوں) اور عربوں کے درمیان مقابلہ ہوتا رہا۔ مگر جیسے جیسے عربوں کے بحری فتوحات آگے بڑھتے گئے، رومی پیچھے ہٹتے گئے۔ ۲۹۷ھ میں شمالی افریقہ میں عبیدی فاطمیوں کی پُر زور حکومت قائم ہوئی جو سسلی، مصر، اور شام سب پر رفتہ رفتہ چھا گئی۔ اس حکومت کے قیام کے لیے جس کے اکثر حصے بحری مواصلات کے ذریعہ وابستہ تھے، بحری ترقی ضروری تھی۔ چنانچہ اس نے تونس کے قدیم کارخانہ جہاز سازی کو بے حد ترقی دی۔ تونس کے کارخانۂ بحری میں جنگی جہاز ہمیشہ آراستہ و پیراستہ تیار رہتے تھے۔

۳۰۲ھ میں بحر روم کے ساحل پر ایک پہاڑ کو کھود کر اس میں اتنی بڑی گودی بنائی گئی جس میں دو سو جنگی جہاز محفوظ کھڑے رہ سکیں۔ ان جنگی جہازوں کا نام شینی تھا۔ شینی اس جنگی جہاز کو کہتے تھے جو اتنا بڑا ہوتا تھا کہ ایک ایک جہاز ایک سو تینتالیس ڈانڈوں سے چلایا جاتا تھا۔

مسلمان اپنے عہد ترقی میں بحر روم پر ہر طرف سے پوری طرح قابض تھے اور ان کے مقابلہ میں عیسائیوں کے بیڑوں کا شمار نہ تھا۔ چنانچہ مسلمانوں نے ہر جگہ بحری فتوحات حاصل کیے اور سمندر کے اکثر جزیروں کے بادشاہ ہو گئے، جیسے میورقہ، منورقہ، سروانیہ، صقلیہ، قوصرہ، مالٹا، کریٹ، سائپرس، اور دوسرے رومی و فرنگی ممالک۔

ابوالقاسم شیعی اور اس کے فرزند مہدیہ سے اپنے بیڑوں کو لے کر نکلتے تھے اور جنوا کے ساحلی شہر پر حملہ کرتے تھے اور کامیاب واپس آتے تھے۔

مسلمان اس زمانے میں بحر روم پر قابض تھے۔ ان کے جہاز آتے جاتے رہتے تھے۔ اور اسلامی لشکر اس سمندر کو جہازوں میں بیٹھ کر سسلی سے براعظم کے شمالی حصہ میں جاتے تھے۔ اور شاہانِ فرنگ کے ملکوں پر حملے کرتے تھے۔ جیسا کہ بنی حسین شاہانِ سسلی کے زمانہ میں تمام عیسائی قومیں اپنے بیڑوں کو

سمندر کے شمالی و مشرقی جانب میں فرنگستان اور سلافستان کے سواحل پر سے گئیں۔ اسلامی بیڑے ان پر اس طرح ٹوٹ کر گرتے تھے جیسے شیر اپنے شکار پر گرتا ہے۔ پورا سمندر مسلمانوں کے جہازوں سے بھرا تھا۔ اور صلح و جنگ کے راستوں میں ان کی آمدورفت لگی رہتی تھی۔ اور عیسائیوں کا ایک تختہ بھی اس سمندر میں نہ تھا عبیدیین کو جب زوال اور کمزوری لاحق ہوئی تو عیسائی چیرہ دست ہوئے۔ مصر و شام کے سواحل پر قابض ہو گئے، اور اسلامی بیڑے موقوف ہو گئے۔"

الغرض بحرِ روم کے دونوں ساحلوں میں عربوں کی آمدورفت تھی۔ وہ افریقی ساحل میں ایک طرف اندلس اور طنجہ تک پہنچ کر مغربی اور جنوبی افریقہ تک چلے جاتے تھے اور دوسری طرف ایشیائے کوچک، قسطنطنیہ اور جزائر کو طے کر کے سسلی اٹلی، اور فرانس تک پہنچتے تھے۔ اور کیا آج کوئی اس کو مانے گا کہ جس طرح اسپین کے بحری صدر دروازہ جبرالٹر کی اصل جبل الطارق ہے۔ اسی طرح فرانس کے مشہور ترین بندرگاہ مرسیلیا کی اصل "موسیٰ علیٰ" ہے۔ یہ نام ادریسی کے جغرافیہ میں ملتا ہے۔[۵]"

مصر کے مقام مقس پر معزلدین اللہ الفاطمی (ہجری ۳۶۵ھ) نے دارالصناعہ بنایا جس میں چھ سو جنگی جہاز تیار ہوئے۔ جو ہر حیثیت سے بے مثال تھے۔ فاطمیوں کے عہد میں قاہرہ، اور اسکندریہ میں دارالصناعہ قائم کیے گئے۔

مصادر و حواشی

۱۔ المقریزی: الخطط، ج ۳، ص ۳۱۷

۲۔ تاریخ مصر الحدیث، ص ۲۹۶

۳۔ تاریخ صقلیہ (دارالمصنفین)، ص ۱۰۴

۴۔ رحلۃ ابن جبیر، ص ۲۲۷

۵۔ نزہۃ المشتاق (ادریسی)، بحوالہ تاریخ صقلیہ، ص ۱۰۴

۶- تاریخ صقلیہ، ص ۱۰۵

۷- مقریزی، ص

۸- عربوں کی جہاز رانی (سید سلیمان ندوی) ص ۱۷۹ (طبع بمبئی)

۹- ایضاً ایضاً ص ۱۴۳ (طبع بمبئی)

ضمیمہ

بیان صفائی

تقدیم

فاطمیوں کے بارے میں، ان کے عقائد و افکار کے بارے میں، ان کی دعوت اور پیام کے بارے میں، ان کے حسب نسب کے بارے میں۔ ان کی قبولِ دعوت کے اسباب و محرکات کے بارے میں، مؤرخین نے بہت کچھ لکھا ہے۔ ان لکھنے والوں میں موافق بھی ہیں اور مخالف بھی۔ مخالفوں کے انداز تحریر میں عناد ہے۔ موافقوں کے اسلوب نگارش میں ہمدردی ہے لیکن اب تک اس سلسلے میں خود اسماعیلیوں کی طرف سے کوئی مستند بیانِ صفائی، منظرِ عام پر نہیں آیا تھا، جس سے یہ معلوم ہو سکتا کہ خود فاطمی اپنے بارے میں اور اپنے خلاف الزامات اور نکتہ چینیوں کے جواب میں کیا کہتے ہیں؟

ہندوستان میں سورت اسماعیلیوں کے ایک بڑے فرقے ——— بوہرہ ——— کا مرکز ہے۔ وہاں کی جامعہ سیفیہ کی طرف سے ایک کتاب "عہد فاطمی میں علم وادب" شائع ہوئی ہے جس سے ہم نے بھی اپنی کتاب میں استفادہ کیا ہے۔ یہ کتاب ہر اعتبار سے بوہرہ کے نقطۂ نظر کی صحیح ترجمانی کرتی ہے۔ لہذا، نامناسب نہ ہوگا، اگر اس کتاب کا وہ حصہ ہم پیش کر دیں جسے بجا طور پر بیانِ صفائی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس کی روشنی میں دوسرے اہل قلم مخالف یا موافق جو کچھ لکھیں گے اس کی نوعیت سنی سنائی باتوں پر نہ ہوگی۔

بلکہ ایک مستند ماخذ کو سامنے رکھ کر اظہار خیال کی ہوگی!

ایک مستند دستاویز

"عہد فاطمی میں علم و ادب" میں اسماعیلیوں کے بارے میں جو مواد ملتا ہے حسب ذیل ہے۔ اس مواد کی حیثیت تمام تر ایک مستند دستاویز کی ہے:

مؤرخوں نے نہ صرف فاطمیین کے نسب پر حملے کیے بلکہ انھوں نے فاطمی عقائد کو بھی غلط رنگ میں بیان کیا۔ متقدمین میں سے جنھوں نے فاطمیوں کے متعلق لکھا وہ یا تو ابن عذاری۔ نویری۔ عمری۔ قلقشندی۔ سیوطی وغیرہ تھے جو شیعوں سے عموماً اور فاطمیین سے خصوصاً تعصب رکھتے تھے۔ یا وہ مصنفین تھے، جو شیعوں، فاطمیوں، قرامطہ اور دروزیوں وغیرہ کو خلط ملط کر گئے اور ان کے عقائد میں امتیاز نہ کر سکے۔ متاخرین کے پیش نظر ان ہی کی تصنیفات تھیں جن کی وجہ سے وہ حقیقت بیان کرنے سے قاصر رہے۔

فاطمیوں نے اپنے اماموں کو بشر ہی جانا اور مانا ہے اور کبھی بھی ان کو الوہیت کے رنگ میں دیکھنے کا خیال تک نہیں کیا ہے۔ وہ اپنے اماموں کی حیات و وفات کے ایسے ہی قائل ہیں جیسے اپنی زندگی اور موت کے۔ ان کے عقیدہ کے مطابق امام حسینؑ کے بعد امامت والد سے فرزند کی طرف منتقل ہوتی رہی ہے

اور قیامت تک حضرت فاطمہؓ کی نسل میں امام حسینؑ کی اولاد میں جاری و ساری رہے گی۔ والد اپنے فرزند پر اپنی زندگی ہی میں نص کر دیتا ہے اور بغیر نص کیے کبھی امام کو وفات نہیں ہو سکتی۔ اس طرح سلسلۂ امامت میں کسی وقت فرق نہیں پڑ سکتا۔ زمین کبھی ظاہر امام یا امام مستور کی ہستی سے بے نیاز نہیں رہ سکتی ورنہ عالم کا ثبات نہ رہے اور وجودِ ہستی باطل ہو جائے۔

ائمہ علوم الٰہی کے خازن اور علم تاویل کے وارث ہوتے ہیں۔ تمام علوم شریعت پر حاوی ہونے کے علاوہ کلام مجید کے حروف مقطعات کے اسرار رموز اور معانی سے واقف ہوتے ہیں۔

ہر مومن پر امام کی معرفت لازمی ہے۔ اگر وہ دنیا سے بغیر معرفت امام کے چل بسا تو گویا وہ جاہلیت کی موت مرا۔ امام کی معرفت کے بغیر مومن کی نجات ناممکن ہے۔

معرفت امام کی طرح اس کی ولایت بھی فرض ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسماعیلی اسلام کے سات دعائم شمار کرتے ہیں۔ ولایت۔ طہارت۔ صلوٰۃ۔ زکوٰۃ۔ صوم حج اور جہاد۔ ان دعائم میں ولایت افضل ترین ہے اور اسے اولیت حاصل ہے۔ اس کے بغیر کوئی عمل بارگاہِ خداوندی میں مقبول نہیں ہو سکتا۔

اسماعیلی شیعہ نبی مرسل کو "ناطق" اس لیے کہتے ہیں کہ وہ خدا کی طرف سے کتاب و شریعت لاتے ہیں اور ظاہر بیان کرتے ہیں۔ نبی کے قائم مقام کو جسے "اساس" اور "وصی" کہا جاتا ہے "صامت" اس لیے کہتے ہیں کہ وہ ظاہر کے بارے میں خاموشی اختیار کرتے ہیں۔ نبی صاحب تنزیل ہوتے ہیں۔ اور وصی صاحب تاویل۔

شیعہ کے تمام فرقے تاویل کے قائل ہیں اور وجوب تاویل کے ثبوت میں قرآن کریم کی بعض آیات بھی بہ طور دلیل پیش کرتے ہیں۔ مثلاً " ولنعلمہ من تاویل الاحادیث "

ہر علم کے دو پہلو ہوتے ہیں جلی اور خفی۔ ظاہر اور باطن۔ عام اصول یہ ہے کہ مبتدی پہلے ظاہر کو سمجھتا ہے اور پھر ذوقِ تحقیق سے حقیقت اور باطن تک پہنچتا ہے۔ لہٰذا اگر قرآنی تعلیم میں باطن اور خفی پہلو ہے تو اس میں حیرت و استعجاب اور انکار و اعتراض کی کون سی بات ہے۔ احادیث اور اقوالِ صحابہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآنی تعلیم میں ایک راز کا پہلو بھی ہے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ جو کچھ میں جانتا ہوں اگر تم بھی جانتے تو ہنستے کم اور روتے زیادہ۔

توحید کے مسئلہ میں اسماعیلی خدا کی ذات پر لفظِ واحد کا اطلاق بھی خدا کی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔ کیونکہ وہ تو عاد (شمار کرنے والا) ہے اور واحد معدودات میں شامل ہے جو اس کی مخلوقات ہیں۔ خدا کسی صفت سے موصوف نہیں کیا جاتا ہے۔ اسے کسی صفت سے موصوف کرنا اس کی ذات میں کثرت ثابت کرنا ہے جو شرک کا مترادف ہے۔ اگر ہم اس کو صانع کہیں تو یہ اس بات کا مقتضی ہے کہ اس کے ساتھ صنعت اور مصنوع دونوں ہوں (ص ۲۰)۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسماعیلیوں نے باطن پر بہت زور دیا ہے اور اہلِ سنت کو اہلِ ظاہر کہا ہے۔ مگر انھوں نے ظاہر سے کبھی تغافل نہیں برتا جس طرح ان کا یہ اعتقاد ہے کہ ہر ظاہر کا باطن ہے۔ اسی طرح ان کا یہ بھی ایمان ہے کہ ہر باطن کا ظاہر ہونا ضروری ہے۔ ظاہر و باطن دونوں میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے کبھی جدا نہیں ہو سکتے۔ آپس میں ان دونوں کا ربط جسم و روح کے تعلق کے مانند ہے۔ ان دونوں کے آپس میں لازم و ملزوم رہنے ہی سے فائدے حاصل ہو سکتے ہیں۔ صلوٰۃ، زکوٰۃ، صوم، حج، جہاد، کی پابندی ہر مومن کے لیے واجب اور فرض ہے۔ ظاہر کی پابندی کے بعد باطن یعنی عباداتِ عملیہ لازم قرار دی گئی۔ فاطمیوں نے کبھی بھی ابطالِ عبادت کا ارتکاب نہیں کیا جیسا کہ عام طور سے مؤرخین نے ان پر الزام لگایا ہے۔ سیدنا القاضی النعمان کی مستند تصنیف "دعائم الاسلام" فقہ کی کتاب ہے جس میں

عبادات کا بیان ہے۔ اگر فاطمی ائمہ ابطال عبادت کے مرتکب ہوتے تو امام معز سیدنا القاضی النعمان کو مذکورہ کتاب کی تالیف کا حکم کبھی نہ فرماتے۔ امام مستنصر کے عہد کی تصنیف "المجالس المستنصریہ" میں پہلے عبادات کے ظواہر کا ذکر ہے۔ اور پھر ان کی تاویل بیان کی گئی ہے۔ اگر فاطمیین ابطال عبادت ظاہرہ کے قائل ہوتے تو ان کے کسی داعی کی تصنیف میں نہ ظواہر کی پابندی کی تاکید ہوتی اور نہ ان کو بیان کیا جاتا۔ سیدنا احمد حمید الدین کرمانی نے اپنی فلسفیانہ کتاب "راحۃ العقل" کے مطالعہ سے قبل لوگوں کو "دعائم الاسلام" پڑھنے کی تاکید فرمائی تاکہ فلسفہ کے انہماک میں بھی عبادت کا خیال رہے (ص ۲۲)

فاطمی ائمہ کی طرف سے تاویل کرنے والوں کو دیگر ہدایتوں کے علاوہ یہ بھی ہدایت تھی کہ وہ اس بات کی احتیاط کریں کہ تاویل سننے والا کہیں معرفت باطن کو کافی سمجھ کر ظاہری شریعت کے احکام کو معطل نہ کر دے۔ سیدنا القاضی النعمان نے ہر مجلس کے آخر میں اماموں کی اس ہدایت کا بار بار اعادہ کیا ہے کہ باطن کی معرفت کے ساتھ ظاہری اعمال بھی لازمی ہیں۔

اگر فاطمی ائمہ تعطیل کے قائل ہوتے تو وہ اپنے داعیوں کا پردۂ عصیاں کیوں چاک کرتے جنھوں نے شرعی احکام کو معطل کیا۔ داعی علی بن فضل دور ستر کے اواخر میں یمن میں تبلیغ دعوت کا کام انجام دے رہے تھے، لیکن جب وہ بہک گئے تو امام نے ان سے بیزاری ظاہر کی اور حسین بن فرح بن حوشب کو ان سے جنگ کرنے اور فتنہ و فساد فرو کرنے کا حکم دیا۔" قرامطہ نے جب محرمات کو مباح کر لیا تو امام مہدی نے انھیں دعوت سے خارج کر دیا۔ اور ان سے جنگ کی۔ قیامِ سلطنت کے بعد بھی ہمیشہ فاطمیوں اور قرامطہ میں چپقلش رہی ہے۔ اسی طرح فاطمیوں نے فرقہ دروزیہ کی بھی شدید مخالفت کی۔ اور امام حاکم کے حکم سے سیدنا احمد حمید الدین کرمانی نے دروزیوں کی تردید میں رسالہ لکھا۔

فاطمیوں کی تاریخ اوران کے اعمال سے بھی تعطیل شریعت کے اتہام کی واضح نزدید ہوتی ہے۔ مثلاً مساجد کی تعمیر جنھیں وہ عبادت گاہیں تصور کرتے ہیں۔ سیدنا موید شیرازی اپنی ایک مجلس میں فرماتے ہیں۔ "خدا کی پناہ مانگو اس قوم سے جو اپنے آپ کو شیعہ کہتی ہے مگر کفر و الحاد کی بدترین پیش رو ہے۔ مرکب اباحت کی سوار ہے اور راحت کی خواہش مند۔۔۔۔۔ احکام شریعت کی بڑی بے پروائی سے خلاف ورزی کرتی ہے اور حرام کو حلال قرار دے کر وادی ہلاکت میں اترتی ہے۔ (ص ۲۶)

اسماعیلی داعی منتجب سے بعض باتوں کا عہد لیتے ہیں جسے اسماعیلی "عہد الاولیاء" کہتے ہیں۔ مقریزی اور بغدادی دونوں مؤرخوں نے اپنی اپنی تاریخوں میں اسے نقل کیا ہے۔ اس عہد میں یہ بھی درج ہے کہ "تم اس بات کی شہادت دو کہ سوا خدا کے اور کوئی معبود نہیں ہے۔ اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے بندہ اور رسول ہیں۔ اور اس بات کی شہادت دو کہ جنت حق ہے جہنم حق ہے۔ موت حق ہے۔ بعث حق ہے۔ اور اس بات کا اقرار کرو کہ تم اوقات مقررہ پر نماز پڑھو گے۔ برابر زکوٰۃ ادا کرو گے۔ حج کرو گے۔ نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی قبر کی زیارت سے مشرف ہو گے۔ اور راہِ خدا میں جس طرح جہاد کرنا چاہیے اسی طرح جہاد کرو گے۔ خدا کے فرائض اور رسول کی سنتوں کی ظاہری و باطنی دونوں صورتوں میں پابندی کرو گے۔" (ص ۲۷)

امام معز فرماتے ہیں "بعض ان لوگوں کے متعلق ہمیں خبر ملی ہے جو ہمارے بارہ میں غلو و اغراق سے کام لیتے ہیں اور یہ دعوے کرتے ہیں کہ وہ ہماری محبت رکھتے ہیں اور ہماری طرف لوگوں کو دعوت دیتے ہیں۔ یہ لوگ ایسی غلو آمیز باتیں کہتے ہیں جو نہ کبھی ہم نے کہی ہیں، اور نہ کسی نے سنی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمارے متعلق ہم سے زیادہ جانتے ہیں۔ ہم ان کے کذب و افترا سے خدا کی پناہ طلب کرتے ہیں۔ ہم خدا کے بندوں میں سے ہیں۔ ہم

اس کی مخلوق ہیں۔ ہمیں خدا کے سکھائے ہوئے علم کے علاوہ اور کوئی علم نہیں۔ خدا نے جو علم ہمارے نانا نبیؐ کو عطا کیا ہے ہم اس کے وارث ہوئے ہیں اور اسی کو وراثت میں چھوڑ جائیں گے۔ ہم اس کے علم میں سے اتنا ہی جانتے ہیں جتنا کہ وہ چاہتا ہے۔ ہمیں اس کے علم میں سے اتنی ہی آگاہی ہے جتنی کہ اس نے عطا کی۔ ہم نبوت اور رسالت کا دعویٰ نہیں کرتے بلکہ ہم تو صرف امامت کے محافظ ہیں۔ ہمارا حلال و حرام کتاب اللہ ہی کے حکم سے ہے۔ (ص ۲۹)۔

(۱) کاغذی نقوش و تصاویر

(اللوحة رقم ٥٨)

عقاب من البرونز بالكامبو سانتو بپيزا - القرن الحادي عشر الميلادي

(۲) دھات کا بنا ہوا عقاب

(۳) خط کوفی میں لکھے ہوئے قرآن کا ایک صفحہ

(۴) دھات کا بارہ سنگھا

دھات کا طوطا

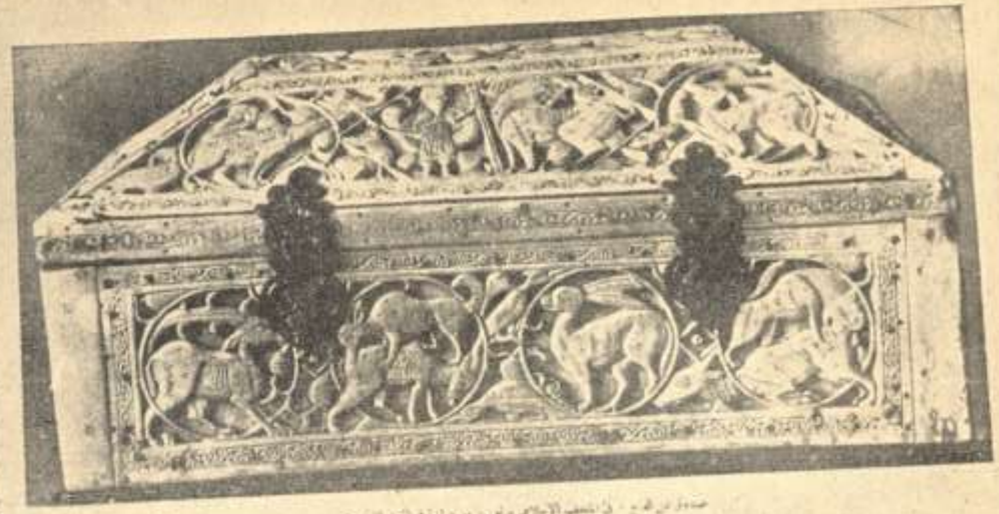

(٥) ایک چوبی صندوق جس پر ہاتھی دانت کا کام ہے

(اللوحة رقم ٤٥)

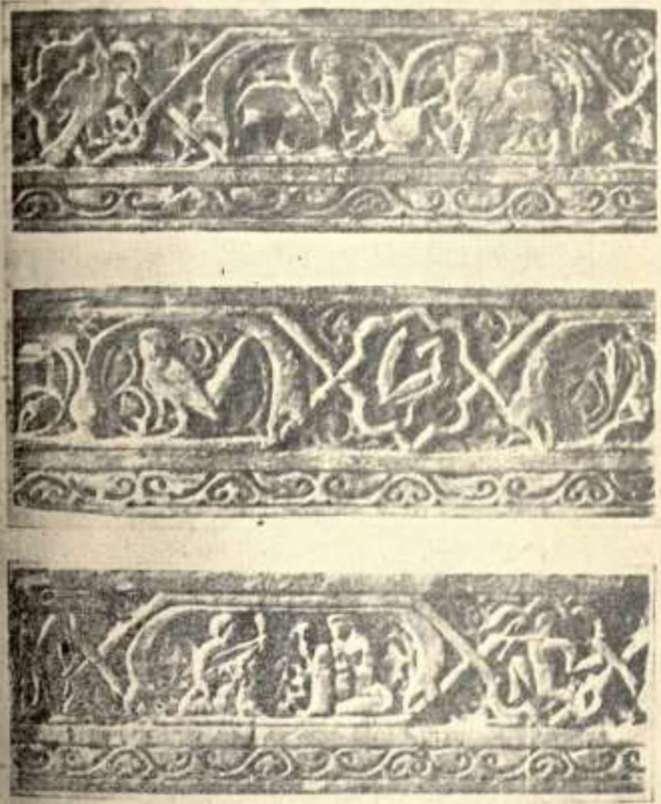

[illegible]

(٦) خلفاء فاطمین کی چوبی لوحیں

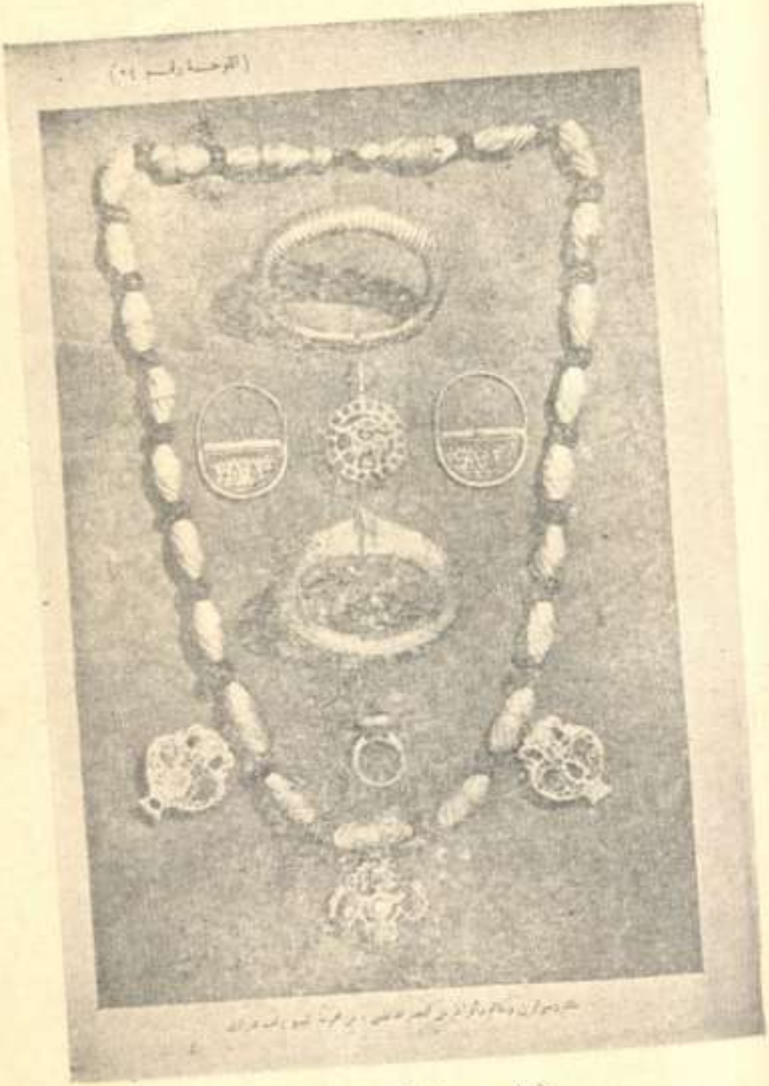

(۷) عہد فاطمی کے زیور
ہار ، کنگن ، بندے

(۸) ہاتھی دانت کی صنعت

ہاتھی دانت کا بگل

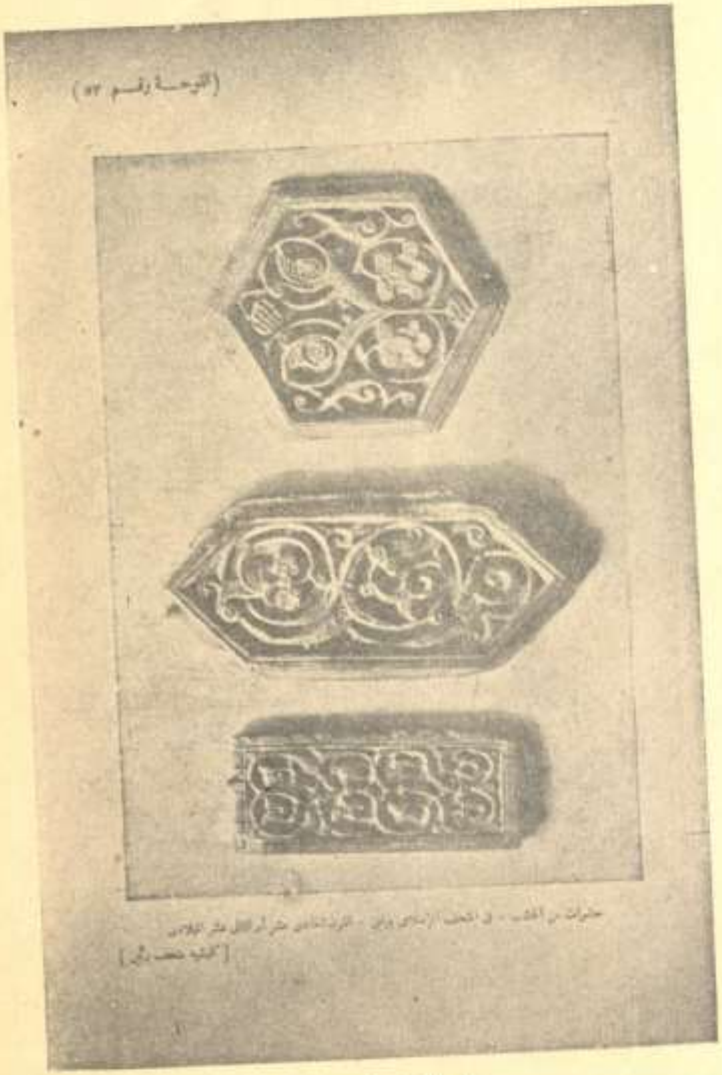

(۹) لکڑی کی جالیاں

(اللوحة رقم ٥٥)

(۱۰) ایک چوبی صندوق جس پر هاتهی دانت کا کام ہے

(۱۱) دریچوں اور دروازوں کی چوبی جالیاں

(اللوحة رقم ٩)

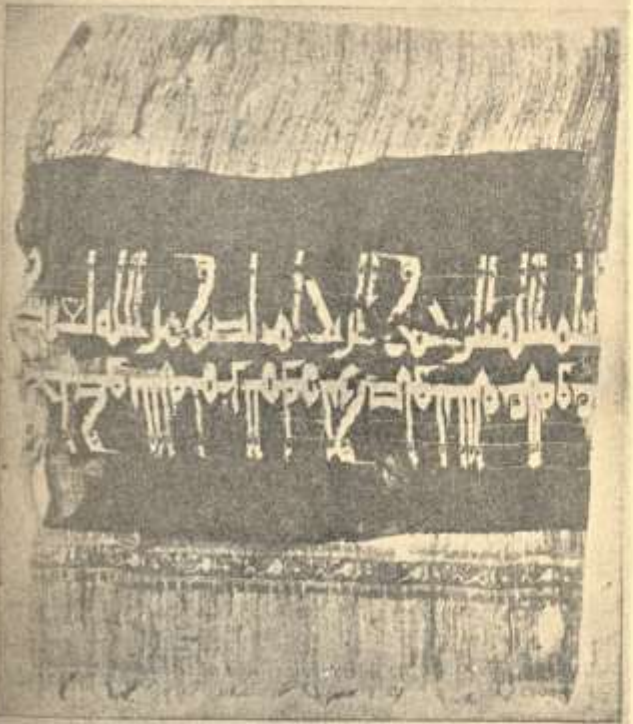

قطعة من كتان وحرير باسم الخليفة الحاكم بأمر الله - في دار الآثار العربية (رقم ١٦ م) -
بداية القرن الحادي عشر الميلادي

[من ڤييت]

(۱۲) کتاں اور حریر کا ایک پارچہ جس پر خلیفہ حاکم
بامر اللہ فاطمی کا نام کڑھا ھوا ھے

(۱۳) ریشم کی چادر
عہد فاطمی میں صقلیہ (سسلی) کی صنعت ریشم سازی

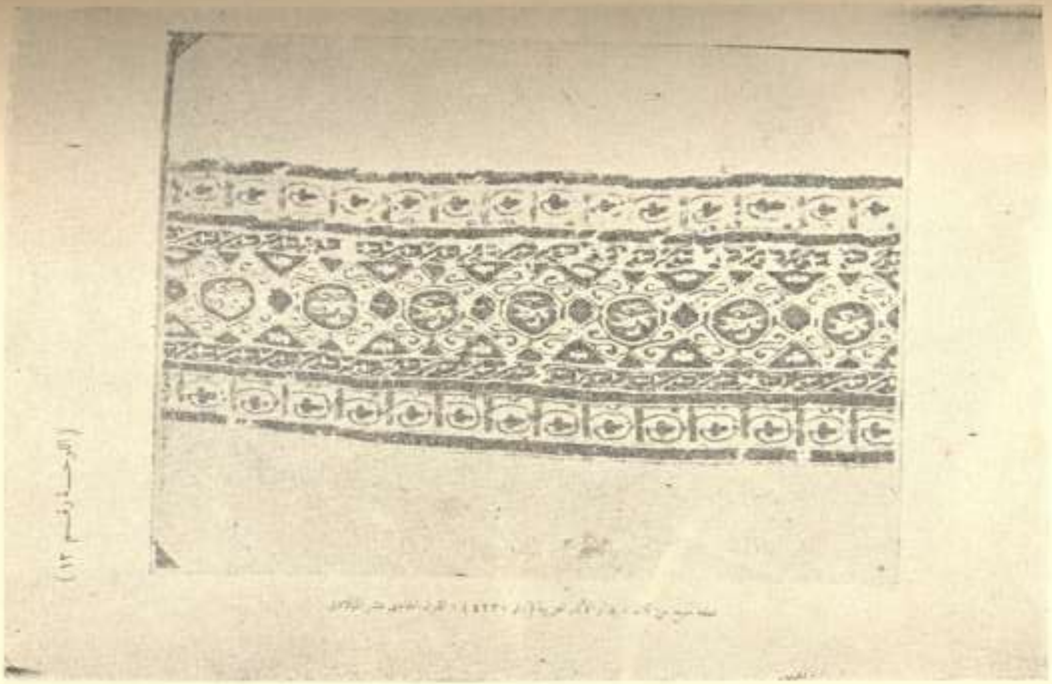

(۱۳) کتان کا ایک ٹکڑا

(اللوحة رقم ٢٠)

(١٥) رسم تاج پوشی کے وقت پہنے جانی والی عبا کا ایک حصہ

(١٦) مٹی کی پلیٹ تصویروں کے ساتھ پالش والی

(اللوحة رقم ٣٨)

(١٧) شیشۂ سنگ کی صراحی